یادگارِ عبدالحق
ڈاکٹر سید معین الرحمن

یادگارِ عبدالحق

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

(وفات ۱۵۔ اگست ۲۰۰۵ء)

alwaqarpublications@hotmail.com

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۱۰۲ لاہور۔ پاکستان

مندرجات:

صفحہ:

o حرفے چند: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

اعترافِ حق:

۱۔ بابائے اُردو کی خدماتِ جلیلہ ۱۵

۲۔ "چند ہم عصر" کا تجزیاتی مُطالعہ ۳۳

۳۔ بابائے اُردو: ایک کرشمہ ساز شخصیت ۶۱

۴۔ بابائے اُردو بحیثیت شاعر ۷۵

۵۔ کچھ بابائے اُردو کی شادی کے بارے میں ۱۰۳

۶۔ بابائے اُردو کا مقصدِ حیات ۱۱۷

بزمِ حق:

۷۔ بابائے اُردو اور نواب معشوق یار جنگ ۱۲۵

۸۔ بابائے اُردو اور پروفیسر محمود احمد خاں ۱۴۱

۹۔ بابائے اُردو اور پروفیسر حمید احمد خاں ۱۵۱

۱۰۔ بابائے اُردو اور جسٹس ایس۔ اے رحمٰن ۱۶۷

۱۱۔ بابائے اُردو اور حکیم اسرار احمد کریوی ۱۷۹

تبرکاتِ حق (بابائے اُردو کی نادر تحریریں):

۱۲۔ قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین، ۱۸۹۶ء	۲۳۵
۱۳۔ غلامی، ۱۸۹۶ء	۲۳۹
۱۴۔ سر سیّد احمد خاں کی والدہ ، ۱۹۱۲ء	۲۴۷
۱۵۔ گشتی کتب خانہ، مارچ ۱۹۴۵ء	۲۶۳
۱۶۔ میرا کتب خانہ، جون ۱۹۴۶ء	۲۷۳
۱۷۔ "موازنۂ انیس و دبیر" — بابائے اُردو کی قلمی تحریر	۲۸۳
۱۸۔ اُردو زبان و ادب کے سات سو سال	۳۰۱۔۳۵۶

O

باتیں کم ، کام زیادہ
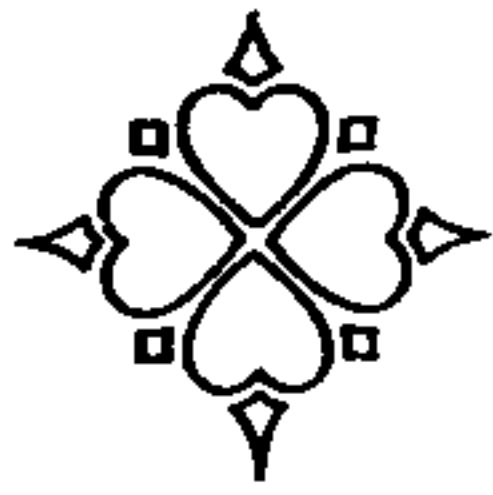
ادب و احترام کے ساتھ

اپنی ایک محسن و مہربان اور فیض رساں ہستی

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

کی نذر
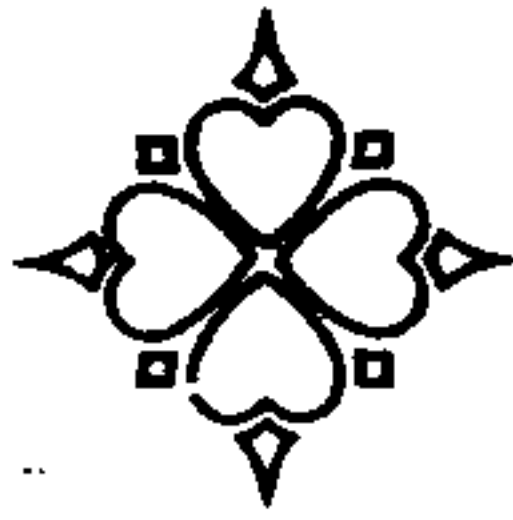
انجمن ترقیٔ اُردو (پاکستان) سے قدیم ترین منصبی وابستگی
کا اعزاز اور امتیاز رکھنے والے
جمیل الدین عالی
کے نام!

Professor: Sufi Tabassum Chair.
Dean, Faculty of Arts,
Chairman, Department of Urdu,
GOVERNMENT COLLEGE, LAHORE

Dr. Syed Moeen-ur-Rehman
Izaz-i-Fazeelat

حرفے چند:

زیرِ نظر کتاب ''یادگارِ عبدالحق'' کا بیشتر حصّہ برسوں سے کتابت شدہ پڑا تھا، لیکن اس کی اشاعت کسی نہ کسی وجہ سے ٹلتی چلی آ رہی تھی۔ کمپیوٹر کمپوزنگ میں بعض مضامین کے اضافے کے ساتھ، اب اس کتاب کو بالآخر بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی چالیسویں برسی کی مناسبت سے شائع کرنے کی نوبت آ رہی ہے۔

کتاب میں شامل، بابائے اُردو کے رفیقِ دیرینہ اور اپنے کرم فرما حکیم اسرار احمد کریوی سے لیے گئے تحریری مکالے کو صاف اور مرتب کرنے میں بڑا وقت لگا۔ یہ ایک جامع مطالعہ ہے اور مولوی عبدالحق کے مزاجی اوصاف کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی شادی کے موضوع پر نئے مآخذ و مصادر کی بنیاد پر فراہم کیے گئے لوازمے کو بھی میں اپنی اِس کتاب کا ایک قابلِ لحاظ حصہ خیال کرتا ہوں۔ اس ضمن میں محض تائیدِ ایزدی اور حُسنِ اتفاق سے قیمتی اطلاعات ہاتھ لگا اور ناگہاں سوئے اتفاق کہ یہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ پھر برسوں بعد یہ گم گشتہ نادر ماخذ، جس کی طرف سے میں ایک طرح سے نا اُمید ہو چکا تھا، ازسرِ نو اچانک ہاتھ آ گیا (اس مدّ و جزر کی تفصیل متعلقہ مضمون میں آ گئی ہے)۔ کتاب میں تاخیر و تعویق، کا ایک سبب یہ بھی رہا!

کتاب میں شامل بابائے اُردو کی بعض غیر مرتب نگارشات کی بازیافت، میرے لیے سرمایۂ فخر ہے۔ کتاب میں بھی ''بزمِ حق'' کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہے اس بزم کے پانچوں سوار، افسوس کہ اب ہم میں نہیں، لیکن بابائے اُردو کے بارے میں اُن کے بیانات، تخمینے اور تجزیے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے مزاج اور اُن کی اُفتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے بالذات دائمی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس سے قطع نظر بابائے اُردو کے ان ہم جلیسوں کی سحر آگیں باتوں میں اپنائیت اور محبت کی جو خوشبو اور مہک رچی بسی ہے، وہ بجائے خود بھی ایک کشش اور حُسن رکھتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے احوال و آثار کے ذکرِ خیر پر مبنی یہ کتاب، اُن کی ذات و صفات، اُن کے مقصدِ حیات اور اُن کے کام اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے حوالۂ ناگزیر کا کام دے گی، یہی اِس کتاب کا جواز ہے۔

یہ کتاب میری توجہ اور فرصت کی منتظر شائد اب بھی ناتمام پڑی رہتی، اگر ہم کار رفیقِ عزیز محمد سعید کا اضرار حد سے نہ بڑھ جاتا۔ اُن کے تقاضوں اور تعاون کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ خدا اُنھیں زندگی میں کامرانیوں اور آسانیوں سے ہمکنار رکھے۔ کتاب کے سرورق اور خطاطی کے لیے میں ایم۔ فل (اُردو) کی بڑی بااعتماد اور اپنی ذی استعداد شاگرد عزیزہ ثمینہ ندیم اور اُن کے شوہر ندیم حسن صاحب کا ممنون ہوں۔

انجمن ترقی اُردو کا سال تاسیس ۱۹۰۳ء ہے، سال ۲۰۰۳ء میں ''انجمن'' کے قیام کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر، میں اپنے وسائل سے ایک ضخیم کتاب (جو پندرہ سو صفحات سے بھی متجاوز ہوگئی ہے)، ''مجموعۂ مطالعات عبدالحق'' کے نام سے پیش کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ خدا مجھے اس منصوبے کی تکمیل کی مقدرت اور مہلت عطا کرے۔

۱۶۔ اگست ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

گھر:
''الوقار'' ۵۰۔ لوئر مال، لاہور

تصویر بابائے اردو اور سید معین الرحمن، مئی ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بابائے اُردو کے مزار پر۔۔ مارچ ۲۰۰۲ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق

اعتراف حق:

۱۔ بابائے اُردو کی خدماتِ جلیلہ	۱۵
۲۔ "چند ہم عصر" کا تجزیاتی مُطالعہ	۳۴
۳۔ بابائے اُردو: ایک کرشمہ ساز شخصیت	۶۱
۴۔ بابائے اُردو بحیثیت شاعر	۷۵
۵۔ کچھ بابائے اُردو کی شادی کے بارے میں	۱۰۳
۶۔ بابائے اُردو کا مقصدِ حیات	۱۱۷
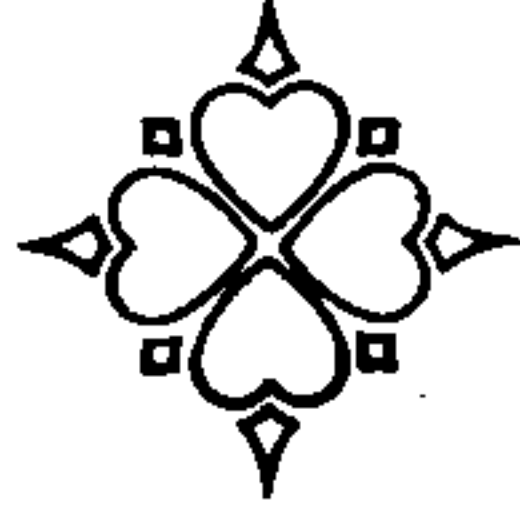
تحقیقی نقطۂ نظر سے مولوی عبدالحق کی شادی کے موضوع پر نئے
مآخذ و مصادر کی بنیاد پر فراہم کیے گئے لوازمے کو میں اس حصۂ کتاب کا
ایک قابلِ لحاظ جزو خیال کرتا ہوں۔ اِس حصّے کی دوسری نگارشات
بھی بابائے اُردو کی ذات و صفات، اُن کے مقصدِ حیات اور اُن
کے علمی کاموں اور اَدبی کارناموں کو سمجھنے میں شائد کُچھ مدد دیں۔

ــــــ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

بابائے اُردو کی خدماتِ جلیلہ

[تحریر: ۱۹۶۲ء نظر ثانی: ۱۹۶۶ء]

مولوی عبدالحق نے شعور کی آنکھ کھولی تو سرسید، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، حالی اور شبلی کا شہرہ تھا۔ اُدھر اُردو ایک پُر آشوب دور میں داخل ہو رہی تھی کیونکہ اس کے مقابل ہندی زبان اور دیوناگری خط کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ اِس تحریک نے جس کا آغاز ۱۸۶۷ء کے قریب ہوا، سرسید کے آخری دنوں میں باقاعدہ ایک ہل چل کی صورت اختیار کر لی۔ یہ مولوی عبدالحق کی طالب علمی کا دور تھا۔ ایک حسّاس اور باشعور نوجوان کی حیثیت سے اُنہوں نے اِس فضا کا مطالعہ کیا اور اِس سے ایک خاص اثر قبول کیا۔ اُنہوں نے ابھی انٹرنس کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا کہ سرسید کے "تہذیب الاخلاق" میں اُردو زبان کے مستقبل کے موضوع پر اُن ایک مضمون شائع ہوا جس پر نوعمر اہلِ قلم کو ہر طرف سے داد ملی۔

مولوی عبدالحق کی تعلیم و تربیت سب کی سب کم و بیش علی گڑھ میں ہوئی اور یہاں بھی خصوصیت سے اُنہیں سرسید کی "چشمِ نگراں" میسّر آئی۔ رشید احمد صدیقی نے ٹھیک کہا ہے[1] کہ عنفوانِ شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب یقیناً خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسید کا سایہ اور سہارا اور اُن کے نادرۂ روزگار رُفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ سرسید اور حالی جیسے مشاہیر کی شفقت اور صحبت نے مولوی عبدالحق کے ذہن کو صیقل کر دیا۔ اُن کا مذاقِ ادب نکھرتا اور سنورتا گیا۔ مزاج میں ضبط و تحمل، متانت و اعتدال اور تحریر میں صفائی، سادگی، قوت و استدلال کے جوہر چمک اُٹھے۔ وہ سرسید کی تحریک اور حالی کی تحریر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور بالآخر اسی کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اور اندازِ نگارش کا معیار و محور ٹھہرایا۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ، ص ۱۸۰

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی عبدالحق دو تین برس مدرسۂ آصفیہ حیدر آباد کے صدر مدرس رہے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں وُہ رسالہ "افسر" سے بھی بحیثیت مدیر وابستہ ہو گئے۔ مگ بھگ اسی زمانے میں وُہ اُمورِ عامہ (ہوم سیکریٹری) میں مترجم بنائے گئے جہاں بارہ تیرہ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں وُہ ناظم (ڈائریکٹر) تعلیم کے مددگار اور چند ماہ بعد اوائل ۱۹۱۲ء میں صوبۂ اورنگ آباد کے سررشتہ تعلیم کے صدر مہتمم (انسپکٹر آف سکولز) مقرر ہوئے اور اس طرح اُن کا تعلیمی اور علمی تجربہ ترقی کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو وہ "شعبہ ترقی اُردو کے سیکریٹری منتخب کئے گئے اور اس کے بعد اُردو اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام میں مولوی عبدالحق کی تحریک اور مساعی کو بڑا دخل ہے۔ صدر مہتممی تعلیمات سے مولوی عبدالحق کو جامعہ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کی نظامت پر ترقی دی گئی۔ چند سال بعد اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج قائم ہوا تو انہیں اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ کم و بیش ۳۱ برس تک سرکاری خدمات انجام دے کر مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی، لیکن فوراً بعد انہیں بہ اصرار جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو کا صدر بنا دیا گیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے ایما پر انہوں نے اس منصب کو قبول کیا لیکن چند ہی سال بعد زبان کی حفاظت و مدافعت کے پیشِ نظر وُہ اِس اعزاز اور خدمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اُردو سے وابستہ ہوتے ہی مولوی عبدالحق نے زبان کو علمی مضامین کے اظہار کے قابل بنانے کے لیے علمی موضوعات پر تصانیف و تراجم کے سلسلے کو تیز تر کر دیا۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی دقت اُن کی مخصوص اصطلاحات تھیں جن کے مترادفات مشرقی زبانوں میں نہیں ملتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایسی مسلسل سعی و محنت سے جو اُن کا طرۂ امتیاز رہی ہے، مختلف علوم کی اصطلاحات کو مرتب کر کے چھپوایا اور برابر اس میں مناسب ترمیم و تصحیح اور اضافے کرتے رہے۔

اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت سے قطع نظر ۱۹۲۷ء میں مولوی عبدالحق نے انگریزی اُردو

لغت کے ترجمے کا عہد آفریں کام مکمل کیا۔ بڑی تقطیع کے دو کالمی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل انگریزی سے اُردو کی یہ لُغت کبیر انجمن کی طرف سے شائع کی گئی۔ یہ لُغت جس میں تقریباً دو لاکھ انگریزی لُغات کے ہم معنی اُردو الفاظ دیئے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی رہبری و نگرانی میں متعدد اہلِ علم کی دس گیارہ برس کی محنت سے تیار ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں حکومتِ حیدرآباد نے اُردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تسوید و تالیف کی خدمت مولوی عبدالحق کے سپرد کی۔ مولوی عبدالحق ہی کے لفظوں میں ایک کامل و جدید مستند لغت میں:

"ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وُہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اُردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اُس وقت سے تاحال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اُس کے کون کون سے معنی متروک ہوگئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل تحقیق کرنی ہوگی یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وُہ کیا تھا۔"

ظاہر ہے اِن خطوط پر ایک جامع لُغت کی ترتیب کس قدر دُشوار، کٹھن اور محنت و وقت طلب امر تھا مگر مولوی عبدالحق نے بڑی حوصلہ مندی سے کام میں ہاتھ ڈالا اور بڑی مستعدی اور تیزی سے لُغت کی تالیف کا کام شروع ہوگیا۔ الفاظ کی اصل اور سرگزشت کا پتہ چلانے کے لیے ان کی نگرانی میں سنسکرت اور ہندی کے بعض ماہرین کا تقرر عمل میں آیا۔ نظم و نثر کی مستند کتابوں سے الفاظ و اسناد ڈھونڈنے میں کئی کئی اصحاب مصروف رہے۔ خود مولوی عبدالحق جزوی تلاش و تحقیق تک میں شریک رہتے یہاں تک کہ دس پندرہ برس میں اس سلسلے کا بہت کچھ مواد جمع ہوگیا۔ مسودے کا بڑا حصہ مطبع میں پہنچ گیا تھا، اس کے کچھ اجزا حیدرآباد دکن کے سرکاری مطبع میں چھپ بھی لیے تھے کہ یہ سارا سرمایہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہوگیا۔

پاکستان آنے کے بعد مولوی عبدالحق نے لغت سازی کے کام کی طرف نئے سرے سے

توجہ کی جمیل الدّین عالی کے بقول :

"اسناد کی فراہمی اور تشریح نگاری کے کام ساتھ ساتھ شروع کئے گئے، دس بارہ برس کی مدّت میں صرف الف ممدودہ، الف مقصورہ، ب اور بھ کے الفاظ تک کا مسودہ مکمل ہو سکا۔ بابائے اُردو کی وفات سے یہ کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ (بہر نوع) اُردو زبان میں کوئی لغت ایسی مَوجود نہیں ہے، جس میں مذکورہ حرُوف کی حد تک اِتنے زیادہ الفاظ ہوں اور پھر تشریح نگاری میں جس تفصیل سے کام لیا گیا ہے، وُہ بھی اپنی مثال آپ ہے"

(اداریہ سہ ماہی "اُردو" اپریل ۱۹۶۶ء ص ۴)

مَولوی عبدالحق اُردو کے بلند پایہ لغوی، جیّد عالم اور ماہرِ لسانیات تھے۔ "قواعدِ اُردو" کے نام سے اُردو کے اجزائے صرفی و نحوی اصول پر اُن کی مجتہدانہ تالیف بڑی گراں قدر، مبسوط، اور مستند ہے۔ اس میں الفاظ کی ساخت، اِرتقائی تغیرات، مرکبات و محاورات، عبارت کی نحوی ترکیب اور عروض کے ضروری اصول و قواعد پر ایسی مرتب اور مشرح تفاصیل بہم پہنچائی ہیں کہ زبان کے نکات و قواعد کی تمام و کمال معرفت نصیب ہو جاتی ہے۔ قواعد کے علاوہ ۱۹۳۴ء میں مَولوی عبدالحق نے ثانوی دَرجوں کے طلبا کی ضروریات کے پیشِ نظر "اُردو صرف و نحو" پر ایک کتاب تالیف کی، یہ کتاب بقول کسے[لے] تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی مستند کتاب ہے جو سائنٹفک بُنیادوں پر لکھی گئی، مَولوی عبدُالحق سے پہلے اِس مُوضوع پر جن مصنفین نے قلم اُٹھایا انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کی قواعد کو مشعلِ راہ بنایا اور اُردو زبان کے مخصوص مزاج و منہاج کو نظر انداز کر دیا۔ مَولوی عبدُالحق نے عربی اور فارسی کی قواعد کو صرف اُسی حد تک پیشِ نظر رکھا ہے جہاں تک اُس کی ضرورت تھی، انہوں نے اُردو زبان کی خصوصیات کو پوری طرح سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی اور پہلی بار اس اہمیت کا احساس دلایا کہ اُردو کی قواعد عربی و فارسی کا چربہ نہیں بلکہ بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تحقیق و تدقیق سے مَولوی عبدُالحق کو گہرا شغف تھا۔ اُن کا شمار اُردو ادبیات کے قدر

لے گرد پوشں، اُردو صرف و نحو، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۱ء

اوّل کے محققوں میں ہوتا ہے۔ انہیں ادب کی تاریخ سے عموماً اور زبان کی تاریخ سے خصوصاً بڑی دل چسپی رہی ہے۔ اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ تاریخی ژرف نگاہی کے ثبوت ملتے ہیں۔ اُردو کی ابتدا اور اس کے تاریخی ارتقا پر اُن کی بہت اچھی نظر تھی اور یہ ایسا شعبہ ہے جس میں کوئی اُن کا حریف نظر نہیں آتا۔

مولوی عبدالحق کا بڑا کارنامہ اُردو ادب کے اُن شاعروں اور مصنفوں کو زندگی عطا کرنا ہے، جو معنوی طور پر مرچکے تھے۔ اُنہوں نے متعدد قدیم و نایاب تذکروں کا کھوج لگا۔ بڑی جاں فشانی سے انہیں ترتیب دیا، اور اس طرح گویا تاریخ ادب کی گم شدہ لڑیوں کو ہم رشتہ کیا۔ آل احمد سرور نے ٹھیک کہا ہے کہ :

"عبدالحق نے ہمارے کلاسیکی ادب کو جسے ہم مُردہ سمجھ بیٹھے تھے ہمارے لیے زندہ کیا۔"[۱]

اُن کی تلاش و تحقیق نتائج کے اعتبار سے زبان کی تاریخ پر ایسا گراں قدر احسان ہے جسے اُردو زبان کے نام لیوا کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

تذکروں کے علاوہ انہوں نے بیسیوں دکنی مخطوطات کو گم نامی کے عمیق غاروں سے باہر نکالا۔ اس طرح قدیم اُردو کے بہت سے گراں مایہ جواہر ریزوں نے، جو صدیوں سے دور دست مقامات خصوصاً غیر معروف خانقاہوں میں مدفون پڑے تھے، مولوی عبدالحق کی تلاش صادق کی بدولت زندگی کی روشنی دیکھی۔ ان پارینہ سال کرم خوردہ کتابوں کی فراہمی سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ان کا پڑھنا اور انہیں پڑھ کر ان کے مطالب کی وضاحت کرنا تھا۔ اکثر مخطوطے خطِ نسخ میں تھے مگر ہندی اصوات، حروف و اعراب میں فرق تھا۔ کتنے ہی لفظ متروک ہو چکے تھے، انہیں پڑھنا اور سمجھنا بڑا کٹھن اور دشوار تھا۔ مولوی عبدالحق نے یہ سب کھکھیڑیں اُٹھائیں اور بڑی کاوش اور جاں کاہی سے متنوں کو مرتب کیا اور قدیم دکن کی نظم اور نثر کی بہت سی کتابیں تصحیح، ذیلی حاشیے اور فرہنگِ الفاظ کے ساتھ اہل اُردو کے سامنے پیش کیں۔

قدیم اُردو کے موضوع پر وہ برابر اپنی تحقیق کے نتائج مقالات و مضامین کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ اُن کے تحقیقی مقالات اور قدیم نظم و نثر کی اشاعت نے اس عام نظریے کو

---

[۱] تنقیدی اشارے (پہلا پاکستانی ایڈیشن)، ص ۲۰۸

باطل کر دیا کہ اُردو لشکری زبان ہے، جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہ جہان کے عہد میں جنم لیا۔ مولوی عبدالحق نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر اُن کے بسیط تبصرے نے اُردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کو وُرطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے بڑی تقطیع کے تقریباً اٹھارہ سو صفحات پر پچاس ہزار کے قریب اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ قدامتِ زبان کے سبب، قطب شاہ کا یہ کلیات عسیر الفہم ضرور ہے، لیکن بلاشبہ یہ اُردو ہی کی ابتدائی اٹھان اور صورت کا نمونہ ہے۔

مولوی عبدالحق کا ایک پُر مغز تحقیقی مقالہ "اُردو کی نشوو نما میں صوفیائے کرام کا کام" کئی بار علاحدہ مختصر کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ دو اور طویل مقالے بھی کتابی شکل میں ملتے ہیں۔ ایک "مرحوم دہلی کالج" اور دوسرا "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر"۔ ۱۹۶۱ء میں انجمن کی طرف سے مولوی عبدالحق کے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ "قدیم اُردو" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں اُن کے اٹھارہ گرانقدر مقالات شامل ہیں۔ ملک الشعرائے بیجاپور کے سوانح اور کارناموں پر ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب "نصرتی" بھی مولوی عبدالحق کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

غرض مولوی عبدالحق کی سعی و تلاش نے نہ صرف اُردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی اُدھر تک وسیع کر دیا یعنی گیارھویں کے بجائے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسے بولتے ہوئے سُنا دیا بلکہ اس کے سبب مرحوم ہاشمی آبادی کے لفظوں میں ہمارے سامنے ہندوستان کی ملی تاریخ اور تہذیبی وحدت کے مطالعے کا ایک نیا باب کھل گیا۔

مولوی عبدالحق نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی متعدد اور متنوع کتابوں پر بلند پایہ اور فاضلانہ مقدّمات بھی لکھے۔ اِن مقدمات کو سب سے پہلے مرزا محمد بیگ نے ۱۹۳۳ء میں دو جلدوں میں مُرتب کیا۔ اس کے کوئی ایک تہائی صدی کے بعد ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان مقدّمات کو از سرِ نو مرتب کیا اور

لہ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ....، ص ۲۷۵

بہت کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ انہیں ایک جلد میں شائع کیا اس ایڈیشن میں موضوعات وار مولوی عبدالحق کے ستاون مقدمات شامل ہیں۔ چند مقدمات سے قطع نظر جو اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، مقدماتِ عبدالحق کا یہ ایڈیشن مولوی کے کم و بیش سب مقدمات پر حاوی ہے۔

مقدماتِ عبدالحق کو تاریخ ادبیاتِ اُردو میں بوجوہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ٹھیک[1] کہا ہے کہ اگر یہ مقدمے نہ ہوتے تو کلاسیکل لٹریچر کے تحفظ و احترام کا اور پھر اسے ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا جذبہ اتنا عام نہ ہوتا، جتنا اب ہے۔ یہ مقدمات مولوی عبدالحق کے وسیع مطالعے، ان کی نکتہ رسی اور دیدہ وری کے شاہد ہیں۔ "مقدمات" کتاب، صاحبِ کتاب اور نفس کتاب کے امکانی وقوف کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس لیے بڑے پُرمایہ اور سدا بہار ہیں۔ ان مقدمات سے مولوی عبدالحق کے تنقیدی شعور، ان کی تحقیقی استعداد اور ہر دو عناصر کے باہم امتزاج پر مولوی عبدالحق کی غیر معمولی قدرت کا پتہ چلتا ہے

مولوی عبدالحق محقق ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے بہت بڑے ناقدِ ادب بھی تھے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کا ایک مختصر مجموعہ ۱۹۳۹ء میں انجمن کی طرف سے "چند تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ایک مجموعہ تراب علی خاں باز نے "تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا تقسیم ملک بعد ان کے تنقیدی مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تقسیم سے پہلے کے مجموعوں کو بھی کسی اعتبار سے نامکمل اور مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے تنقیدی مقالات و مضامین لکھے جو ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور بہت کچھ رسالہ "اُردو" کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ طرزِ جدید کے مطابق عملی تنقید کا مذاق عام کرنے میں رسالہ "رسالہ" کو جو مولوی عبدالحق کی زیرِ ادارت پچھلے چالیس برس تک باقاعدگی سے نکلتا رہا، بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پریم چند نے بجا طور پر اسے اُردو رسائل کا قافلہ سالار" کہا تھا۔ اس تھا۔ اس رسالے میں کتابوں پر تبصرہ کا حصّہ ہمیشہ بڑا معرکے کا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کے "غیر رسمی" تبصروں نے تنقیدی

---

[1] برگِ گل، بابائے اُردو نمبر (مرتبہ: راقم الحروف و رفقا) اگست ۱۹۶۲ء ص ۲۵۲

شعور بیدار کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا ، ۱۹۴۴ء میں دانش محل لکھنؤ نے "ادبی تبصرے" کے نام سے مولوی عبدالحق کے بعض تبصرے کتابی شکل میں شائع لئے یہ نقد و تبصرے کا ایک معیار قائم کرتے ہیں اور آج بھی روزِ اوّل کی طرح بڑے وزن و وقار کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالحق پر حالی شخصیت نے بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقید کا چسکا ان کو حالی ہی کی صحبت میں لگا اور اُن کے توسل وہ شیفتہ سے بھی متاثر ہوئے۔ بصیرت و شعور، ذاتی رائے زنی کی صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ، نقد و بصر کے لیے انتہائی ضروری ہے خود مولوی عبدالحق کے لفظوں میں :

تنقید جس قدر عام ہے ، اسی قدر مشکل ہے ...... تنقید پر وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دُور بین ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو۔ جس نے ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وُہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دلنشین کرا سکتا ہے ، ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا حالی مرحوم نے کیا ہے ۔ فن کی حیثیت سے وُہ اس کے بانی ہی نہیں ایک اعلا پائے کے ادبی نقاد میں اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی جائیں گی۔"

(تنقیداتِ عبدالحق ، ص ۴۸)

عقلیت ، واقعیت اور چھان بین ، مولوی عبدالحق کی تنقید کے بنیادی عناصر ہیں۔ حالی کی طرح ان کی تنقید میں بھی گہرے تفکر اور آزادانہ رائے کی کمی نہیں۔ اُن کے نزدیک :

"عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے ، تنقید نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف اُدھر مُنہ پھیر لیتا ہے ....."

(تنقیداتِ عبدالحق ، ص ۷۲)

مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت اعتدال ، توازن اور معقولیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وُہ اُردو نثر میں خوشگواری ، سادگی و متانت ، اس کے موجودہ انقلاب و ارتقا اور

اس کی وسعت اور ادبی صلاحیت کو سرسید کی مساعی کا نتیجہ کر دانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وُہ اُن کی تحریر کو تنقید سے بالا سمجھ کر، اپنی رائے کو عقیدت ومحبت کی بھینٹ نہیں چڑھا دیتے بلکہ کمال عقلیت اور متانت کے ساتھ سرسید کی نثر کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں :

"(سرسید) کو ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وُہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے ہیں اس سے اکثر اُن کی عبادت سُست اور پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے ۔"

(چند ہم عصر، ص ۲۹۲)

مولوی عبدالحق حالی کے سب سے بڑے متبع ہیں وُہ اُن کے اتھاہ جذبۂ انسانیت کو بڑی قابلِ قدر چیز سمجھتے ہیں اور ان کی اپنی نیک نفسی، پاک سیرتی، سادگی اور شرافت نے اس جوہر کو خصوصیت کے ساتھ اپنا یا لیکن اسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں حالی کے صحیح جانشین ہونے کے باوجود مولوی عبدالحق شخصیت کی پہچان میں ( ) میں حالی سے زیادہ دُور رس ہیں اور ان کا خیر وشر کا تصوّر عقلی ہے، جذباتی نہیں ۔ وُہ انتہائی ہمدردی محبت اور عقیدت کے باوجود اپنی رائے کے منصفانہ اظہار میں پس وپیش نہیں کرتے خود حالی کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہوتے مولوی عبدالحق نے کسی رُو رعایت سے کام نہیں لیا ایک موقع پر لکھتے ہیں

"شہرت وُہ بدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے، کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں بلکہ شیوہ ہوگئی ہے ۔ (حالی) سیدھی ساری باتیں کرتے تھے . . . . .ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے ۔"[1]

(چند ہم عصر، ص ۱۶۸)

مولوی عبدالحق کی تنقید بے جھجک اور بے باک ہوتی ہے وُہ نام کو نہیں دیکھتے ۔

---

[1] "اُردو" بابائے اُردو نمبر (مرتبہ سیّد وقار عظیم) اگست ۱۹۶۲ء ص ۱۹۰

سرسید کی عبارت میں پھسپھساپن ہو یا حالی کی شاعری میں کہیں تعلّی کا شائبہ نظر آئے وُہ اس کی نشاندہی سے نہیں چوکتے، "چند ہم عصر" میں سرسید کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "ہم بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں" بایں ہمہ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک ممتاز اور نامور ہم عصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے متعلق جس بے جھجک انداز میں اپنی رائے مرتب کی ہے وہ "قابلِ داد" ہے:

(رشید احمد صدیقی) کے طرزِ بیان میں ایک بانک پن پایا جاتا ہے، جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لفاظی کے الجھاؤ سے اُلجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اُردو کے اُن انشا پردازوں میں سے ہیں۔ جن سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی اُفتاد اُنہیں کدھر لے جاتی ہے جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اُس میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں۔"

(چند تنقیداتِ عبدالحق، ص ۱۰)

مولوی عبدالحق جذباتیت یا ذاتی پسند ناپسند سے کام لیے بغیر انتہائی توازن اور منطقی استدلال کے ساتھ اپنی جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر نہایت پختہ رچے ہوئے تنقیدی شعور کا نمونہ ہوتی ہے۔ وُہ تنقید کرتے ہوئے مواد اور اسلوب دونوں پر یکساں نظر رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے تنقید کو عصرِ حاضر کے جدید رجحانات کے مطابق صحت مند بنانے میں بھی حصّہ لیا کیوں کہ اُن کے نزدیک:

شاعری کے انقلابات اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر سے اور اُس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اُس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دینا۔"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۷۵)

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت نہ صرف زیرِ نقد کلام کے ماحول اور اُس دور کے اُن معاشرتی و سماجی اثرات پر جس میں اس نے جنم لیا ہے نظر ڈالتے ہیں بلکہ "کلیم"

کے ذہن و دل کے دَر و بست کو بھی ٹٹولتے ہیں یعنی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حُسن و قبح پر نظر رکھتے ہیں۔ تنقید اُن کے نزدیک عقیدت یا منافرت کا اظہار نہیں بلکہ انتہائی ذمّہ دارانہ فرض ہے۔ وُہ کبھی کسی موضوع کو اس وقت تک چھیڑتے نہیں دکھائی دیتے جب تک اُسے ہر پہلو سے دیکھ بھال نہیں لیتے۔ انہوں نے تنقید کا تحقیق سے پیوند لگایا۔ موضوع زیرِ بحث کو اچھی طرح ذہن میں رچانے بسانے کے بعد وُہ تخلیقی عمل کے ماتحت اس کے معائب و محاسن کا تجزیہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں حیرت انگیز حد تک عقلیت، متانت اور اعتدال و توازن ملتا ہے۔

متین الرحمٰن مرتضیٰ کے بقول[۱] شبلی کا یہ خیال دُرست ہے کہ حالیؔ کنویں کی مانند ہیں جو محدود ہوتا ہے لیکن گہرائی رکھتا ہے اور خود شبلی نہر یا دریا کی مانند ہیں جس کی گہرائی اُس کی وسعت کی بہ نسبت بہت معمولی اور حقیر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے کنویں کی گہرائی اور دریا کی وسعت کو ہر دو بزرگوں سے کچھ اس طرح اصل سے بڑھ کر اپنایا کہ وُہ بحرِ ذخّار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو کنویں سے کہیں زیادہ گہرائی اور دریا سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق بہت بڑے خطیب اور اُردو کے معروف و ممتاز وکیل اور مبلغ بھی تھے اوّل اوّل دو جلدوں میں مولوی عبدالحق کے خطبات علی الترتیب ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۴ء میں انجمن کی طرف سے شائع ہوئے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تیرہ خطبوں اور تقریروں کے اضافے کے ساتھ ان خطبات کو یک جا کر کے مرتب کیا۔ خطباتِ عبدالحق کے اس جامع ایڈیشن کی اشاعتِ ثانی ۱۹۶۴ء میں چار مزید خطبات کا اضافہ کیا گیا۔ اب اس مجموعے میں کل اٹھتیس خطبے اور تقریریں شامل ہیں۔

یہ خطبات مختلف مواقع پر اور پاک و ہند کے مختلف مقامات پر دیے گئے۔ خطبات کا موضوع ہر جگہ زبان و لسان اور شعر و ادب کے مسائل و معاملات سے متعلق رہا ہے۔ اس کے باوصف یہ خطبے اعادہ و تکرار اور یکسانیت کے عیب سے کم و بیش خالی ہیں۔ وُہ ہر مرتبہ اپنی

---

[۱] برگِ گل، بابائے اُردو نمبر (مرتبہ راقم الحروف وُ رفقا) اگست ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۸

بات زیادہ توانائی اور تازگی سے پیش کرتے اور اسے ذہنوں میں جماتے اور منواتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھی خطابت کا ایک میزان معیار یہ بھی ہے کہ وہ سامعین کو کس حد تک زیرِ اثر لیتی ہے اس لیے خطابت کو شریفانہ نعرہ بازی کہا گیا ہے جس میں ہجومی نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق خطبات میں سامعین کو مختلف وسیلوں سے متوجہ کرتے ضرور نظر آتے ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کاوش میں اُن کے خطبے وقتی ہو کر رہ گئے ہوں۔ یہ اپنے "اندازِ گذارش و نگارش" کے سبب زود اثر اور مواد و معنی کے اعتبار سے مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالحق کو انسانی سیرتوں کی عکاسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اُن کی کتاب "چند ہم عصر" جس کا شمار ادبیاتِ عالیہ میں ہوتا ہے اِس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ اُنھوں نے جن ہم عصروں پر قلم اُٹھایا ہے، اُن سے وُہ کسی نہ کسی طور پر مُتاثر ہوئے اور رہے ہیں۔ اس طرح سیرت نگاری کے لیے ہم عصروں کے انتخاب اور چناؤ کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت، اُن کے عقائد و نظریات اور مرکزی اقدارِ حیات تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ممدوحین کی جن خوبیوں کو سراہا، جن عادات و اطوار کی ستائش کی اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی روشنی میں ہمیں مولوی عبدالحق کے محاکے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے کردار کی تعمیر اپنے "اُستادِ معنوی" حالی کے کردار کی طرح خلوص پر ہوئی۔ حالی کی طرح وُہ بھی سادگی کے دل دادہ ہیں۔ وُہ ہمیشہ بیان میں سادگی اور صفائی پر زور دیتے ہیں۔ زبان میں بلا وجہ لفاظی اور ثقالت کو بدعت خیال کرتے ہیں اُن کے نزدیک سادگی و پرکاری "کمالِ صناعی ہے اس میں ادب بھی شامل ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لُطف اُٹھائیں، اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیعِ اوقات ہے۔

وسعتِ مطالعہ اور زیرِ فکر موضوع پر غائر نظر قدرتی طور پہ سادہ بیانی کا موجب ہوتی ہے، مگر سادہ بیانی پر قدرت ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس کے لیے گہرا ریاض، وسیع مطالعہ اور فکر و نظر میں کشادگی ضروری ہے۔ پریشان خیالی تحریر میں "دھندلا پن" پیدا کرتی ہے۔ شعوری طور پہ آراستہ زبان عجزِ بیان کا مظہر ہوتی ہے اور یہ "شیوۂ ضعفِ ادبیت کی دلیل ہے"۔ اس عقب میں ہم اگر مولوی عبدالحق کی نثر کا جائزہ لیں تو اُن کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حالی کے بعد وہ اُردو کے سب سے بڑے نثار ہیں اُن کے نزدیک:

"آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا وہاں تو دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بے محل آگیا ہے تو ایسا ہی بُرا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور اُلجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں"

(خطباتِ عبدالحق، ص ۲۶۴)

سادگی اور صفائی کے مفہوم کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق — بسا اوقات حالی پر بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ اُنھیں کے مطابق:

"ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۱۲)

زبان میں لفظوں کی ساخت، عہد بہ عہد تغیر اور ان کے استعمال و معنی میں لطیف فرق و امتیاز کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ بعض اوقاتِ عبارت میں موقع محل کے مطابق کوئی نامانوس اور غیر مستعمل لفظ یا ہندی یا سنسکرت اور بھاشا کی کوئی متروک ترکیب اس چابکدستی سے استعمال کر جاتے ہیں کہ تحریر میں جان پڑجاتی ہے مثلاً "چند ہم عصر" میں مولوی چراغ علی کے متعلق یہ سطور کس قدر خوبصورت نظر آتی ہیں:

"تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے، اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے مالیہ و ماعلیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔"

مولوی عبدالحق کی تحریر میں انسانی فکر و شعور کے لئے رہنمائی، فنی قدروں کے نفاذ اور ادبی و لسانی مسائل پر احکام کی فراوانی ملتی ہے، جو اُن کی بصیرت کی امین اور عظمت و بزرگی کی علامت ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے خطیب و معلّم اخلاق بھی تھے۔ اُن کی تحریریں اخلاقی درس کا بہت عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں اقوامِ عالم کے عروج و زوال علی الخصوص مسلمانوں کے ارتقا و تنزل پر ان کی نظر گہری تھی وہ اسباب و علل کو "اپنی نظر" سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریریں پائیدار تجربوں اور اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کی دولت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ اُن کی تحریریں خیال افروز مقامات قدم قدم پر آتے ہیں، جن سے پڑھنے والے کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف اسے کچھ دے رہا ہے اُس کا وقت ضائع نہیں کر رہا۔ یہاں چند اقتباسات بے محل نہ ہوں گے۔

"ادب میں حُسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔"

(مقدمات، ص ۲۶۰)

"زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غایت ہے۔"

(مقدمات، ص ۱۰۴)

"اُمراء کی صحبت، آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔"

(مقدمات، ص ۸۰۴)

"اچھا استاد، دُنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔"

(مقدمات ۱، ۲۰۲)

"صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

انتقام لینے والا، اکثر گھاٹے میں رہتا ہے۔"

(مقدمات، ۱۵)

"نقالی، آخر نقالی ہے اور جدت کی دشمن۔"

(مقدمات، ۱۱۴)

"بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

"صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہے، جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں بشرطیکہ اُس میں صداقت ہو۔"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

"ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

"(سچ کی چاہ) ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

"جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُس سے جھوٹ بولے۔"

(ادبی تبصرے، ۷۶)

"اصلاح و ترقی کے لیے اخلاقی جرأت سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔"

(ادبی تبصرے)

"توہمات اور تعصبات کی اصلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ان کا استیصال ہے۔"

(ادبی تبصرے، ۱۱۶)

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔"

(ادبی تبصرے، ۷۷)

"جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں، وُہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔"

(اَدبی تبصرے، ۸۰)

"زندگی سب کے لیے مُعمّہ ہے۔ اِس کے اسرار عقل سے نہیں کھلتے۔"

(اَدبی تبصرے، ۸۶)

"اَیسے مُصنّف و مُولف جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں، وُہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔"

(چند تنقیداتِ عبدالحق، ۳۱)

"بُرائی میں بُرا کرنے والے کی تباہی کا سامان موجود ہوتا ہے۔"

(مکتوباتِ بابائے اُردو، بنام اِمامی، ۱۵۲)

یہ اقتباسات بغیر کسی خاص کاوش اور ترتیب کے پیش کر دیے گئے ہیں لیکن بلا لحاظ ان سے ایک نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے ہاں معنی و مفہوم کی اکائیوں اور لفظوں میں بہت کم فرق اور فاصلہ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے دنیا کو دیکھا اور برتا تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں، ذہن روشن تھا۔ اس سے ہٹ کر اور بڑھ کر وُہ نتائج کے استنباط کی خداداد صلاحیت سے مُتصّف اور بہرہ ور تھے۔ یہی وُجہ کہ زمانے، ذہن، زندگی، کائنات زبان و لسان، انسان اور ادب و شعر وغیرہ سے متعلق اُنہوں نے جو باتیں کہی ہیں اور جس وقیع اور بلیغ انداز میں کہی ہیں وُہ اُنھی کا حصّہ ہے۔

مولوی عبدالحق اُردو کے بابا و مسیحا، بے لوث و بے مثال گزار، جیّد عالم مجتہد قواعد نگار ماہرِ لسانیات، قدر اوّل کے لغوی محقق و نقاد، بہت بڑے خطیب اور مقدمہ نویس، عقب کے سیرت نگار صاحب طرز انشاء پرداز اور اعلیٰ درجے کے مفکّر اور منتظم تھے۔ یہاں اس بات کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کو عظیم میں مقبول عام بنانے کے لیے کس قدر جدوجہد کی۔ صرف تقسیم ہند سے پہلے ہی کے نو دس سالہ طوفانی دوروں کی مسافت کا اندازہ لگایا جائے تو بات پچاس ساٹھ ہزار میل تک

پہنچتی ہے اس سے ان کی ہمت واستقلال، لگن واستقامت اور غیر معمولی تڑپ اور دھن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس غیر معمولی اخلاص وانہمک، خداداد قابلیت اور غیر منقطع جدوجہد سے بیداریٔ احساس اور حمایتِ اُردو کی جو عام لہر اور فضا پیدا ہوئی اس کا احاطہ دشوار ہے۔

غرض مولوی عبدالحق نے اپنی بے پناہ تنظیمی قوت، غیر معمولی استعداد کار اور اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو تا دمِ مرگ اُردو زبان وادب کی ترویج وتہذیب کے لیے وقف رکھا اُن کا سا جوشِ عمل اور انہماک رکھنے والا بے لوث خدمت گزار اُردو زبان کی تاریخ میں کوئی دوسرا نہیں گزرا۔

"چند ہم عصر" کا تجزیاتی مطالعہ

[تحریر: ۱۹۶۳ء؛ نظر ثانی: ۱۹۷۴ء]

"ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں، صحرا بھی ہو، دریا بھی ہو، آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے۔"

(مقدماتِ عبدالحق، ۲/۴۳۲)

مولوی عبدالحق، صاحبِ نظر تھے۔ انھیں انسانی سیرتوں کی بڑی پرکھ تھی اور اس پرکھ کو لفظوں کا متناسب پیرہن عطا کرنے کی غیر معمولی قدرت اور صلاحیت کے بل پر انھوں نے اپنے بعض رفیقوں، بزرگوں اور نیازمندوں کے وہ وہ مرقعے تراشے ہیں، کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ "چند ہم عصر" اس ذیل کا یادگار مجموعہ ہے۔ اس سے اردو میں مرقع نگاری کا دامن سلامت ہے۔

مختلف اوقات میں لکھی گئی مولوی عبدالحق کی ان تحریروں کو سب سے پہلے مولوی صاحب کے ایک عزیز اور لائق شاگرد شیخ چاند نے جمع کیا لیکن وہ انھیں اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ چاند کے انتقال (۱۹۳۶ء) کے بعد یہ مجموعہ سلسلۂ انجمن ترقی اردو نمبر ۱۰۳ کے تحت، لطیفی پریس، دہلی سے شائع ہوا (سال اشاعت: ندارد، سائز: ۱۸ × ۸/۲۲، ضخامت: ۱۵۱ صفحات)۔

"چند ہم عصر" کا پہلا ایڈیشن بہت کمیاب ہے۔ یہ انجمن ترقی اردو (پاکستان)، کراچی کے کتب خانہ خاص تک میں موجود نہیں اور دس پندرہ برس کی تلاش کے بعد یہ سالِ گذشتہ

(۱۹۷۳ء) راقم الحروف کے ہاتھ آیا ہے۔ طبع اوّل کے آغاز میں منیجر انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن کی طرف سے چودہ سطری "التماس" ہے جس سے کتاب اور مرتب کتاب کے عزائم اور انجام پر روشنی پڑتی ہے:

"یہ مضامین، مرحوم شیخ چاند، ایم۔اے، ایل ایل۔بی (ریسرچ اسکالر، جامعہ عثمانیہ) نے مختلف رسالوں، کتابوں اور تحریروں سے بڑی محنت اور تلاش کے بعد جمع کیے تھے۔ ان میں سے کچھ تحریریں تو ایسی ہیں جو بعض بزرگوں کی وفات پر لکھی گئی تھیں اور کچھ کتابوں کے تبصرے کے ضمن میں آگئی تھیں۔ یہ سب مرحوم نے ایک جگہ جمع کر لی تھیں۔

مرحوم کی ایک فرمائش مولوی عبدالحق صاحب سے یہ تھی کہ سرسید احمد خاں، نواب عماد الملک اور مولانا حالی پر بھی اسی قسم کی تحریریں لکھ دیں، کیوں کہ مولوی صاحب کے ان تینوں بزرگوں سے خاص تعلقات تھے۔ مولانا حالی پر تو ایک مضمون لکھ دیا، لیکن باقی دو مضمون لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اگر طبع ثانی کی نوبت آئی تو اُمید ہے کہ اس کی تکمیل ہو جائے[1]

ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہر تحریر کے ساتھ فوٹو بھی لگا دیے جائیں لیکن اس کا بھی موقع نہ ملا، اسے بھی آئندہ کے لیے اُٹھا رکھا ہے[2] ان مضامین کی ترتیب بھی وہی رکھی گئی ہے جو مرحوم شیخ چاند نے رکھی تھی۔ افسوس، وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے اور اس سے پہلے ہی چل بسے۔ اب، اس جواں مرگ کی یاد میں یہ کتاب طبع کی جاتی ہے۔"

اس ایڈیشن میں چودہ شخصی مرقعے شامل ہیں۔ آخری خاکہ حالی کا ہے جس پر سال ۱۹۳۷ء ثبت ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ اس سال یا اس کے قریب بعد کسی وقت شائع ہوا۔

---

[1] ۔ سرسید پر "چند ہم عصر" کے تیسرے اور عماد الملک پر پانچویں ایڈیشن میں مضامین کا اضافہ ہوا

[2] "چند ہم عصر" کے چھ ایڈیشن مولوی عبدالحق کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن تصاویر کی نوبت کبھی نہ آسکی

۱۹۴۲ء میں "چند ہم عصر" کا دوسرا ایڈیشن، منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ انجمن کے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۹۲ کے تحت جمال پریس دہلی سے طبع ہوا۔ اِس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے تھے۔ نام دیو، مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد نظر ثانی و اضافے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے دیباچے کے ساتھ چھپا۔ سر سید پر مولوی عبدالحق کا سیر حاصل خاکہ اس ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ تین سال بعد ۱۹۵۳ء میں انجمن ہی کی طرف سے "چند ہم عصر" کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ اِس پر تحسین سروری کا مختصر سا دیباچہ ہے اور اس میں عبدالرحمٰن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ری ہیٹ سک اور عبدالرحمٰن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ "چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس پر سال اشاعت کہیں درج نہیں۔ انجمن کے کتب خانہ خاص میں نسخے کے اندراج سے سالِ اشاعت ۱۹۵۶ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی صاحب کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اِس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون (جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شامل کر دیا تھا) اِس اعتذار کے ساتھ حذف کر دیا گیا ہے کہ:

"یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ ان کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

اِس چھٹے ایڈیشن میں، جو مولوی عبدالحق کی زندگی میں "چند ہم عصر" کا آخری ایڈیشن ثابت ہوا۔ کُل چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق کچھ اور اصحاب پر بھی شخصی مضامین لکھنے کی فکر میں تھے۔ اِس کی نشاندہی خود ان کے اپنے ایک خط مکتوبہ

۲۳ اپریل ۱۹۵۶ء سے ہوتی ہے نصیر الدّین ہاشمی کو لکھتے ہیں :

آپ نے . . . . محسن الملک اور حیدری صاحب پر لکھنے کی فرمائش کی ہے . . . . محسن الملک پر لکھ چکا ہوں (دیکھئے ! "چند ہم عصر") البتہ حیدری صاحب پر ضرور لکھوں گا ۔ فی الحال اگر فرصت ملی تو گاندھی جی اور سر تیج بہادر سپرو پر لکھنے کا ارادہ ہے ۔ گاندھی جی کی شخصیت بہت پیچیدہ ، پُراسرار اور گہری ہے میں بعض ایسے واقعات کا اظہار کروں گا جن کا علم اب تک کسی کو نہیں اور جن کے آشکار ہونے سے تہلکہ مچ جائے گا [۱]

یہ ہے کہ ان ممتاز شخصیتوں پر " لکھنے " کا ارادہ شرمندۂ عمل نہ ہوا ۔ گاندھی پر مولوی عبدالحق

یہ ہے کہ ان ممتاز شخصیتوں پر " لکھنے " کا ارادہ شرمندۂ عمل نہ ہوا ۔ گاندھی پر مولوی عبدالحق

کا موعودہ مضمون خصوصیت سے بہت معرکے کا ہوتا مگر زندگی کی الجھنوں اور آخری ایام کی علالت نے اُنھیں اس کام کے انجام دینے کی مہلت نہ دی ۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے پر اُنھیں علاج کے لیے مری کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں لے جایا گیا ۔ گاندھی پر اپنے زیرِ قلم مضمون کی تکمیل کا خیال یہاں بھی اُنھیں ستاتا رہا ۔ " مولوی صاحب کے آخری ایّام " کے تحت ابن انشا صاحب نے لکھا ہے :

" ایک زمانے میں وُہ گاندھی پر لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے ۔ اس کے متعلق ہندوستان سے شائع شدہ دو موٹی موٹی کتابیں بھی وُہ پڑھ چکے تھے ۔ مجھ سے لوئی فشر کی کتاب بھی منگوائی ۔ مری میں کہنے لگے دیکھو وُہ گاندھی والا مضمون بھی پڑا ہے ۔ اچھا ، اب کے کراچی چل کے اسے پورا کرتا ہوں [۲] "

لیکن افسوس ، وُہ اسے پورا نہ کر پائے ۔ مری سے کراچی واپس آنے کے پانچویں روز بعد اُن کا انتقال ہو گیا ۔ مضمون کا جو حصّہ وُہ لکھ چکے تھے ، نامکمل صورت میں ، وُہ بھی ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا ۔

---

[۱] مکتوباتِ عبدالحق (مرتبہ : جلیل قدوائی) صفحہ ۳۵۱

[۲] قومی زبان (بابائے اُردو نمبر) ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۶

"چند ہم عصر" کے آخری اڈیشن ۱۹۵۹ء میں جو چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں، اُن میں مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے - اِس کی نشاندہی خود انھیں نے اپنے "دیباچہ" میں کی ہے - لکھتے ہیں -

"میرے ایک ایرانی نژاد دوست مرزا حیرت کا بچا کھچا کلام لائے تھے اور اس کے ساتھ یہ مضمون انگریزی میں لکھا ہُوا مجھے دیا - اس کا ترجمہ اور حیرت کا کلام دونوں رسالہ "افسر" میں شائع ہوئے - شیخ چاند مرحوم نے یہ سمجھ کر کہ یہ میری تحریر ہے، "چند ہم عصر" میں داخل کر دیا"

"چند ہم عصر" کے بقیہ تیئیس[۲۳] خاکوں میں سب سے پُرانی تحریر پروفیسر ری ہٹ سک پر ہے جو اوّل اوّل رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے تحسین سروری کے ہاتھوں "چند ہم عصر" کے چوتھے اڈیشن میں پہلی بار شامل کیا گیا - آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو کتاب کے "آخری" اڈیشن کے لیے لکھا گیا لیکن اس سے پہلے ہفت روزہ "لیل و نہار" کے سالنامے ۱۲ ، اپریل ۱۹۵۹ء (جلد ۹ نمبر: ۱۵) میں شائع ہوا - اس طرح یہ شخصی مضامین ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک مختلف مواقع پر کم و بیش ساٹھ سال کی طویل مُدّت میں لکھے گئے -

"چند ہم عصر" کے خاکے فرمائشی نہیں ہیں - مولوی عبدالحق نے اُنھیں کی سیرتیں لکھی ہیں جن سے وُہ ذاتی واقفیت رکھتے تھے - نصیر الدین ہاشمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ نے سرور جنگ ...... پر لکھنے کی فرمائش کی ہے - سرور جنگ کے حالات سے مَیں زیادہ واقف نہیں [۱]"

نصیر الدین ہاشمی ہی کے نام ایک دوسرے خط میں مولوی عبدالحق نے اپنے نقطۂ نظر کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے :

"آپ نے سرور جنگ کے حالات کی فرمائش کی تھی، میں سرور جنگ سے

[۱] مکتوباتِ عبدالحق، ۱۵۱

زیادہ واقف نہ تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے شخص کے متعلق کچھ نہیں لکھا جس کے حالات، خصائل اور سیرت سے مجھے پوری واقفیت نہ ہو۔ میں نے سر ور جنگ کو دیکھا ضرور ہے مگر ذاتی طور پر ان کے حالات وغیرہ سے ناواقف ہوں[1]

"چند ہم عصر" کی سیرتیں "ذاتی اور پوری" واقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ اِس لیے اس میں بعض اشخاص خصوصاً، سرسید، حالی، مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی اور میراں صاحب کے ایسے ضروری حالات اور بعض قابلِ عزت پہلو اس طرح یکجا مل جاتے ہیں اور سامنے آتے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاید ہی ملیں۔ یہ "چند ہم عصر" کا ایک اہم امتیاز ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن شروانی نے "مقدماتِ عبدالحق" کے دیباچے میں اِس امر پہ حد درجہ افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم اُس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چکے جو سرسید سے شروع ہو کر وقار الملک پر ختم ہوا۔

"کیسا ہی یہ عبرت ناک بیان ہو مگر واقعہ ہے کہ آج .... سب سے زیادہ گم ہستی سرسید احمد خاں مرحوم کی ہے، نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر اُن کے حالات جاننے والا، ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر پیروی کا شوق رکھنے والا، مجھ کو کوئی نظر نہیں آتا۔ پس مولوی عبدالحق صاحب کی وُہ سعی جو اُنھوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کے لیے کی ہے، ہمارے شکر کی مستحق ہے۔"

"چند ہم عصر" میں سرسید کی سیرت و سوانح پر مولوی عبدالحق کا شخصی خاکہ کم و بیش سوا سو صفحات پر مشتمل ہے، جو بجائے خود ایک الگ اور مستقل کتاب کو کفایت کرتا ہے۔ یہ بڑے خلوص اور خوبی سے لکھا گیا ہے۔ حالات و واقعات کی ضروری اور مناسب تفصیل پیش کی گئی ہے اور ان مباحث و کوائف سے صرفِ نظر کیا گیا ہے، جن کا مولوی عبدالحق کو پورا اور ذاتی وقوف نہیں تھا۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ایک خط میں مولوی صاحب سرسید

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۳۵۲

سے متعلق آپ نے اس مرقع کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اُس میں مَیں نے اُن کے مذہب اور سیاست کو نہیں چھیڑا۔ سیاست کا ذکر سرسری کے۔ مذہب کے متعلق اِس لیے کچھ نہیں لکھ سکا کہ اس بارے میں میرا علم جہل سے بدتر ہے"[۱]

غرض ذاتی واقفیت، مرقع نگاری کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی ایک بنیادی قدر ہے جس کا انھوں نے ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس قدر کا نتیجہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کا تراشیدہ کوئی مرقع، سرسری یا ہوائی نہیں۔

مقدمہ "مآثر الکرام" میں مولوی عبدالحق نے ضمناً ایک بات کہی ہے جس میں سیرت نگتی کے لیے اُن کے میزانِ انتخاب کا اشارہ مخفی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ :

"پند و نصائح اور اخلاقی کتب اِس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر ان لوگوں کے تذکرے، جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے"[۲]

سرسید کے مرقع میں مولوی عبدالحق نے اپنے اِسی خیال کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے :

"اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسّر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی .... رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ اُن بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے"[۳]

۱۔ مکتوباتِ عبدالحق، ص ۳۲۷ ۲۔ مقدماتِ عبدالحق، (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی) ۴۱۲
۳۔ "چند ہم عصر"، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع (۱۹۵۹ء) ۳۲۵ و بہ بعد

اِس اشارے اور اقتباس سے بجا طور پر یہ نتیجہ مُرتب کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک "ہیرو" کا اولوالعزم، صاحبِ ایثار، بندۂ استقلال، اخلاص مند اور بے نفس و بے ریا ہونا شرط ہے۔ مولوی عبدالحق شخص کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ سیرت کسی کے لیے اُن کا میزانِ انتخاب بھی یہی ہے اور مطمعِ نظر بھی۔ چنانچہ جہاں یہاں وُہ ہر سیرت سے اس طرح کا کام لینے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں۔ یوں دیکھیے تو اخلاق آمیزی اور سبق آموزی مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری کی ایک دوسری بدیہی قدر ہے۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک انسان کا بہترین مُطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں وُہ امارت اور افلاس کا کوئی فرق روا رکھتے ہیں اور نہ ایسی کسی دوسری ہی حد بندی کے قائل ہیں۔ اُنھیں انسانیت سے پیار اور اعلیٰ انسانی اقدار سے عشق ہے۔ وُہ سچائی، نیکی اور حُسن کو کسی کی میراث نہیں سمجھتے۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ممکن ہیں، جیسی اونچی ذات والوں میں۔ اُن کا نقطۂ نظر بے حد وسیع ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی شان ہے۔ وُہ قوموں اور طبقوں کے امتیاز کو مصنوعی سمجھتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ کتنا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہو سکتی اور اچھے بُرے ہر قوم میں ہو سکتے ہیں۔ اِسی لیے اُنھوں نے نواب محسن الملک اور مولوی چراغ علی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، نواب عماد الملک، نواب محسن الملک اور مولوی سیّد علی بلگرامی ایسے متبحر اہلِ علم و فن۔ اور سیّد محمود، مولوی عزیز مرزا، راس مسعود، خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، عبدالرحمٰن بجنوری، پروفیسر ری ہیٹ سک، عبدالرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر اقبال ایسے نامور اور لائق فرزندوں کے دوش بدوش، ایک غریب سپاہی نور خاں اور ایک مالی نام دیو کے مرقعے بھی تراشے ہیں، اور اس فہمائش کے ساتھ کہ:

"کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، اُمیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں بلکہ غریبوں (اور عامیوں) میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے[1]۔"

---

[1] چند ہم عصر، ۱۲۴

اِن خاکوں کے ذریعے مولوی عبدالحق نے نور خان اور نام دیو کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور خود مولوی الحق کے اَدبی "نامۂ اعمال" سے اُن کی طویل طویل خدمات حذف کر دی جائیں تو بھی محض اِن دو خاکوں ہی سے اُن کی انسانی دوستی، وسیع النظری اور عظمت و بزرگی اپنی جگہ مسلم رہتی ہے اور وُہ انسانیت کے بہت بڑے علم بردار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جا سکتے ہیں۔

مَولوی عبدالحق کے نزدیک انسانی کی بُرائیاں ہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض اوقات اُس کی خوبیاں بھی اُسے لے ڈوبتی ہیں۔ مَولوی صاحب محض نیکوں ہی کے ہی خواہ نہیں، وُہ بدوں سے بھی ہمدردی رکھتے ہیں اور دنیا کی بہت کچُھ رونق کا ذمّہ دار انہیں قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بُرائی۔ اِس طرح نہ انسان بے عیب ہُوا ہے نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اپنے "ممدوح" کے محض حُسن ہی سے سروکار نہیں رکھتے، اُس کے عیوب و نقائص کا ذکر بھی کر دیتے ہیں اور یوں اُن کی سیرت نگاری کسی مرحلے پر بھی "پروپیگنڈا" نہیں ہونے پاتی۔ حالی کو وہ "بے مثال خصائل کا بزرگ[۱]" کہتے ہیں اور ان کی پاک سیرتی کے بڑے مدّاح ہیں لیکن اُن کی کمزوری سے چشم پوشی نہیں کرتے۔

"نام و نمود چھوڑ کر نہیں گیا تھا، ورنہ شہرت وُہ بَدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آہی جاتی ہے .... ہاں، شعر میں البتّہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے[۲]"

مَولوی محُمّد عزیز مرزا میں مَولوی عبدالحق کو وُہ تمام اَوصاف دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی مُلک و قوم کو اُس وقت سخت ضرورت تھی[۳] لیکن وُہ اُن کی خوشامد پسندی[۴] کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی ، مولوی عبدالحق کے نزدیک :

ہندوستان کے عہد جدید کے اُن نامور علماء میں سے ہیں جنھوں نے علم و السنہ مشرقیہ

---

۱ چند ہم عصر، ۱۶۱ ۲ چند ہم عصر، ۱۶۸

۳ چند ہم عصر، ۶۶ ۴ چند ہم عصر، ۶۵

و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدّن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ؎۱،، لیکن اِس کے ساتھ وُہ اُن کی شخصی خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں :

"مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وُہ متلوّن مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِّ جاہ میں اَیسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں ؎۲ "

حکیم امتیاز الدین کو مولوی عبدالحق اَپنا بے مثل دوست کہتے ہیں ؎۳ لیکن اِس محبت میں وُہ اُن کی طبیعت کی کمزوری اور اُن کے مزاج کے لاابالی پن کو نہیں چھپاتے ؎۴ نواب محسن الملک کی وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی کے مولوی عبدالحق بڑے مدّاح ہیں ؎۵ ،، لیکن اِس مدّاح کے باوجود نواب محسن الملک کی کمزوری کو حد درجہ قابلِ افسوس گردانتے ہیں کہ وُہ گورنر وقت کی دھمکی پر اُردو کی حفاظت میں قائم ہونے والی انجمن سے دستبردار ہو گئے ؎۶ وہ سَر سیّد راس مسعود کی طباعی، ذہانت، قابلیت صلاحیت اور حافظے کے قائل ہیں ؎۷ ، لیکن اِس "معتقد" کے ساتھ ہی وُہ اُن کی شخصی کمزوریوں کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے :

"مسعود میں مُقابلے کی قوت مُطلق نہ تھی۔ وُہ بڑے ذکی الحس تھے، ذرا سی مخالفت سے پریشان ہو جاتے تھے۔ خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اِس میں وُہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آ جاتے تھے ؎۸ "

اُردو نثر میں انقلاب اور ترقی اور اس کی وسعت و اَدبی صلاحیت کو وُہ سَر سیّد کا طفیل گردانتے ہیں ؎۹ لیکن اِس رَو میں وُہ ان کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کرتے :

---

۱ چند ہم عصر، ۶۷ ۲ چند ہم عصر، ۱۰۶
۳،۴ چند ہم عصر، ۱۱۶ ۵ چند ہم عصر، ۱۳۹
۶ چند ہم عصر، ۱۵۰ ۷ چند ہم عصر، ۲۰۰، ۲۰۴
۸ چند ہم عصر، ۱۹۸ ۹ چند ہم عصر، ۲۸۵

"انھیں اَدائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اِس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وُہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کی عبارت سُست اور پھُس پھُسی معلوم ہوتی ہے۔" [۱]

مولوی عبدالحق، حسرت موہانی کی بے پایاں روحانی قوّت، اخلاقی جرأت اور خلوص و صداقت کے مُعترف اور معترف ہیں [۲]، لیکن اِس غزّے میں وُہ ان کی انتہا پسندی کو نہیں بھولتے [۳]۔ وُہ نواب عماد الملک کی بے دریغ علمی سرپرستی علمی فیض رسانی فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار پر اچھے لفظوں کے خراج کے ساتھ ساتھ نئی طرزِ معاشرت اور آئے دِن کے تغیرات سے پیدا شدہ اُن کی بیزاری اور تن آسانی کا بھی ذکر کرتے ہیں [۴]۔

اِس توازن اور غیر جانب داری کا نتیجہ ہے کہ ان کی سیرت نگاری پر نہ صرف یہ کہ مناقب یا افترا کا الزام نہیں آتا، اُن کے کسی ممدوح پر فرشتے یا شیطان کا گمان نہیں ہوتا بلکہ اِس کے برعکس یہ سیرتیں جامد، یک رخی اور نادیدہ معلوم ہونے کے بجائے مانوس، مدوّر اور مکمل معلوم ہوتی ہیں۔ اِسی "توازن" نے مولوی عبدالحق کے تراشیدہ مُرقعوں کو سدا بہار اور ان کی سیرت نگاری کے فن اور عمل کو کلاسیکل بنایا ہے۔

سیرت نگاری اور سوانح عمری میں پھیلاؤ اور سمٹاؤ کے امتیاز سے قطع نظر، باعتبارِ فن بُنیادی فرق ہے۔ سوانح عمری نے انصاف کے لیے تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے جامد واقعات اور اٹل حقائق سے آنکھیں چار کرنا ہوتی ہیں، جس کے لیے لا محالہ ایک ٹھہراؤ اور سکون درکار ہوتا ہے۔ سیرت نگاری میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اسیر کرنا پڑتا ہے اور چند اہم اور خیال افزا اشاروں اور شخصیت کی رنگا رنگی میں سے کچھ نمایاں اور نمائندہ نقوش کے محتاط انتخاب سے پوری شخصیت کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ پھر اِس عمل میں ایک طرح کی تیز رَوی کی بھی ضرورت ہوتی ہے،

۱؎ چند ہم عصر، ۲۹۲ ۔ ۲؎ ۳؎ چند ہم عصر ۲۶۱، ۲۶۳ (علی الترتیب)

۴؎ چند ہم عصر، ۴۲۵

تاکہ شخصیت کی نیرنگیاں ایک آن جھلک دکھا کر، کسی مجموعی ہا تیکھے اور واضح نقش کے ابھرنے میں معاون ہو سکیں۔

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری میں ہمیں انفرادی شخصی تاثر کے ساتھ تاریخی اور واقعاتی چھینٹے بھی ملتے ہیں۔ اِس خوش گوار امتزاج نے اُن کی مرقع نگاری میں تنظیم وتہذیب اور اُن کے محاکات کی فضا میں سرشاریٔ حیات کی کرامت پیدا کر دی ہے "شعر اور شاعری" کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"شاعری کے انقلاب اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات وتغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شاعر کو شاعری سے اور اُس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو اُس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جُدا کر دینا۔ جب ہم شاعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات اُس کی طبیعت، اُس کے خصائل اور عادات پر نظر ڈالیں اور اس کے عہد کے واقعات و حالات وتغیرات و انقلابات کا ذکر کم اِس حد تک ضرور کریں جہاں تک اُن کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری ،، اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے[1]،،

یہ کچھ شاعر ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی شخص اپنے عہد کے حالات سے کم یا زیادہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیرت نگاری کے ذیل میں بھی مولوی عبدالحق کا میزانِ معیار بعینہٖ یہی ہے وُہ اپنے "ممدوح" کو کبھی اُس کے زمانے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے اور نہ اُس کے عہد کے حالات سے بے نیاز ہو کر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

---

[1] تنقیداتِ عبدالحق، ص ۸۷

فرد کو اُس کے عہد میں رکھ کر ہر رشتۂ اعتدال پر رہنا اور "کم سے کم حد" کا لحاظ رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ پُرخار پگڈنڈی ہے کہ جس پر چلتے ہوئے ذرا سی بے اعتدالی سے سیرت نگاری کے منصب سے گر کر "واقعات کی کھتونی" کے داغ مُقدر ہو جانے میں دیر نہیں لگتی۔ مولوی عُبیدالحق کے ہاں "کم سے کم حد" کا فن بھرپور زندگی در عنائی اور پوری آب و توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے عہد کے تغیرات و انقلابات کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے بڑی چابکدستی اور ذہانت داری سے کام لیتے ہیں:

"جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا۔ اس لیے یہ انہیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ ذرا سی بدگمانی پر بھی اُن کے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ اُس وقت شاید ہی کوئی ایسا مصنف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے تھے اور اپنے خیال میں بد مذہب و بدعقیدہ سمجھتے تھے، اُن کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا...
...... نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا۔ پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے، نیچری ہونے پر لکچر دیے اور مضامین لکھنے لگے، لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے تھا[1]"

●

"ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا، اس کارزارِ حیات میں

---

[1] چند ہم عصر (نواب محسن الملک)، صفحہ ۱۴۴ و ما بعد

سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے . . . . مسلمانوں میں دو چار خاندان ایسے تھے جنھوں نے کش مکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہنچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لیے بڑھے اور زمانے کے ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا[1]۔"

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کی ایک اور خصوصیت اُن کی سچائی اور بے باکی ہے۔ وُہ اَسلاف کی اُس نسل کی یادگار تھے، راست گوئی اور راست بازی جس کا طرۂ امتیاز تھا۔ وُہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے اور ہر حال سچ بات کہہ گزرتے تھے، خواہ اس کے لیے اُنھیں کتنی بڑی سے بڑی قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑتی۔ اظہارِ حق سے وُہ کبھی نہ جھجکے۔ اس میں انہوں نے دوست، دشمن کوئی اور کسی طرح کا امتیاز رَوا نہ رکھا۔ مولانا محمّد علی کی سیرت اور کردار اور شخصیت کا حقیقت آفرین اور جرأت مندانہ محاکمہ مولوی صاحب نے کیا اور ۱۹۳۲ء میں اس وقت کہ جب مولانا محمد علی کی "خانہ زاد"، موت نے اُنھیں ہند کے مسلمانوں میں بہت برگزیدہ ! محترم اور متبرک بنا دیا تھا، مولوی عبدالحق کی بے باکی جرأت صلابتِ مواخذہ اور متوازن سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔ وُہ لکھتے ہیں:

"ہندوستانِ جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمّد علی مرحوم "عجیب وغریب" شخص ہوئے ہیں۔ وہ، مختلف، متضاد اور غیر معمولی اَوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کُچھ زیادہ مُبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے . . . . وُہ آزادی کا دل دادہ جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا، لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وُہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مُروت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اِس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ

---

[1] چند ہم عصر، ص ۳۸۲ و بہ بعد

جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اِس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے........ وُہ جب کسی کام کو اُٹھاتا تو بڑی شان و شکوہ سے اُٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اُس کی طبیعت میں نہ تھا ..... محمّد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اُس کے رُفقا اور اس کے ہم عصر اُس کے سامنے بَونے تھے مگر افسوس اُسے اپنے اُوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی [۱]"

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کا ایک اور اہم اور ممتاز پہلو یہ ہے کہ وُہ کبھی زیرِ تحریر شخص کے مدّ مقابل یا فریق کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ سیرت نگار کے طور پر انہیں ہمیشہ اَپنے منصب کی ذمّہ داریوں اور نزاکتوں کا خیال رہتا ہے وُہ اس فن کو برتنا خوب جانتے ہیں۔ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی نے ٹھیک کہا ہے کہ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں جس طرح حالات لکھے ہیں وُہ :

"نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے اوصاف پر مخالف، موافق رائے کس طرح ظاہر کی جائے [۲]"

مولوی عبدالحق نقائص اور عیوب پر استہزا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے محاکمے کو "وعظ" بناتے ہیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر اُن کا لب و لہجہ بطورِ خاص زیادہ ہی ہمدردانہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہو جاتا ہے اور اس وصف نے، جو انسانیت پر گہرے یقین کا نتیجہ ہے، اُن کی سیرت نگاری میں انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ مولانا محمد علی کی سیرت کے سخت محاکمے کے بعد وُہ طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلاتے بلکہ عام فکر اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں :

"محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وُہ اپنے کاموں کے لیے گھر بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کر سکتے تھے۔ لیکن وُہ اِس بےدردی، بےپروائی اور غیر ذمّہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے۔ ہم میں (خاص کر

---

[۱] چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۲ و بعد [۲] مقدمہ، مُقدّماتِ عبدالحق

یو۔پی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں) اب تک زمیندار کی شان قائم ہے
جو بادشاہی شان کی نقل ہے۔ ہم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل
نہیں جانتے۔ ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ لوٹنا اور لٹانا! ......
محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو
پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی
بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج
جس شئے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے
قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں نا تربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور
ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔
جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں، اس کے لیے پختہ سیرت اور اعتدال
طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے[1]"

"چند ہم عصر" کی اہمیت اسی قدر نہیں کہ اردو ادبیاتِ عالیہ میں سیرت نگاری کے لیے
اسے نشانِ راہ کا درجہ حاصل ہے بلکہ اس کی اہمیت بہت کچھ یوں بڑھ جاتی ہے کہ
مولوی عبدالحق نے سیرت نگاری کے لیے جن بنیادوں پر کچھ یادگارِ زمانہ شخصیتوں کا چناؤ
کیا، اُن کی جن خوبیوں کو سراہا اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے، اس
سے نیک و بد کے بارے میں خود مولوی عبدالحق کے اپنے معیار، معتقدات و اولیات
مرکزی اقدارِ حیات اور اُن کے بنیادی انسانی زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی
مدد ملتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔"

خوش معاملگی، مہر و وفا، ہمدردی، مروت، بے نفسی بے ریائی، رواداری، سیرچشمی
اور عالی ظرفی کو مولوی عبدالحق انسانیت کا جوہر تصور کرتے ہیں۔ سچائی، اصول پرستی،
وضع داری، آن بان اور خودداری کو طرۂ اشراف جانتے ہیں۔ اخلاق کو انسان کی فضیلت

---

[1] چند ہم عصر، ص ۱۵۲ و بہ بعد

اور برتری کی اساس ٹھہراتے ہیں۔ انسانیت ان کے نزدیک ایثار سے عبارت ہے۔ وہ کمال کو شوق اور محنت اور بے تعصبی کے وصف کو طبیعت کی انصاف پسندی کا خانہ زار تصور کرتے ہیں۔ خود ہمتی کو بڑے پن کی علامت ٹھہراتے ہیں اور جلب زر کو عارضہ خیال کرتے ہیں اور ہم عصروں اور چشموں کی رقابت کو عیب اور خوشامد پسندی کو انسانی ضعف سے تعبیر کرتے ہیں۔

قومی اتحاد اور یگانگت کے لیے لباس کی یک رنگی کو مولوی عبدالحق ضروری سمجھتے ہیں لیکن مذہب اُن کے نزدیک ذوقی چیز ہے جسے علم وفضل سے کو واسطہ نہیں صحیح ذوق کو وہ زندگی کی جان تصور کرتے ہیں اور اس کے بغیر علم وفضل کو بے نتیجہ اور بے ثمر گردانتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد اُن کے نزدیک فکر کو جلا بخشنا ہے اور ایسی تعلیم کو جو صحت کے ساتھ واقعات پر نظر ڈالنے کی اہلیت پیدا نہ کرے، وہ بے معنی خیال کرتے ہیں۔ زندہ دلی کو وہ سلامتِ طبع اور جائیت کی نشانی اور ظرافت کو دلیلِ ذہانت متصور کرتے ہیں اور روشن زندگی میں حسن کاری کے لیے اُن کے نزدیک قدیم وضع اور جدید تہذیب کا امتزاج ضروری ہے۔

سادہ زبان لکھنے کو وہ آسان نہیں سمجھتے اور سلامت کے ساتھ ساتھ لطفِ بیان اور اثر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتاب ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور اور دستگاہ ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد اُن کے نزدیک یہ ہے کہ لوگ اُسے پڑھیں اور اثر قبول کریں اور جو یہ خوبیاں مفقود ہوں تو ایسی تحریر کو وہ بیکار محض اور تضیع اوقات کا باعث قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی تحریر یا ادب کی حیثیت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ ضبط اور اعتدال اور لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال اُن کے نزدیک ادیب اور ادب کا بڑا کمال ہے۔

کام اُن کے نزدیک اسی وقت کام رہتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام کو وہ بیگار کہتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ یہ کام اور کردار ہی ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتا ہے اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے ہی میں ان کے نزدیک

ساری بڑائی اور نیکی ہے اور نیکی کو وُہ اُسی وقت تک نیکی خیال کرتے ہیں جب تک کہ آدمی کو اس کا احساس نہ ہو۔ چند تراشوں سے مولوی عبُدالحق کے اعتقادات و الیقان، اُن کے بنیادی انسانی زاویۂ نگاہ اور اَدبی و فنی نقطۂ نظر کے سمجھنے میں سہولت ہو گی!

اُشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھولتا ہے وُہ اُتنا ہی سکڑتا ہے"

(گدڑی کا لال نور، ۱۲۵)

"وُہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وُہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں..... اُن کی زندگی بے لوث تھی اور..... (اس کا) ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا...... قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے"

(گدڑی کا لال نور خاں، ۱۲۸-۱۲۷)

اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں، وُہ اِنھیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

(مولانا وحید الدین سلیم، ۱۲۳)

"ایک بات ان کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے غدر کے ہنگامے میں ان کے استاد لاپتہ ہو گئے یا مارے گئے تھے۔ اُنھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی تھیں جو بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ میرن صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو ڈھونڈ کر اپنے گھر لے آئے اور اپنی بیٹیوں کی طرح اُنھیں پالا پوسا اور ایسی محبت و شفقت کی کہ وُہ باپ کو بھول گئیں...... حق شاگردی شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو یہ وضعداری، یہ محبت و شفقت اور ایثار، اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر دوسری

کی خدمت کرنا ہی جوہرِ انسانیت ہے۔

(میرن صاحب صفحہ ۲۲۳ و بہ بعد)

"تعصب اُن میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔"

(حالی، صفحہ ۱۶۳ و بہ بعد)

"ہم عصروں اور چشموں کی رقابت پُرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے..... مولانا اِس عیب سے بَری معلوم ہوتے ہیں۔"

(حالی، ۱۶۷)

"قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب کا ایک ہونا۔"

(سرسید احمد خاں، ۲۵۸)

"اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے، وُہ خود کبھی نہیں پڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(مولوی چراغ علی، ۱۲)

"بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت اور ہمدردی اُن کی گھٹی میں تھی......... وُہ بہت بے نفس شخص تھے۔ جلبِ زر کا عارضہ جو آج کل نئی تانتی میں عام طور پر پایا جاتا ہے، اُن میں بالکل نہ تھا۔"

(ڈاکٹر محمد اقبال، صفحہ ۲۵۷، ۲۵۹)

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ وَرگذر کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے ان کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا۔ اِس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ اَخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو

وہ اَیسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔"

(حالی، ۱۸۴)

"باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے۔ اِسے علم سے کوئی واسطہ نہیں۔"

(مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، ۱۱۹)

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۲۵۵)

"صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال وزر سے اور نہ محنت سے۔ یہ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اِس سے زندگی کے ہر شغل وشعبہ میں ایک نرم اور شہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اَوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔"

(نواب عماد الملک، ۲۴۳)

"سیّد محمود معمولی سے معمولی بات میں وُہ شان پیدا کر دیتے تھے، جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے لیے مُفید نہیں ہو سکتی۔"

(سیّد محمود، ۵)

"ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامتِ طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارِ گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی مُعین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن مرحلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔"

(سر سیّد احمد خاں، ۲۴۶)

"سادگی و پرکاری کمالِ صنّاعی ہے۔ اِس میں اَدب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ آسان اَلفاظ جمع کر دیے جائیں ایسی

تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لُطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ اُس وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اِسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے، جسے اپنے فن یا علم پر کمال عبور ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیال کو صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اِس کا اثر قبول کریں اور لُطف اُٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار تضیعِ اوقات ہے۔"

(سر سید احمد خاں، ۲۸۶ و بعد)

"لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے دلوں میں گھر کر لیتے کے جو گُر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے"۔

(حالی، ۱۶۸)

"کسی تحریر یا ادب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے"

(چند ہم عصر، ص ۲۸۳)

"ضبط اور اعتدال اُن کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں اُن کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آ کر آدمی سر رشتہ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے"

(حالی ۱۴۷)

"اِنسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے"

(مولوی چراغ، ۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے سے ہی انسان بنتا ہے اور اسی سے اُس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اُس کے دماغی اور اخلاقی قوار کی جلا ہوتی ہے اِس مُراد وہ کام ہے، جس کے کرنے میں انسان کو لذّت ملے اور شوق اُسے اور اُبھارے ورنہ کام کام نہیں رہتا، بیگار ہوجاتی ہے۔"

(سَر سیّد احمد خاں، ۲۲۶)

"نیکی اُس وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وُہ کوئی نیک کام کررہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی .... ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں پہنچنے کی کوشش میں ہی انسان، انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کُندن ہوجاتا ہے ــــ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پُوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وُہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وُہ تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اِس سے کیا فائدہ پہنچایا۔"

(نام دیو مالی، صفحہ ۲۳۱ و بہ بعد)

"چند ہم عصر" کے اِن متفرق اقتباسات ــــ سے صرف مولوی عبدالحق کے معتقدات ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ شہ پارے واغ واغ اُن کے اعلٰے درجہ کے مُفکّر ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ وُہ دراصل بنیادی طور پر مُفکّر ہی تھے۔ لیکن زبان واَدب کے پھیلاؤ اور بچاؤ کے سلسلے میں اُن کے طول طویل مجاہدے نے اُن کے اِس وصف کو ثانوی حیثیت دے دی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زبان واَدب اور شعر وفن کا مسئلہ ہو یا زندگی اور کائنات کا کوئی معاملہ فکر وعقل کا دامن کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جاتا۔

اُقوام وعلل اور خاص طور پر مسلمانوں عروج وزوال کے اسباب وعلل پہ مولوی عبدالحق کی گہری نظر ہے اور تاریخی وتمدّنی بصیرت وشعور اُیسا پایا ہے کہ کم ہی کسی میں

ہوگا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی عقلیت پسندی حقیقت پرستی، متوازن مزاجی اصابتِ رائے اور منطقی استدلال و قوت کے سہارے ایسے گراں قدر نتائج اخذ کیے ہیں، جو صحت و توانائی کی دولت سے مالامال ہیں:

"کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلےٰ قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی، تو اس کی ترقی شاہ راہِ تمدن پہ بہت سُست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اُس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلےٰ ترقی کی ہو۔"

(مولوی چراغ علی، ۲۱)

"ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اِس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا، اِس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے"

(چند ہم عصر، ۳۸۲)

"مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور ہل چل مچانا نہ پہلے آتا تھا، نہ اب آتا ہے۔ اِس لیے ہمیشہ خسارے میں رہے۔"

(سرسیّد احمد خاں، ۳۱۲)

"زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وُہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے وُہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اُٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں"

(سرسیّد راس مسعود، ۱۹۷)

"چند ہم عصر" کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کا یہ انتخاب اور چیدہ و محض سیرت کشی کی "خانہ پُری" ہی کے لیے نہیں تھا، وُہ زندگی میں ان سے کہیں نہ کہیں متاثر ضرور ہوئے۔ متاثر محض اِن معنوں میں ہی نہیں کہ اِن شخصیتوں کو اُنہوں نے اپنے تئیں

آدمیت و انسانیت کی مکمل اکائی اور عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً اُنہوں نے ایسا سمجھا اور قدرتاً شعوری یا غیر شعوری طور پہ ان کی پیروی بھی کی، لیکن اِس سے قطع نظر اس انتخاب اور چناؤ کے پس پشت بہت کچھ ان شخصیتوں سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رُجحان و میلان اور گذرانِ حیات کے ضابطوں اور اصولوں میں ایک گونہ اشتراک کو دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگار خانے میں ہمیں قدم قدم پہ مولوی عبدالحق کی طبیعت کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جگہ جگہ اُن کی اپنی پرچھائیاں اور جھلکیاں ملتی ہیں اور اُن نے آئینہ خانۂ فن کے عرض میں ان کی اپنی شخصیت کا جوہر تڑپتا نظر آتا ہے ___ اور یہ "چند ہم عصر" کا بہت ہی نادر پہلو ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے یہاں ان سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔[1]

شخصیتوں کو آڑ میں اُن کا جذبۂ بے اختیارِ شوق دیدنی ہوتا ہے اور ان پر "عشق پیشہ" میر کے لیے "آفتِ زماں" کا گماں ہونے لگتا ہے، جو اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرے ہے۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا تھا، غالب کے شاگرد معنوی عبدالحق کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی اُفتاد پیش آئی ۔ اُن کے دل کا معاملہ شخصیتوں کے انتخاب کے ہاتھوں کھل گیا لیکن یہ جگ ہنسائی اور رسوائی والا مضمون نہیں، جو شخص کوئی زبان بولتا اور لکھتا ہے اُس میں وُہ کچھ نہ کچھ اپنی زندگی کے نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ قدر اور قامت کے لحاظ سے جو جتنا بڑا ہوگا، اُتنا ہی اُس کی تحریر میں زندگی کا رچاؤ زیادہ ہوگا۔ زبان کو بولنے اور لکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں ہوتے ہیں، لیکن چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو زبان و ادب پر اس قدر اثر انداز ہوں اور اتنے جذب سے لکھنے پر قادر ہو سکیں کہ تحریر میں اُن کی زندگی ہنستی بولتی، سانس لیتی دکھائی دینے لگے۔ میر، غالب اور عبدالحق ان ہی معدودے چند لوگوں میں سے ہیں۔ عبدالحق کی تحریروں سے اُن کے دل کے معاملے کا کھلنا اُن کی عظمت کا مظہر ہے۔

مولوی عبدالحق سادگی و پرُکاری پر ایمان رکھتے ہیں اور آراستہ بیانی کو ضعفِ اُدبیت کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ ان کے انداز میں تراش ہے نہ بانکپن اور نہ ایسی چکا چوند ہی جو ایک تاثیے کو روشنی دکھا کر اندھیاروں کو اور گہرا کردے بینائی کو، بصارت کو مفلوج کردے۔

[1] اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کا مضمون "ذکرِ عبدالحق"، مطبوعہ "نقوش"، لاہور، شمارہ ۱۲، صفحہ ۹۹ تا ۱۰۸

مہر و مرحمت مولوی عبدالحق کے مزاج و کردار کا جزوِ اعظم ہے۔ اُن کا اسلوب بھی انہیں اوصاف صفات کا مظہر ہے۔ صدیوں کے مٹھاس سے مملو اُن کا مشفقانہ، شگفتہ رَواں، دھیمہ اور ہمدردانہ لب و لہجہ ذہن کو شفاف، ہلکی سُہانی، یکساں اور مستقل روشنی کی دولت عطا کرتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے کہیں "چند ہم عصر" کے کسی خاکے کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے پڑھ کر ہمیں اپنے ماحول میں روشنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ٹھیک کہا ہے[1] کہ اس میں ممدوح کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی دل کشی کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کے اندازِ نگارش کو بھی برابر کا دخل ہے ——— مولوی عبدالحق کی تحریر میں مزاح کا عنصر شامل رہتا ہے، لیکن اُن کی مُسکراہٹ، وقار اور سنجیدگی سے خالی نہیں ہوتی وُہ اس لیے ہنستے ہیں کہ ہنسنا "شئے لطیف" کا تقاضا بھی ہے اور ایک کثیر الاشغالی شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ بھی۔ لیکن بہتوں کی طرح محض ہنسانے اور ہنسنے کا کاروبار اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔ "چند ہم عصر" میں مولوی عبدالحق کے مزاج کی عام اور تیز جھلکیاں نہیں ملتیں۔ بایں ہمہ جہاں تہاں خاکوں میں ظرافت اور زندہ دلی اس طرح موجود ہے، جیسے بادلوں سے چاندنی چھن رہی ہو۔ پُر وقار اور اجیالے سے تبسّم کی جھلک اُن کی تحریر میں بڑی شیرینی پیدا کر دیتی ہے[2]۔

"چند ہم عصر" کے خاکوں میں سے کچھ تقریریں ہیں، بعض اصحاب کے حالات مولوی عبدالحق کے مکاتیب یا دوسری تحریروں سے اقتباس کرکے کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تحریریں خاکہ نگاری کے فن پر پوری نہیں اُترتیں انہیں فن کے مقررہ آداب و معائر پر جانچنا ہے بھی زیادتی۔ اِس لیے کہ ان کا مقصود بالذّات سیرت کشی نہیں تھا۔ یہ تحریریں خاکوں کے بطور لکھی ہی نہیں گئیں یہ خاکے نامکمل ضرور ہیں، لیکن خاکہ نگاری کی سب خوبیوں سے خالی نہیں۔ حکیم امتیاز الدّین اور شیخ غلام قادر گرامی کے خاکے ایسے ہی ہیں۔ انہیں "سیر حاصل" تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن ان میں شخصیت کے کلیدی پہلوؤں کی طرف ایسے ضروری اشارے

---

[1] و [2] نقوش شمارہ مئی ۱۹۵۹ء صفحہ ۸۲، ۸۳ (علی الترتیب)

جن کی بنیاد پر بھرپور خاکے لکھے جا سکتے ہیں۔

چند ہم عصرؒ کی وہ سیریں جو خاص طور پر لکھی گئی ہیں، ہیئت و مواد دونوں کے اعتبار سے بڑی قابلِ قدر ہیں۔ ربطِ خاطر نے انہیں لکھوایا ہے، کاوش، توجّہ اور سلیقے نے انہیں وقیع بنایا ہے۔ اِن میں سیرت پر محاکمہ بھی ہے اور عقیدت و محبت کا خراج بھی لیکن ہے یہ سب کچھ ایک خوش گوار امتزاج، توازن اور اختصار کے ساتھ۔ اُن کے ایک ایک جملے سے خلوص، محبت اور صداقت کا اظہار ہوتا ہے اور اُن کے "ممدوح" ہمارے سامنے ہنستے بولتے چلتے پھرتے اپنی واقعی شکل و صورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور یہ سیرت نگاری کا بہت بڑا کمال ہے۔ نور خاں، نام دیو، میرن صاحب، سرسیّد، حالی، چراغ علی، سیّد علی بلگرامی، عماد الملک محسن الملک اور راس مسعود کا شمار ایسے ہی خاکوں میں ہے۔" یہ عبدالحق کے شاہکار اور اُردو ادب کے جواہر آبدار ہیں، اِن کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی "

بابائے اُردو - ایک کرشمہ ساز شخصیت

"اس برس اس شہر (لاہور) کے یوموں میں ایک نئے یوم کا اضافہ ہوا۔ یہ یوم مولوی عبدالحق کا تھا۔ اب تک مولوی عبدالحق کی برسی منانے کی ساری ذمہ داری کراچی کے سر تھی۔ اس برس لاہور نے پاکستان کونسل کی معرفت اس بوجھ کو بٹایا۔ پاکستان کونسل میں پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ معین الرحمن نے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، اور حامد علی خاں صاحب نے تقریریں کیں۔"

[انتظار حسین، لاہور نامہ، مشرق لاہور ۳۰۔ اگست ۱۹۷۱ء]

☆

(بابائے اُردو کی دسویں برسی کے موقع پر ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کی سہ پہر پاکستان کونسل کے لاہور مرکز نے "بابائے اُردو کی یاد میں" ایک تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت پروفیسر حمید احمد خاں نے فرمائی۔ ذیل کا مضمون اسی تقریب میں پیش کیا گیا۔)

O

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں "بابائے اُردو کی خدمات" کے موضوع پر کچھ عرض کروں ..... یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے، بقول شخصے:

"اُردو کی پوری تاریخ میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے اتنی دشواریوں کے باوجود، اتنی، اتنی طویل مدت تک، ہر دوسرے تعلق سے منہ موڑ کر، اِس خلوص، قابلیت، اور پامردی سے اُردو کی اِتنی گراں قدر اور مختلف النوع خدمات انجام دی ہوں جتنی کہ مولوی عبدالحق نے ——— اِن خدمات کا گِنانا بھی آسان نہیں ہے ....."

کسی اور موقع پر میں لکھ چکا ہوں کہ مولوی عبدالحق نے اَپنے تئیں طویل لیکن اپنے مداحوں کی آواز سے کم تر عمر پائی۔ اُن کی "طویل" زندگی کا کوئی لمحہ بے مصرف نہیں گزرا۔ ان کی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع اور نتائج کے اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ انہوں نے اُردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قدر اور قامت، ہر اعتبار سے قابلِ ستائش اضافہ کیا۔

زندگی بھر وُہ برابر زبان کی اشاعت و مدافعت کے لیے معرکہ آرا رہنے اور جہاں کہیں اس پر آنچ آتی دیکھی، وہ ایک ذمّہ دار وکیل اور جانباز محافظ کی طرح، اُس محاذ پر سینہ سپر ہو گئے۔ ہر جگہ دلوں کو گرمایا، حوصلوں کو بڑھایا اور زبان کی موقر وکالت اور موثر حفاظت کی۔

عبدالحق، بلامبالغہ کشمیر سے لے کر راس کُماری تک اُردو کا مُقدّمہ لڑتے پھرے۔ اس کا سفیر بن کر دور دور اس کا پیغام پہنچایا، خطابت کے سہارے اسے دلوں میں اُتارا اور اِنشاپردازی کے بل پر، اس پیغام کو ذہنوں میں جمایا۔ زبان کی بُنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اصول و قواعد، صرف و نحو، کتبِ حوالہ اور لُغات کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی۔ قدیم اَدبی تذکروں اور نادر و معدوم مخطوطوں کو گم نامی سے نکال کر، اصحابِ علم کو ان سے روشناس کرایا۔ اپنے عہد کے جیّد ہم عصروں کے حالات لکھ کر، اُن کی سیرتوں کو آنے والی نسلوں کے لیے زندہ و تابندہ کیا اور تحقیق و تنقید کی راہوں پر نت نئے چراغ روشن کیے۔

مَولانا غُلام رسول مہر نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

"بابائے اُردو کا اسمِ گرامی زبان پر آتے ہی ایک ایسی شخصیت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ زبان اور علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دیا اور اِس سلسلے میں بھی وُہ پہلو، بطورِ خاص پیشِ نظر رکھے جنھیں ملک و ملّت کی تعمیر اور قومی ثقافت کی تزئین و تحسین میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کے کارنامے اِس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و اَدب اور زبان کے دائرے میں، اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

مولوی عبدالحق متفقہ طور پر عظیم شخصیت کے مالک تھے اور "بڑی شخصیت کی مشکل یہ ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جا سکتا"، بابائے اُردو کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون یا ایک نشست میں بیان نہیں ہو سکتے۔

مَیں یہاں اختصار کے ساتھ مولوی عبدالحق کے مقصدِ حیات کے بارے میں، جو

اُن کی طویل زندگی کے ہر دور میں ایک ہی رہا۔ سلسلہ وار چند حقائق آپ کے سامنے رکھوں گا، اس مقصدِ حیات ہی کے حوالے سے اُن کی خدمات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

○

۸۹ - ۱۸۸۸ء

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مَیں جب اوّل روز مدرسۃ العلوم مسلمانان ایم۔ اے۔ او۔ کالج، علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہوا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دُنیا میں آ گیا ہوں۔" یہ ۸۹ - ۱۸۸۸ء کی بات ہے۔ لکھنے پڑھنے کی یہی نئی دُنیا بعد میں مولوی صاحب کی اپنی دنیا ہو گئی۔ شیخ چاند مرحوم کی روایت کے مطابق ۱۸۹۰ء میں مولوی عبدالحق علی گڑھ سے طالب علمی کے زمانے میں اورنگ آباد، پن چکی کے کُتب خانے کی تلاش میں گئے۔ اُس زمانے میں اورنگ آباد تک ریل جاری نہ ہوئی تھی۔ اِس لیے اُنہیں احمد نگر کے راستے سے اورنگ آباد پہنچنا پڑا۔ لیکن افسوس کہ اس سے قبل وُہ مشہور کتب خانہ لٹ چکا تھا، کئی زبان کی چند کتابوں کے سوا، مولوی صاحب کو دیکھنے کے لیے کچھ نہ ملا۔ اِس طویل مسافت کا انجام حوصلہ شکن نظر آتا ہے لیکن اِس سے مولوی صاحب کو طلب اور لگن میں کمی نہ آئی بلکہ زبان کو ترّقی دینے کی دُھن ایسی لگی یا سَوار ہوئی کہ سَر سیّد کی بزم سے اُٹھتے تو گیسوئے اُردو کے سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

○

۱۸۹۳ء

اُردو سے مَولوی عبدُالحق کی دلچسپی وقتی یا اتفاقی نہیں تھی۔ اِس کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں ان کے خیالات، مُدّۃ العُمر کے غور و فکر اور شغف کا نتیجہ تھے۔ اُردو کو ترّقی اور وسعت دینے اور زیادہ عام اور مقبول بنانے کے عزائم اور منصوبے طالب علمی ہی کے زمانے سے اُن کے پیشِ نظر تھے۔ یہ ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے، اس زمانے میں اَبھی وُہ بی۔ اے میں تھے کہ اُنہوں نے سَر سیّد کے "تہذیبُ الاخلاق" کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں، ہندوستان کے اس مشہور انقلاب انگیز رسالے کو بڑی آزادی

سے یہ بتایا کہ اُس کے فرائض کیا ہیں، ان میں ایک ضروری اور ناگزیر فرض "اُردو زبان کو ترقی دُنیا"، بھی تھا۔"

○

۱۹۰۱ء

مواقع، قسمت سے بہتوں کو ملتے ہیں لیکن بات دراصل اُن سے بروقت فائدہ اُٹھانے کی ہوتی ہے۔ یہ بس ایک "لمحہ" ہوتا ہے جسے "شبھ گھڑی" کہہ لیجئے، جس نے اسے جان لیا، پہچان لیا اور جُرأت سے کام لے کر اس لمحے کو گرفت میں لے آیا اور اس سے فائدہ اُٹھالیا، وُہ تر گیا، اَمر ہو گیا۔ مولوی عبدالحق کو حیدرآباد دکن میں اِس طرح کا جو پہلا بہترین موقع میسّر آیا، اور جس سے اُنہوں نے فی الواقعی فائدہ اُٹھایا، اہلِ نظر اُس سے بالعموم بے خبر ہیں، چالیس پنتالیس سال ہوتے ہیں کہ شیخ چاند مرحوم نے اِس کی نشاندہی کی تھی، اس "نشاندہی"، پر بھی اب وقت کی دبیز تہہ پڑ چکی۔ یہ اُنیسویں صدی کے بالکل آخیر کی بات ہے نواب عماد الملک، اُس زمانے میں حیدرآباد دکن میں ناظم تعلیمات اور ولی عہدِ وقت نواب میر عثمان علی خاں کے اتالیق تھے۔ اُن کی تعلیم و تدریس کے لیے عماد الملک نے مولوی عبدالحق سے اُردو خطوط نویسی پر رسالے لکھنے کی فرمائش کی: یہی وُہ لمحہ تھا جس سے مولوی عبدالحق نے ایسا فائدہ اُٹھایا، جس کی داد دینے کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔

۱۹۰۰ء میں مولوی عبدالحق، اُردو خطوط نویسی پر دو رسالے لکھتے ہیں۔ دوسرے رسالے میں ایک خط، باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہے بیٹے کے نام باپ کا یہ خط، جس پیغام پر مشتمل ہے وُہ دور رس معنویت کا حامل ہے:

"جان پدر! ۔ چونکہ اِس خط میں تمہاری تعلیم کا تذکرہ آگیا ہے، مَیں اس موقع پر ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اس میں شک نہیں، تم قریب قریب تمام مضامین میں اَچھے ہو اور ان میں دلچسپی بھی ہے، لیکن میں ایک بڑی کمی دیکھتا ہوں جس کا ظاہر کر دینا میرا فرض ہے، وُہ یہ ہے کہ تمام اُردو، یعنی اپنی مادری زبان کی طرف بہت کم توجّہ کرتے ہو۔ اِس سے زیادہ

افسوس کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہم دوسری زبان کے حاصل کرنے میں تو ہمہ تن مصروف رہیں لیکن اپنی مادری زبان کی طرف بالکل توجّہ نہ کریں ۔ علاوہ مادری زبان کے ہمیں اب تک زیادہ تر کام اِسی زبان سے پڑتا ہے ۔ آپس میں خط وکتابت اور عدالت کی کاروائی اُردو ہی میں ہوتی ہے ۔ اس میں علمی ذخیرہ بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے ۔میرے خیال میں اس کی طرف سے بے توجہی کرنا سراسر غلطی ہے اور اس میں نقص رہ جانے سے بعد میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ “ باپ کے اِس پیغام سے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے ایک نیا عالم کھل جاتا اور وہ نہایت جوش اور خلوص سے لبیک کہتا ہے :

”آداب ! آپ کا عنایت نامہ پہنچا ۔ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے، وُہ بالکل صحیح ہے حقیقت میں افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف بہت کم توجّہ کرتے ہیں ہمارے ایک اُستاد یہی کہا کرتے ہیں ، مگر ہے یہ کہ متعدد مضامین تیار کرنے کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی ہے کہ ان چیزوں کی طرف بھی توجّہ کی جائے ، جو ہمارے امتحان میں نہیں ہیں لیکن آج سے میں نے ارادے کرلیا ہے کہ فرصت کا تمام وقت اُردو کے سیکھنے میں صرف کروں ۔“

مُلاحظہ کیجیے : کس طرح مولوی عبدالحق نے نواب عماد الملک کی فرمائش سے فائدہ اُٹھایا اور کِس طرح ایک ادائے خاص سے ہونے والے بیدار مغز تاجدار کے دل میں ابتدا ہی سے اُردو کی محبت کا بیج بونے کی کوشش کی جو آگے چل کر ایک تناور، عظیم الشان اور بار آور شجر کی شکل میں نمودار ہونے والا تھا ۔ یہی وُہ ہلکی سی جنبش تھی جس پر ایک مستحکم ، ذی وقعت اور بے عدیل تعمیر چُنی جانے والی تھی ۔ ۔،،

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ حیدرآباد دکن کے تعلیمی انقلاب میں مولانا عبدالحق کا کیا کردار رہا ہے ۔ حق یہ ہے کہ یہ انقلاب ، مولوی عبدالحق کی جانفشانیوں اور دُور اندیشیوں کا نتیجہ ہے ، وُہ عرصے تک اِس کے اسباب پیدا کرتے رہے اور حیدرآباد دکن کا یہ تعلیمی انقلاب اپنے اثراتِ مابعد کے اعتبار سے ملک گیر اہمیت کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔

○

۱۷ - ۱۹۰۷ء

"جب تک ہر علم و فن کی ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم اُردو زبان میں نہیں دی جائے گی، صحیح اور وسیع مفہوم میں قوم ترقی نہیں کر سکے گی۔"

مولوی عبدالحق کا یہ بیان، ۱۹۰۷ء کا ہے، اِس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے، لیکن اُس وقت، اِس خیال کے عمل میں لانے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن نیت بخیر اور صادق ہو تو ہر بھلے خیال کے رُو بہ عمل آنے کی کوئی نہ کوئی صورت کبھی نہ کبھی نکل ہی آتی ہے . . . لیکن یہ صورت از خود ہی نہیں نکل آتی۔ ضرورت، مُنا سب اور صحیح وقت پر صحیح قدم اُٹھانے اور صحیح خطوط پر آغازِ کار کی ہوتی ہے۔

دس برس بعد آخر اس کا بھی وقت آیا اور مولوی صاحب نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، (اسی میں اُن کی جیت ہے): سر اکبر حیدری نظام دکن سرکار میں ہوم سیکرٹری کے منصب پر فائز ہوئے، اَب مولوی عبدالحق کو موقع ملا اور اُنہوں نے حیدر آباد میں اُردو ذریعۂ تعلیم پر عامل ایک یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت اور ضرورت کے موضوع پر موثر وکالت سے سَر اکبر حیدری کو اپنا ہم خیال بنایا۔ ابتدائی مراحل کے سَرانجام میں کچھ وقت لگا، اِس عرصے میں پس پردہ مولوی عبدالحق نے "اسپیشل ڈیوٹی" کے طور پر نہایت حزم و احتیاط، خاموشی، دُور اندیشی اور قابلیت سے یونیورسٹی کی مکمل اسکیم مرتب کی۔ اربابِ اقتدار نے اس کو بغور جانچا اور پسند کیا۔ بالآخر وہ اسکیم بارگاہِ نظام میں پیش کر دی گئی اور وہاں سے اُسے منظوری کا شرف بخشا گیا۔ اُردو، ذریعۂ تعلیم قرار پائی اور حیدر آباد میں یونیورسٹی قائم ہو گئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا خاکہ، منصوبہ اور کامل اسکیم مولوی عبدالحق کے ذہنِ رسا کا نتیجہ ہے۔ آج یہ بات سب کو معلوم ہے لیکن اس کی جانب اَوّل اَوّل ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے خویش پروفیسر الیاس مجیبی نے اشارہ کیا۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں کہ: مولوی عبدالحق نے پس پردہ وہ وہ شاندار کام کیے جن کی عموماً لوگوں کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہر زمانہ کی ایک عمر

ہوتی ہے، اُس کے بعد راز کو راز رکھنا چنداں ضروری نہیں۔ کتنوں کو اس راز کی ہوا بھی لگی ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی اسکیم مولوی عبدالحق صاحب ہی کی بنائی ہوئی ہے اور انہیں کے ایما سے ریاست حیدر آباد کی کونسل میں داداحیدری کی طرف سے پیش ہو کر پاس ہوئی۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں "یادوں کی دُنیا" میں لکھتے ہیں کہ : "مَیں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصلی بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں۔ مولوی عبدالحق نے جو سرِ اکبر حیدری کے مزاج میں دخیل تھے، اُردو زبان کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز اُن کے روبرو پیش کی حیدرنواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خاں نظام ریاست حیدر آباد نے اِس تجویز کو شرف قبولیت بخشا"، یونیورسٹی کے قیام سے پہلے اُردو میں اعلیٰ معیار کی علمی کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی غرض سے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک "سررشتہ تعلیم و ترجمہ" کا قیام عمل میں آیا جو عام طور پر دارالترجمہ کے نام سے مشہور ہے۔ مولوی عبدالحق اِس اہتمامی کام کے سربراہ بنائے گئے۔ اور مشنری انداز میں وضع اصطلاحات اور ترجموں کے کام کا آغاز ہوا۔ یہاں تک کہ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو اُس عمارت میں عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا جہاں آج کل اسٹیٹ بینک آف حیدر آباد ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خط میں جس کا حوالہ حال ہی میں سامنے آیا ہے، خود بتایا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتدا کیسے ہوئی۔

"ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے اور مَیں نے اُن کی صدارت میں ایک تقریر مُروّجہ تعلیم اور طریقِ تعلیم پر کی اور اُس سے وُہ بہت متاثر ہوئے۔ اِس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انہوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی۔ وہ (کالج کے رسالے) "نورس" میں چھپی تھی نیز حیدری صاحب تو آمادہ ہو گئے، وُہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے، البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وُہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ المالطیفی (ڈائرکٹر تعلیمات) کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلافِ مصلحت تھا، وُہ اِس کے مخالف تھے۔ اس

زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمید الدین مرحوم تھے۔ اُنہوں نے میرے متواتر
اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ مَیں نے اُنہیں ہم خیال بنا لیا اور ان سے کہا کہ
آپ بحیثیت پرنسپل دارالعلوم یہ تحریک کیجئے۔ اُنہوں نے کہا "مَیں دستخط
کر دوں گا"۔ میں نے ہوم سیکرٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست
پیش کر دی۔ ہوم سیکرٹری اُس وقت سَر اکبر حیدری تھے۔ اَب بموجب
انگریزی محاورے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی۔ مجھے اورنگ آباد سے اسپشل
ڈیوٹی پر بُلایا گیا۔ کام دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرضداشت جو اعلیٰحضرۃ
کی بارگاہ میں منظوری کے لیے پیش کی گئی تھی، وُہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔"
پروفیسر مجیب نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: "مولوی صاحب کچھ نہ کرتے، نہ ایک حرف
لکھتے، بس یہی ایک کام ایسا تھا اُن کا، جو بڑے بڑے دن کے بڑے بڑے تصنیفی کاموں پر
بھاری ہے۔"

○

۱۹۲۰ء

ہندوستان میں پہلی جنگ کے دوران میں ہوم رول کی تحریک، پڑھے لکھے طبقے
میں ہلچل اور تموّج کا باعث ہو چکی تھی اور غور و فکر کی بہت سی راہیں اُن کے سامنے عقدہ کشا
ہونے لگی تھیں، جلیاں والا باغ کے قتلِ عام نے کیا خواص اور کیا عوام، مُلک بھر میں ایک
سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آزادی کا غلغلہ بلند کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پر
انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اُس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ہندوستان
کے درد مند مُسلم زعماء اور عوام سب میں انگریزی سامراج کے خلاف یکساں نفرت کا شدید
جذبہ اُبھر آیا، خلافت کی تحریک نے مُلک گیر قبولیت حاصل کی۔ اِس تحریک کے سَرکردہ اور
سَرگرم زعماء میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابو الکلام آزاد، حکیم اجمل خاں
اور ڈاکٹر انصاری بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اُسی زمانے میں ترکِ موالات کی آواز اُٹھی
جسے خلافت تحریک کی پُرزور تائید حاصل ہوئی اور مُلک کی آزادی کا چرچا بہت زور

پکڑ لیا۔ اس تحریک کا ایک جُز، بقول شخصے یہ بھی تھا کہ طلبار اسکول اور کالج چھوڑ کر
آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں۔ مولانا محمد علی اور دوسرے
لیڈروں نے علی گڑھ کے طلبار کو اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کا پیغام پہنچایا، جس پر
طلبار نے صاد کیا۔ چنانچہ قوم کے سربرآوردہ
اصحاب نے فیصلہ کیا کہ ایک قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کا نام جامعہ ملّیہ اسلامیّہ
(نیشنل مسلم یونیورسٹی) ہوگا۔ ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم۔ اے۔ او کالج کی جامعہ مسجد
میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے اس کی
تاسیس کی رسم ادا ہوئی اور چونکہ علالت کی وجہ سے بہت کمزور اور ناتوان تھے، ان کے شاگرد
رشید مولانا شبیّر احمد عثمانی نے اُن کا خطبہ پڑھا" (یادوں کی دُنیا، ص ۸۵)

مولوی عبدالحق اس یادگار موقع پر بانیانِ جامعہ کی جانب سے بطورِ خاص اورنگ آباد
سے، علی گڑھ بُلائے گئے۔ اورنگ آباد واپس پہنچ کر ۸۔ نومبر ۱۹۲۰ء کے اپنے خط موسومہ
ڈاکٹر انصاری میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں، علی گڑھ بہت جوش اور شوق سے گیا تھا۔ مجھے نیشنل یونیورسٹی کا بڑا
اشتیاق تھا اور دہلی پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے آپ سے اسی
کے متعلق گفتگو کی۔ میری دلی تمنا یہ تھی کہ میں اس یونیورسٹی کو آغاز ہوتے
ہوئے آنکھوں سے دیکھ لوں۔ شکر ہے کہ میری مُراد بر آئی اور سب سے
بڑی مسرّت اس کی ہوئی کہ آپ صاحبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور مولانا
حالی کے نام سے اُردو پروفیسری قائم کرنے پر رضامند اور آمادہ ہیں۔
میں علی گڑھ اسی خیال اور نیت سے گیا تھا، ورنہ مجھے دوسرے معاملات
سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میری زندگی کا مقصد، صرف دُنیا میں ایک ہی ہے۔
وہ یہ کہ اُردو کو ترّقی ہو اور وہ علمی زبان بن جائے۔ ہندو، مُسلمان کا اِتّحاد
ملک کے لیے ایک مُبارک فال ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کے گوش گزار
کرنا چاہتا ہوں کہ آئندہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ اہلِ ملک کو سوراج"

ملے گا (خدا کرے وُہ زمانہ جلد آئے) ۔ اُس وقت زبان کا سوال، جو اُس وقت دب گیا ہے، پھر پیدا ہوگا ۔ حکومت کی کوئی صورت بھی ہوئی، خواہ ملک امریکہ کی طرح مختلف ریاستوں میں تقسیم ہوا، یا ایک انتظام کے تحت میں رہا، زبان کا سوال ناگزیر ہے ۔ سیاسی اغراض سے اگر ملک کی تقسیم کی گئی تو اس تقسیم کی بنیاد بھی زبان ہی ہوگئی ۔ اِس لیے ہمیں ابھی سے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اس کے لیے اس سے بہتر موقع کبھی نہیں مل سکتا۔ مجھے اس کی بڑی مسرّت ہے اور اس کی وجہ سے بڑا اطمینان ہے کہ آپ اور جنابِ حکیم اجمل خاں صاحب میرے ہم رائے ہیں کہ نیشنل یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہو ۔ آپ اس پہ قائم رہیں اور ہزار مخالفت ہو کبھی اِس اُصول کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، ورنہ ابتداء میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو پھر موقع ملنا محال ہوجائے گا ۔ "

مولوی عبدالحق کے یہ کلمات قیامِ پاکستان سے ۲۷ برس پہلے کے ہیں لیکن یہ اُن کی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، دیدہ وری اور پیش قیاسی کے آئین اور ان کے واحد مقصدِ حیات کے مُنہ بولتے مظہر ہیں ۔

○

۱۹۶۰ء

اہلِ مُلک کو آزادی مل گئی، ملک تقسیم ہوگیا، زبان کا سوال پیدا ہوا، اور وُہ اُصول ہاتھ سے جاتا رہا، جس پہ قائم رہنے اور ہزار مخالفت کے باوجود جسے ہاتھ سے نہ جانے دینے کے لیے مولوی عبدالحق نے آزادیٔ ملک سے ۲۷ برس پہلے بڑے شدّ و مد سے زور دیا تھا ۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے کامل تیرہ سال بعد، انتقال سے ایک برس پہلے، وطنِ عزیز کے شہریوں کے سامنے مولوی صاحب کو بہ حُزن و رقّت یہ کہنا پڑا کہ:

مَیں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وُہ میری دستگیری کریں، مجھے سہارا دیں اور اُردو یونیورسٹی کے قیام میں میری مدد کرکے مجھے ایک نئی

زندگی عطا کریں ۔ مَیں اَب زندگی کی اُس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے ، لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام ، اَب میری زندگی کا مِشن ہے اور اِس مِشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مَیں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے ۔ (کراچی) پاکستان میں اُردو یونیورسٹی بن کر رہے گی یہ خود قضا و قدر کا منشا ہے ۔ سوال صرف دیر اور سویر کا ہے ۔ اگر آپ نے میری مدد کی اور یونیورسٹی کے قیام کے وسائل و اسباب مُہیّا کر دیے تو یہ جَلد بن جائے گی اور میری زندگی میں بن جائے گی۔ یہ میرا عہد ہے کہ جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں سکت ہے اردو یونیورسٹی کی پاک مہم کو جاری رکھوں گا :

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جان رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

اور بالآخر اگست ۱۹۶۱ء میں اُنہوں نے جان ہار دی ۔ آج مولوی عبدالحق کو گزرے دس برس ہو گئے ۔ لیکن اُردو یونیورسٹی کا قرض ہم پر باقی ہے ۔

زبان کا اُن جیسا عاشق اور نڈر خیر خواہ اَب کوئی نہیں ، نہ کسی میں اُن کا سا جوشِ عمل نظر آتا ہے اور نہ وَیسی شانِ استقامت ۔ یہ نہیں کہ خُدا نخواستہ زبان کے خیر اندیشوں کی کمی ہو ، یہ بہت ہیں اور مخلص بھی ہیں ۔ زبان کے غم میں گھلنے والے بھی ہیں ، حالات سے مَغلوب ہو کر کچھ نہ کر گزرنے والے بھی ہیں ۔ نادان دوست بھی ہیں اور دانا دُشمن بھی ۔ زبان کی بے لوث خدمت میں لگے ہوئے خاموش کارکُن بھی بہت ہیں ۔ اور اُردو کا جلوس نکالنے والے بھی ——— لیکن مولوی صاحب کا سچّا جانشین کوئی نہیں ، گدّی نشینی کے مُدّعی اور مُجاور بہت ! ایک مولانا صلاح الدین احمد کی ذاتِ گرامی وجۂ اطمینان تھی لیکن وہ بھی ، اُردو کی بدقسمتی کہ مولوی عبدالحق کے بعد زیادہ دن نہ جیے اور فردوس نشین ہوئے ـــ مولانا غلام رسول مہر نے ٹھیک کہا ہے کہ "خیرہ ذوقی اور اغراض جوئی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں ، اُس میں مولانا جیسے کسی فرد کا پیدا ہونا بظاہر مُشکل ہی نظر

آتا ہے ۔" لیکن مایوس اور افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں ۔ خود مولوی عبدالحق کے بقول تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب دل بجھ گئے ہوں، سکوت اور سناٹے کا عالم ہو اور ہر چہار طرف افسردگی اور مُردنی چھائی ہوئی ہو :

"ایسے باہمت جوان مرد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں ۔"

• • •

تحریر ۲۸ - اگست ۱۹۷۱ء

بابائے اُردو مولوی عبدالحق:

بحیثیت شاعر

''شاعری کیا ہے، اساتذہ کے دو تین دیوان دیکھ کر ایک ''نیا'' دیوان تیار کیا جا سکتا ہے۔ (بابائے اُردو مولوی عبدالحق) ۱

مولوی عبدالحق کا یہ قول شعراء سے اُن کی بے اطمینانی کا مظہر ہے۔ ایک موقع پر گرامی کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں، وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے: بے نیاز، بے پروا، دنیا کے معاملات سے بے خبر، لا اُبالی......'' (چند ہم عصر، ص ۱۵۷)

۱۔ مجلسِ یادگارِ حمید احمد خاں کے تاسیسی اجلاس میں، جو ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو لاہور میں منعقد ہوا، بابائے اُردو کے رفیقِ دیرینہ پروفیسر محمود احمد خاں نے میرے استفسار پر یہ روایت بیان فرمائی۔ خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات مولوی صاحب نے ایک روز مجھ سے باتوں باتوں میں کہی اور خوب یاد ہے کہ ''نیا'' کا لفظ مولوی صاحب نے زور دے کر ادا کیا......'' (ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن)

مولوی عبدالحق، اس کے برعکس قطعاً عملی آدمی تھے اور بے عملی کے دشمن .... ،
اس لیے شاعروں اور شاعروں کے دول سے وہ کبھی زیادہ خوش اور مطمئن نہیں رہے، اس
کا اظہار ان کی تحریروں میں طرح طرح سے ہوا ہے :

"شاعر پہ کسی کا بس نہیں چلتا اور کسی کا کیا، وہ خود اپنے بس میں
نہیں ہوتا۔" (خطباتِ عبدالحق، ص ۱۲)

○

"ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دنیا و مافیہا کی
انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ آخر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور
امراء اس طرف جھکے تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں
نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا۔" (مقدماتِ عبدالحق، ص ۰)

"رمضان لاہور میں گذارے اور وہاں کی خوش آب و ہوا اور
مناظر سے لطف اٹھایے اور دیوان کے پروف دیکھیے اور پڑھ
پڑھ کے جھومیے، ہم خرما و ہم ثواب۔"
(مکتوباتِ عبدالحق، بنام امامی، ص ۱۶۷)

○

"مبارک ہو آپ کے دو دیوان چھپ گئے، جس کے پیچھے آپ
دیوانے ہو رہے تھے۔"
(مکتوباتِ عبدالحق بنام امامی، ص ۱۶۹)

○

"آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں
اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، اُن میں بعض طرح
طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ گردن اور دوسرے اعضاء سے کام لیتے

اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔"
(چند ہم عصر، ص ۱۶۷)

○

"ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہو گئی ہے۔"
(چند ہم عصر، ص ۱۶۸)

○

"ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی شاعر سے ملتا ہے تو اُس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر ہے، اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اُسے بھی اپنا کلام سُنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے۔ بعض شاعر تو اس کے لیے بے چین رہتے ہیں۔"
(چند ہم عصر، ص ۱۶۹)

○

"(بیسویں صدی کے ربع اول میں) ہماری زندگی میں بہت کچھ تغیر واقع ہوا ہے۔ اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کیا جائے تو کیا ہمارے شعراء کے کلام میں کہیں بھی اس انقلاب کا پتا ہے؟"
(خُطباتِ عبدالحق، ص ۳۹، ۴۰)

○

"ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ مشاہدے مطالعے اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن اگر انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں تو انہیں اپنی ہوائی پرواز سے، اس ناپاک زمین پر اُترنا پڑے گا"

(خطباتِ عبدالحق، ص ۴۰)

○

مشاعروں سے بھی مولوی عبدالحق کو بوجوہ کچھ دلچسپی نہیں تھی :-

"کانفرنس اور مشاعرہ محض تفریحی نہیں ہونے چاہئیں، کچھ کام بھی ہونا چاہیئے، ورنہ... (کانفرنس) بھی مشاعرہ ہو کر رہ جائیگی۔"

(مکتوباتِ عبدالحق بنام امامی ص ۳۶)

○

"کانفرنس کرنا آجکل کا فیشن ہو گیا ہے۔ ہنگامہ پسندی اور تفریح کے لیئے لوگوں کو اچھا نسخہ ہاتھ آگیا ہے۔ اس قسم کی اُردو کانفرنس میں مشاعرہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مشاعرہ کے جواز کے لیئے کانفرنس بھی کر لی جاتی ہے۔ مجھے بعض ایسی کانفرنسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے، اور ہمیشہ پچھتانا پڑا ہے۔ بے علمی کا یہ رنگ دیکھ کر میں کانفرنسوں سے بیزار ہو گیا ہوں"۔

(خطباتِ عبدالحق، ص ۲۲۹)

○

"مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی کیا حالت ہو گی"۔ (مقدماتِ عبدالحق ص ۸۱)

"مَیں مُشاعروں میں شرکت نہیں کیا کرتا....."

(بابائے اُردو، وادیٔ مہران میں، آفاق صدیقی ص۹۶)

○

"مَیں مشاعروں میں بالعموم شریک نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ انجمن ترقیٔ اُردو کی تقریب میں جو مشاعرہ ہُوا، مَیں نے اُس میں شرکت نہیں کی، صرف چند منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ مَیں صرف مشاعرے کی خاطر راولپنڈی جاؤں اور دو دن کے بعد واپس آ جاؤں، یہ سب کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

(مکتوباتِ عبدالحق، ص۲۶۳)

○

"آپ مُشاعرے کو اُردو کی خدمت خیال فرماتی ہیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ البتہ ان مقامات میں جہاں اُردو کا رواج نہیں یا کم ہے، اُردو مشاعرے، اُردو کی اشاعت و ترویج میں مدد دے سکتے ہیں لیکن پنجاب اور یوپی کے شہروں میں مشاعرے، محض ادبی تفریح ہیں۔ کسی فلم میں نہ گئے مشاعرے میں چلے گئے۔ اسی لیے مَیں مشاعروں میں شرکت سے احتراز کرتا رہا ہوں، جب تک کہ ان کے ساتھ کوئی ایسی تحریک نہ ہو جو حقیقی طور پر اُردو کی خدمت ہو۔"

(مکتوباتِ عبدالحق، ص۲۶۵)

○

شاعروں اور مُشاعروں سے مولوی عبدالحق کی مزاجی نامُناسبت اپنی جگہ، لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ شعر یا شاعری کی طاقت اور عظمت کے منکر ہوں، اُن کے نزدیک:

"شاعری خود ایک بڑا کمال ہے اور ایسا بڑا کمال ہے کہ اگر

کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اُس کے سامنے دوسرے
کسب و کمال ہیچ ہیں"۔ (مقدماتِ عبدالحق، ص۴۷)

O

ملکۂ شاعری کا "صحیح طور سے موجود ہونا" اصل بات ہے اور یہ چیز مولوی عبدالحق کو کم شاعروں میں نظر آتی تھی۔ بے نیازی، بے پروائی، دُنیا کے معاملات سے بے خبری، لااُبالی پن، بے عملی اور کاہلی سے شعراء کا متصف ہونا مولوی عبدالحق کو کبھی نہ بھایا اور اسی لیے وہ اس "مخلوق" سے ہمیشہ کسی قدر گریزاں رہے۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک ضبط اور اعتدال کے اوصاف سے مزین ہونا شاعر کا بڑا کمال ہے:

"یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے، ورنہ جوش میں آکر آدمی سررشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے۔" (چند ہم عصر، ص۱۷۲)

مولوی عبدالحق کا عقیدہ یہ ہے کہ "شعر میں اعتدال اور حسنِ ذوق کو قائم رکھنا شاعری پر بڑا احسان[1] اور خود شاعر کا بڑا کمال ہے"۔ شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اُس کے کلام کی تاثیر ہے۔۔۔۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ (جائے)[2]۔ شاعری میں خیال آرائی نہ ہو: دل میں درد اور صداقت بھی ہو، جہاں یہ نہیں وہاں آواز میں بھی درد اور صداقت نہیں ہو سکتی[3]۔" اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں[4]۔ اچھے شعر سے مولوی عبدالحق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ: "وہ ہمیشہ دلوں کو گرمائے، دماغوں میں جولانی پیدا کرے اور لطف و درد سے

---

[1] چند ہم عصر، ص۳۶۳ [2] مقدماتِ عبدالحق، ص۱۸۵
[3] خطباتِ عبدالحق، ص۸۰ [4] مقدماتِ عبدالحق، ص۲۶۰

آشکار کھے...[1]"

شعر و شاعری کے اس اونچے آدرش پر مولوی عبدالحق کے نزدیک حالی کے بعد اقبال کے علاوہ بالعموم کوئی پورا نہیں اُترتا اور اسی لیے اکثر شاعر مولوی عبدالحق کی نظر میں نہیں بچتے۔ مولوی عبدالحق کا قطعی اور حتمی خیال یہ ہے کہ:

"ایک پھسپھسی، بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا، نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ جب تک کلام میں لکھنے والے کی روح شریک نہ ہو، کلام مردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کر سکتا۔ اگر کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت، جدت، تازگی اور جوش ہے تو وہ آبِ رواں کی طرح موجیں مارتا ہوا بڑھتا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہوا ہے تو بحرِ مردار کے پانی کی طرح ساکن، مردہ اور بے حس ہوگا۔"

(خطباتِ عبدالحق، ص ۸)

مولوی عبدالحق کے نزدیک:

"شاعری طبعاً انسان کو مرغوب ہے اور اس نے قوموں پر بڑا اثر ڈالا ہے اور بعض اوقات بڑے بڑے انقلاب پیدا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے عام ادب میں اوّل درجہ شاعری کا ہے"

(مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، ص ۱۰۳)

لیکن ہمارے ہاں اردو شاعری نے کیا انقلاب پیدا کیے؟ کتنے شاعر ہیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں حبِّ وطن اور حبِّ قوم کا جذبہ پیدا کیا؟ انہیں قومیت کا خیال سمجھایا، ان کے دلوں کو اپنے پُرتاثیر کلام اور انقلاب انگیز خیالات سے گرمایا اور کسی سیاسی انقلاب کا باعث ہوئے یا کسی سیاسی انقلاب کی داغ بیل

---

[1] مقدماتِ عبدالحق، ص ۲۵۷ [2] خطباتِ عبدالحق، ص ۱۵

ڈالی یا لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا؟

"ہندوستان میں شاعروں کو ایسی باتوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں.... ان کی جولانیوں کے میدان ہی دوسرے ہیں"

(مرہٹی زبان پہ فارسی کا اثر، ص۱۱۲)

یہی اختلاف اور اسباب ہیں کہ مولوی عبدالحق، شاعروں سے زیادہ خوش اور مطمئن نظر نہیں آتے اور خود انہوں نے قریب ستر برس تک میدانِ ادب میں رہنے کے باوجود شاعری کا کوئی طوطا نہیں پالا! بایں ہمہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ مولوی عبدالحق نے بھی، تفریح اور تفنّن کے طور پر ہی سہی شعر گوئی کا "گناہ" کیا ضرور ہے!

"اِس حقیقت سے غالباً کم لوگ واقف ہوں گے کہ وہ (مولوی عبدالحق) تحقیق کے خشک میدانوں سے نکل کر شعروسخن کے سبزہ زاروں میں محوِ گل گشت نظر آتے ہیں"۔

— ایم۔ایم۔ فرشوری بدایونی

(بابائے اُردو، وادیٔ مہران میں ۱۹۶۲ء، ص۸۴-۸۵)

بابائے اُردو کے ایک قدیم رفیق پنڈت ونشی دھر جی ودیالنکار لکھتے ہیں کہ:

"یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ موج میں آنے پر وہ (مولوی عبدالحق) کبھی کبھی شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنے ہی ڈھنگ کی ہے۔ وہ اوزان اور بحروں سے بے نیاز ہوتی ہے اور جدید طرز کی ہے۔ مولوی صاحب کے پڑھنے کا انداز، ان کی خصوصیت کو محسوس کرا دیتا ہے۔ انہوں نے چکراتا (مسوری سے چار میل شمال میں) کے پہاڑوں میں شام کے وقت ٹہلتے ہوئے مجھے اپنی ایک

نظم سُنائی تھی جو مجھے اب بھی یاد ہے ..... اس کے علاوہ مولوی صاحب کے دو ایک مصرعے یا شعر بعض اور حضرات کے مضامین میں نظر سے گزرے ہیں، لیکن اب انھیں پیش کرنا مشکل ہے۔"

(مجلس حیدرآباد دکن، عبدالحق نمبر ۱۹۶۰-۶۱ء، ص ۶۹-۷۰)

ضیاء الدین برنی مرحوم کا بیان ہے کہ:

"مولوی عبدالحق صاحب، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ جتنے شعر میں نے اب تک سُنے ہیں وہ زیادہ تر مزاح کا رنگ لیے ہوئے ہیں.... مولوی صاحب کبھی کبھی ایک مصرع پر دوسرا مصرع بھی لگا دیتے تھے.... انھوں نے اختر انصاری اکبرآبادی کے لیے ایک "مزاحیہ" شعر بھی لکھا تھا مگر افسوس اب وہ میرے حافظے میں نہیں ہے، بہرحال مولوی صاحب شعر کہتے تھے جو زیادہ تر وقتی ہوتے تھے اور بعض میں چوٹیں بھی ہوتی تھیں...."

(عظمت رفتہ، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸-۵۰۹)

محمد اکبرالدین صدیقی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"بابائے اردو نے بحیثیت شاعر کبھی شہرت نہیں پائی۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ سُننے میں آئی کہ جب شعراء مولوی صاحب کے سامنے اپنا کلام سناتے تو وہ بھی کبھی فی البدیہہ مصرعے کہہ دیا کرتے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوا کہ شعر میں مولوی صاحب نے تھوڑا سا اُلٹ پھیر یا خفی سی تبدیلی کر دی جس سے شعر کا حُسن دوبالا ہو گیا۔ زبان ہی کی اصلاح نہ کرتے بلکہ طرز ادا کا بھی خیال پیش نظر رہتا...."

(قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۵)

اگلے صفحات میں بلا تبصرہ مولوی عبدالحق کے پچاس کے قریب متفرق اشعار جو مختلف ذرائع سے میسر آئے پیش کیے جاتے ہیں۔ ماخذ کا حوالہ ذیلی حواشی میں آگیا ہے۔ اُمید ہے ان کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں ہوگا:

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے؟
مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری[1]

○

تو نے حقی کو خوب گانٹھا ہے
اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے
دیکھنے میں دو پھول ہے، لیکن
درحقیقت وہ سیہہ کا کانٹا ہے[2]

---

[1] "یہ مولوی عبدالحق کا مشہور شعر ہے۔ یہ شعر مشہور اس معنی میں ہے کہ یہ ان کے بہت سے ملنے والوں کو یاد ہے۔" (ضیاء الدین برنی، عظمتِ رفتہ، طبع اول ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸)

[2] مولوی عبدالحق نے "ایک دن بیٹھے بیٹھے شان الحق حقی کی تعریف میں) یہ دو شعر ایک کاغذ پر لکھ کر مشفق خواجہ کو بھیج دیے۔ یہ محض مذاقاً لکھا گیا ہے، اس سے کسی کی تنقیص مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب، حقی کو بہت چاہتے تھے اور اُن سے مذاق بھی کیا کرتے تھے۔"

(ضیاء الدین برنی، عظمتِ رفتہ، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۸)

"حقی صاحب والا قطعہ... اُن کے نام کے ساتھ کبھی نہ چھپتا (اس میں اُن کی سبکی کا پہلو نکلتا ہے) لیکن ہوا یہ کہ جس وقت مولوی صاحب نے یہ قطعہ بھیجا تھا، اُس وقت برنی صاحب مرحوم میرے پاس بیٹھے تھے، انھوں نے اسی وقت اُسے نقل کر لیا تھا۔ اب تو خیر حقی صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ اس قطعے کو "گلدستۂ نگارش" میں شامل کیا ہے۔"

(مشفق خواجہ، بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۲۸۔ دسمبر ۱۹۸۰ء) (باقی اگلے صفحے پر)

اختر انصاری اکبر آبادی

دین و دُنیا کی تجھ سے آبادی
حیدرآباد میں تیرے دم سے
گونجتی ہے صدائے آزادی
تو نے وہ وہ اصول لکھے ہیں
پڑھ کے حیراں ہیں حیدرآبادی
نئی قدروں میں لکھ کے شعر اپنے
غزل اپنی ، اثر سے شہزادی
منظر[۱] و خواجہ[۲] و حکیم[۳] اسرار
مانتے سب ہیں تیری اُستادی[۴]

○

(گذشتہ سے پیوستہ) — ان اشعار کو محض چھیڑ خوباں یا زیادہ سے زیادہ ایک وقت یا لمحاتی ترنگ خیال کرنا چاہیے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق حقی صاحب کے بڑے قدرداں تھے۔ خود میں نے ایک سے زیادہ بار بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو حکیم اسرار احمد کریوی سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ حقی صاحب کا ذکر کرتے سنا ہے۔ — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

[۱] منظر ایوبی [۲] مشفق خواجہ [۳] حکیم اسرار احمد کریوی

[۴] مولوی عبدالحق نے یہ اشعار نواب شاہ کے دوران قیام اختر انصاری اکبرآبادی' ایڈیٹر 'نئی قدریں' (حیدرآباد) کی شان میں لکھے تھے۔ (ضیاء الدین برنی: عظمتِ رفتہ ، ۱۹۶۱ء: ص ۵۰۸-۵۰۹)
میرپور خاص حیدرآباد، نواب شاہ اور سکھر کے ادبی اجتماعات سے فارغ ہو کر ۲۴ دسمبر ۱۹۶۰ء کو بابائے اُردو کی واپسی کا پروگرام تھا" ہم (انہیں) لے کر صبح نو بجے روہڑی جنکشن پہنچے۔ بابائے اردو بڑی موج میں تھے، پہلے تو بڑے مزے مزے کے لطیفے سنائے پھر وہ اشعار سنائے جو استاد اختر انصاری کے لیے کہے تھے۔" (آفاق صدیقی، بابائے اُردو وادیٔ مہران میں' ۱۹۶۲ء، ص ۱۱)

نہ من مقلدِ باطل نہ قایلِ تقلید ○ محققانہ نظر داشتم کہ عبدِ حق ام[1]

دلوں پہ قبضہ، خیالات پر حکومت ہے ○ اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہوگا[2]

بحضور لیڈرِ اعظم[3]

ہمارے اِک محب رسیا برج کے ○ دِوانے ہیں شب و روز اس کے پیچھے

نہ گھر کی کچھ خبر ہے اور نہ در کی ○ برج سے دل لگی آٹھوں پہر کی!

اگر آئے کبھی گھر میں تو ایسے ○ مسافر آ، سرا میں اُترا جیسے!

ترستے رہتے ہیں صورت کو بچے ○ نہیں یہ بھولے منہ سے بات کرتے

رہی بیوی، سو ہے وہ کون کُتیا ○ لگائے مُنہ اُسے کوئی بھلا کیا

بہت دن تک وہ دیکھا کی تماشا ○ 'کیا صبر' اور کبھی اُن کو نہ ٹوکا

چھلک ہی تو پڑا پیمانہ صبر! ○ کہاں تک کرسکے دل پہ کوئی جبر

لگی کہنے کہ اے حضرت! سلامت ○ ذرا آئینے میں دیکھیو تو صورت

رُخِ زیبا پہ زردی چھا رہی ہے ○ جوانی کی کلی مُرجھا رہی ہے!

تمہارے آج کل اچھے نہیں طور ○ کبھی اس پر کیا بھی آپ نے غور

نہیں بنتی ہماری اور برج کی ○ تو کیا سمجھا ہے تو نے مجھ کو برج کی؟

---

[1] بروایت : مولوی محمد علی جنہوں نے مولوی عبدالحق کے ساتھ تقریباً نصف صدی گزاری۔ (قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، ص ۱۱)

[2] ماہنامہ ہم قلم، کراچی، جلد ۲، نمبر ۱۲، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۷

[3] مولوی عبدالحق کے ایک ساتھی، انٹرمیڈیٹ کالج، اورنگ آباد کے محمد ابراہیم صاحب لیکچرار معاشیات جنہیں برج کھیلنے کا چسکا یا لت تھی۔ اُنہوں نے ایک ٹیم کی ٹیم تیار کر رکھی تھی جس کے کپتان وہ خود تھے اس لیے وہ لیڈرِ اعظم کہلاتے تھے۔ (محمد اکبر الدین صدیقی، قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۴ء، ص ۴۲)

نہ مانو گر بُرا تم، تو کہوں میں! / اب، اس گھر میں رہے وہ، یا رہوں میں

نہیں منظور اس کے ساتھ رہنا / چلی جاؤں گی، گر مانا نہ کہنا!

کہا شوہر نے، سُن اُلّو کی پٹھی! / پڑھائی ہے یہ کس نے تجھ کو پٹی

برج کو چھوڑ دوں، ممکن نہیں یہ / یہ رشتہ توڑ دوں، ممکن نہیں یہ

برج ہے جان میری، آن میری / برج سے ہے یہ ساری شان میری

برج کا راج ہے سارے جہاں میں / برج کا غلغلہ ہے لامکاں میں

برج سے منزلِ فرحت چراغاں / برج ہے زندگی کا ساز و ساماں

برج ایمان و دینِ ابنِ آذر! / برج سرمایۂ عقبیٰ سراسر

برج پر میں فدا ہوں جان و دل سے / نہاتا ہوں میں اسی کے آبِ گِل سے

تمہیں جانا ہو، بسم اللہ جاؤ! / نہ یہ منحوس چہرہ پھر دکھاؤ

وہ یوں روتی ہوئی جب گھر سے نکلی / کہ جیسے خانماں برباد بگلی!

خدا کی مار ایسے کھیل پر ہو / کہ جس سے یوں تہ و برباد گھر ہو

زن و فرزند سے جس نے چھڑایا / کیا دم بھر میں گھر بھر کا صفایا

نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے، نہ سونا / برج ہے اور فرحِ منزل کا کونا

نہ یاروں سے رہی افسوس یاری / اگر کچھ ہے تو بس اک چار یاری

برج میں مبتلا ساری خدائی / دہائی دوستو، یارو دہائی[1]

○

---

[1] بابائے اُردو کی یہ نظم، خود اُن کے اپنے قلم سے لکھی ہے ایوانِ اُردو، حیدرآباد دکن کے میوزیم میں محفوظ ہے۔

(محمد اکبرالدین صدیقی، قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، ص ۵)

نظم

سب سے پکّا
سب سے سچّا
دوست کتاب!
سب سے بڑا
سب سے کڑا
معلّم، زمانہ [1]

○

بخدمت امام الشعراء حکیم امامی صاحب سلمہ':

قائدِ بنگلور امامی ہو تم
شاعرِ میسور امامی ہو تم
خدمتِ اردو سے منہ نہ موڑیو
دامن اُردو، نہ کبھی چھوڑیو
طعن و ملامت سے نہ گھبرائیو
خدمتِ اُردو سے نہ شرمائیو
ہمتِ مرداں کے خدا ساتھ ہے
حق یہ ہے تو حق کا ترا ساتھ ہے

[1] اس نظم کے راوی نانک رام بھگوان داس سائنس کالج کے پرنسپل پنڈت ونشی دھرجی ودیالنکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اپنی یہ نظم انہیں میسوری سے چالیس میل شمال میں چکبراتا کے پہاڑوں میں شام کے وقت ٹہلتے ہوئے سُنائی۔

(مجلس حیدرآباد دکن، عبدالحق نمبر ۶۱-۱۹۶۰ء، ص ۶۹-۷۰)

بوجھیے، یہ تک بندی کس کی ہے؟[1]

[تحریر: اکتوبر ۱۹۷۴ء]

○

استدراک:

(مضمون کا ابتدائی حصہ ۱۹۷۴ء میں تحریر کیا گیا تھا، ذیل کا اضافہ، بعد کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔)

مشفق خواجہ صاحب نے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کے ایک گرامی نامے میں مجھے اس امر سے مطلع کیا کہ:

ابن انشا کو بھی مولوی صاحب اپنے شعر لکھ کر بھیجا کرتے تھے مولوی صاحب کی وفات کے بعد انشا نے یہ اشعار "جنگ" میں چھپوا دیے تھے۔ لاہور میں کہیں "جنگ" کی جلدیں ہوں تو اگست سے دسمبر ۱۹۶۱ء تک کے شمارے دیکھ لیجیے۔ ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے:

گلٹ نے انشا نکما کر دیا
ورنہ تم بھی آدمی تھے کام کے

○

اب بابائے اردو کے اشعار کی تلاش میں، میں نے ابن انشا، سے رجوع کیا، ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے ایک گرامی نامے میں انھوں نے مجھے لکھا کہ:

"بابائے اردو کے متعلق جملہ معلومات کا مخزن مشفق خواجہ ہی ہیں

---

[1] بابائے اردو کے ان اشعار کے مخاطب انجمن ترقی اردو میسور، بنگلور کے سیکرٹری حکیم محمد امام امامی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے مولوی عبدالحق کا خط مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۴ء بنام امامی در: مکتوبات بابائے اردو بنام امامی، ص ۶۵

اُن سے باہر کوئی معلومات میرے پاس نہیں۔ اُن کے جو دو چار
اشعار معروف ہیں، اُن سے زیادہ کا علم مجھے بھی نہیں۔ تاریخیں
بھی خوب نکالتے تھے۔ افسوس میں نے کبھی ریکارڈ نہ رکھا۔
خیال پڑتا ہے کہ ایک منظوم خط میں جو میرے نام تھا، رائٹرز گلڈ
پر کچھ چھینٹے اُڑائے تھے، اس عنوان سے کہ وہ مجھے فرصت
نہیں بخشتی۔ گلڈ کے کاموں میں انہماک کی وجہ سے میں اُن
کے پاس کم جاتا تھا۔ جانے وہ نظم کہاں رکھی ہے۔ اُن کے انتقال
پر "جنگ" میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا، شاید اُس میں اس
(نظم) کا عکس بھی تھا۔ یہ چیز بھی مشفق خواجہ کی زنبیل میں ہوگی۔"

ابنِ انشا نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے وہ مجھے روزنامہ "جنگ" کراچی کی اشاعت ۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء میں ملا[۱]۔ مضمون کا عنوان ہے "مولوی صاحب کے آخری ایام"۔ اس مضمون میں ابنِ انشا نے، مولوی عبدالحق کی پانچ شعری قلمی تحریر کا عکس بھی دیا ہے۔ اشعار یہ ہیں :

گلڈ نے انشا نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

گلڈ نہیں یہ گلٹ ہے انشا دور رہو یہ پاپی ہے
کانِ نمک ہے اس میں نہ جانا یہ تو ستیاناسی ہے

حال کہوں کیا تجھ سے بابا صحبت تیری اچھی نہیں
گلڈ میں جانا، گلڈ میں رہنا، گلڈ میں کھانا ادباشی ہے

---

[۱] اس مضمون کی فراہمی کے لیے میں اپنے کرم فرما عبدالسلام سلامی (کراچی) کا ممنون ہوں۔

دنیا ایک جنجال ہے پیارے جال بچھا ہے چاروں کھونٹ
سخت کٹھن ہے اس سے نکلنا، دیکھو یہ اوگھٹ گھاٹی ہے
دیکھ سنبھل جا انشا پیارے صحبت یہ کچھ اچھی نہیں
کوئی بھی ان میں ایسا نہیں جو وقت پڑے کا ساتھی ہے

مولوی عبدالحق کے اپنے سواد تحریر میں مندرجہ بالا اشعار کا عکس پیش کرنے کے بعد توضیحاً ابنِ انشا نے لکھا ہے کہ "گلڈ کی مصروفیات کی بنا پر مولوی صاحب کے ہاں میرا آنا جانا کچھ کم ہو گیا تھا، اس کا انتقام انہوں نے ان اشعار میں، میری بجائے گلڈ سے لیا ہے، ویسے وہ گلڈ سے محبت کرتے تھے اور اس کے رب سے پہلے بنیادی رکن تھے[1]"

○

بابائے اُردو کے اشعار کی کُریدمیں میرے خطوں کے جواب میں مشفق خواجہ نے مجھے لکھا کہ :

"آپ کا پہلا خط بھی مل گیا تھا جواب دینے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ میں اس انتظار میں تھا کہ بابائے اُردو کے کچھ شعر مل جائیں تو آپ کو بھیجوں۔ بابائے اُردو کے کچھ شعر میرے پاس ہیں تلاش کر رہا ہوں۔ فی الحال ایک غزل ملی ہے، وہی جس کا عشقِ بُتاں والا شعر مشہور ہے - ایک مرتبہ میں نے بابائے اُردو سے پوچھا کہ (یہ) کیا.... واقعی اُنھیں کا شعر ہے؟
اُنھوں نے فرمایا کہ اس زمین میں انھوں نے پوری ایک غزل کہی تھی - میری فرمائش پر انھوں نے یہ غزل خود لکھ کر مجھے دی مگر

---

[1] روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۱-اگست ۱۹۹۱ء، ص ۴

پنسل سے۔ آپ کو تو ان کا مزاج معلوم ہی ہے۔ اس لیے
ہمت نہ ہوئی کہ یہ کہتا کہ قلم سے لکھ دیجیے۔ یہ "خستہ حال" اور
"بریدہ رنگ" اصل مسودہ ہی آپ کو بھیج رہا ہوں۔"

(خط، ۲۸- دسمبر ۱۹۷۴ء)

بابائے اُردو کی قلمی تحریروں سے میری قدیم آشنائی اور شناسائی ہے۔ "یہ خستہ حال"
اور "بریدہ رنگ" مسودہ مولوی عبدالحق ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق
کی یہ اُردو غزل ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

ہوں آلودہ عصیاں سے گو سر بسر میں
مٹا دے گی دھبّے مری خاکساری

نہ عشقِ بتاں ہے، نہ فکرِ معیشت
گزرتی ہے کیوں جاگتے رات ساری[1]

نشیب و فراز اس جہاں کی ہے ریت
نہ کر اے مری جاں دل اپنا بھاری

میں* کیوں چاہوں عفوِ گنہ کہ کر اس سے
مجھے شرمساری، مجھے شرمساری

---

[1] ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب "عظمتِ رفتہ" میں اس شعر کی قدرے مختلف قرأت درج
کی ہے (طبع اوّل ص ۵۰)۔ برنی صاحب کی روایت کے مطابق یہ شعر اس مقالے
کے ابتدائی حصے میں پیش کیا جاچکا ہے۔

* اس شعر اور اگلے شعر پر نشان لگا کر دائیں جانب کی خالی جگہ میں اس شعر کا اضافہ کر دیا
گیا ہے:
سزا چاہتا ہوں نہ عفوِ گنہ کی
کہ ہے اس میں تیری مری پردہ داری

[illegible]

سزا چاہتا ہوں کہ پنہاں ہے جس میں
تری بُردباری، مری بے قراری
سمجھتا ہے جس کو تو حُسنِ کامل
حقیقت میں ہے وہ تری خاکساری
کہاں تک یہ مخلوق پستی رہے گی
کہاں تک یہ آہ و بکا نالہ زاری
کہاں تک جفائیں، سزائیں جفائیں
کہ رعشہ ہے جس سے زمانے پہ طاری
سعی میں ہے پنہاں خُدائی کی رونق
ترقی، تنزّل ہے سب اعتباری

ترے زہد میں پاپ ہے اور نہ پُن ہے

ہے اس سے تو بہتر مری مے گساری

خزاں کا عمل اُٹھ چکا ہے چمن سے

خبر لائی اُڑتی سی بادِ بہاری

O

مشفق خواجہ لکھتے ہیں کہ :

مولوی صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ جب طبیعت موزوں ہوتی تھی تو خوب شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ میرے پاس کئی ایسے پُرزے تھے، جن پر اُنہوں نے شعر لکھ کر بھیجے تھے۔ افسوس کہ باوجود تلاش کے ان میں سے کوئی نہیں ملا۔

ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم، اُردو بورڈ کا کام انجمن کے کتب خانے میں کرتے تھے اور انجمن کا دفتر کھلنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی تشریف لے آتے تھے۔ اُن کے لیے بطورِ خاص یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ کتب خانہ وقتِ مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے کھولا جاتا تھا ایک روز ایسا نہ ہو سکا تو ڈاکٹر صاحب نے مولوی صاحب سے شکایت کی۔ مولوی (عبدالحق) صاحب نے ڈاکٹر (شہید اللہ) صاحب کی شکایت کو ایک نظم کی صورت میں میرے پاس بھیجا۔ اس میں چھ سات شعر تھے۔ پہلے مصرعے میں میرا نام تھا اور دوسرا مصرع یہ تھا :

مجھ سے بڈھے کو کیوں ستاتے ہیں

آخری شعر یہ تھا :

بورڈ کی خیر ہم مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں

افسوس کہ باقی اشعار یاد نہیں - اگر پُرزہ مل گیا تو آپ کو بھیج دوں گا[1] ۔“ (خط بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرقومہ ۲۸ - دسمبر ۱۹۷۴ء)

○

ذیل کے دو مصرعے مولوی عبد الحق کی یادگار ہیں :

مجھ سے تقریرِ امامی[2] نے یہ لکھوائی ہے
”ایک بیدادِ گرِ جور و جفا اور سہی[3]“

○

”چل دیا ، ہائے غریب الوطن[4]“
۱۳۷۲ھ

---

[1] افسوس کہ کاغذ کا وہ پُرزہ جس پر مولوی صاحب نے اشعار لکھ کر بھیجے تھے میسّر نہیں آ سکا ۔

[2] حکیم محمد امامی : اُردو اخبار ”آفتاب“ (میسور ، بنگلور) کے مدیر ، ایک شعری مجموعے اور شخصی مضامین پر مبنی ایک کتاب ”نقوش و تاثرات“ کے مصنف اور میسور (بنگلور) کی انجمن ترقیٔ اردو شاخ کے سکرٹری ۔

[3] ماخذ : خطباتِ عبد الحق ، ایڈیشن ۱۹۶۴ء ، صفحہ ۵۷ ۔

[4] ہجری سالِ وفات عبد الرحمٰن صدیقی ۔ اس کے بارے میں خود مولوی عبد الحق نے لکھا ہے کہ ”یہ تاریخ میں نے عبد الرحمٰن صدیقی کی وفات کے روز کہی تھی ۔“ (قومی زبان کراچی ، بابائے اردو نمبر ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۱۹)

۶۔ نومبر ۱۹۴۳ء کی رات کالی کٹ (ملیبار) میں بڑے زور کا مشاعرہ ہوا اور بابائے اردو کو میرِ مشاعرہ بنایا گیا بلکہ ایک شعر بھی تبرکاً پڑھوایا (ہماری زبان، نئی دہلی ۱۶۔ دسمبر ۱۹۴۳ء)۔ مولوی صاحب کا طبع زاد شعر یہ ہے:

گو پیر ہیں پہ دل سے ہمیشہ جواں رہے
گل کی طرح شگفتہ رہے، ہم جہاں رہے

[پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی کراچی ۱۹۵۳ء ص ۱۲۴]

O

درج ذیل دو اشعار کے بارے میں میرا گمان ہے کہ شاید یہ بابائے اردو کے ہوں لیکن یہ ابھی تحقیق طلب ہیں اور مجھے ان کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں کہ یہ بابائے اردو ہی کے ہیں۔ ماخذ کے حوالے سے یہ دونوں شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

دن کٹا جس طرح کٹا لیکن
رات کٹتی نظر نہیں آتی [۱]

O

کام آ خلق خدا کے کہ خدا کے نزدیک
اس سے بہتر نہ ہوئی ہے نہ عبادت ہو گی [۲]

اس ساری بحث کے بعد گوپی چند نارنگ کا یہ کہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ ''مولوی عبدالحق...... سخن گوئی کے معاملے میں کورے تھے'' [۳]

[نظر ثانی و اضافہ: اپریل ۱۹۹۲ء]

---❖---

حوالہ جات:

۱۔ مکتوباتِ بابائے اردو بنام امامی، طبع اول، کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۱۷۴

۲۔ بابائے اردو وادی مہران میں، ۱۹۶۲ء، ص ۸۵

۳۔ سہ ماہی تناظر، نئی دہلی جون ۱۹۸۴ء، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۲۴۶

مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر

تحریر: محبوب احمد نقوی

بابائے اردو کی شعر گوئی کے بارے میں میری کاوش اور جستجو کا نوٹس لیا گیا اور اس کی قدر افزائی ہوئی۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے اردو کے محسنِ اعظم بابائے اردو مولوی عبدالحق پر چارروزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا جس میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، ناروے، انگلینڈ اور کینیڈا وغیرہ سے ستر کے لگ بھگ مندوبین نے شرکت کی۔

اس سیمینار میں پیش کیے گئے کچھ مقالات کا ایک مجموعہ "مولوی عبدالحق - - - ادبی و لسانی خدمات" کے نام سے ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کیا جو ۱۹۹۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۴۲۸ کے تحت شائع ہوا۔ اس مجموعے کا آخری مضمون "مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر" جناب محبوب احمد نقوی (لندن) کا تحریر کردہ ہے جسے افادہ عام کے لیے ان کے اور ڈاکٹر خلیق انجم کے شکریے کے ساتھ شامل [illegible] کیا جا رہا ہے۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

اس عنوان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ چونکے ہوں اس لیے کہ مولوی عبدالحق، شاعر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بھی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک باشعور اور برجستہ گو شاعر تھے۔ ان کا باشعور ہونا ہی، آگے چل کر ان کے دوسرے ادبی کارناموں یعنی اعلیٰ درجے کی تحقیق و تنقید، کا وسیلہ بنا اور وہ ایک بلند پایہ محقق و نقاد بن کر سامنے آئے۔ ان کی برجستہ گوئی بھی ضائع نہیں گئی بلکہ گاہے کسی خاص علمی و ادبی واقعے کی منظوم تاریخی گواہ بن گئی ہے اور گاہے، موقع محل کے اعتبار سے محفل میں شریک صاحبانِ ذوق کے لیے [illegible]

مانا کہ مولوی عبدالحق اردو کے نامور نثر نگار ہیں اور نثر نگاری ہی اُن کی شناخت ہے، پھر بھی اُن کا شاعر ہونا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہاں ادبی روایات کا سلسلہ نثر سے نہیں شاعری سے شروع ہوا ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی، سب کا تقریباً ایک ہی حال ہے۔ شاعری کی روایت کے مستحکم ہونے کے بہت بعد، تحقیق و تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ چناں چہ ہمارے سارے بزرگ ادیبوں کی ذہنی تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق سے قبل کے ممتاز نثر نگار، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولانا شبلی چاروں شاعر تھے۔ خود سرسید احمد خاں، جنھیں جدید نثر کا بانی کہا جاتا ہے اور نثر میں جن کی خدمات غیر معمولی ہیں، وہ بھی شاعر تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔

سرسید اور حالی کے بعد کے نثر نگار یعنی مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد دین تاثیر، آل احمد سرور، مولانا حامد حسن قادری، احتشام حسین وغیرہ سب کے سب طبعاً شاعر تھے یا ہیں۔ فراق نے تو خیر تنقید اور شاعری دونوں میں بڑا نام پایا لیکن دوسروں نے بھی شاعری کا قابل ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اور ان میں سے بعض کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیے مولوی عبدالحق سیمنار میں آج جو لوگ بطور نقاد و محقق شریک ہیں ان میں بھی کئی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ایسے میں مولوی عبدالحق کا شاعر ہونا چنداں حیرت کی بات نہیں بلکہ اُن کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں سے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کا شعری ذوق ہی انھیں ادب کی طرف لایا ہے، اور اسی کی بدولت ان کی نثر میں وہ دل کشی پیدا ہوئی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یوں بھی ان کے مقدمات، تبصروں اور تنقیدی مضامین پر نگاہ دوڑائیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خاص مناسبت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اُردو شعرا کے تذکروں کو نہ ہاتھ لگاتے اور نہ اردو شعرا کے انتخاب کلام کی طرف توجہ کرتے۔ دوسرے مضامین کو چھوڑیے، صرف انتخاب کلام میر ہی کے مقدمے کو لے لیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شاعری کی تفہیم و تنقید کا کیسا اچھا شعور و سلیقہ رکھتے تھے۔

مولوی عبدالحق کو میں نے اُوپر باشعور شاعر کہا ہے اور وہ اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ دوستوں کی طرح بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکے نہیں بلکہ اپنی خوش ذوقی اور شاعرانہ صلاحیت کے باوجود بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ شاعر سے اچھے نثر نگار ہو سکتے ہیں اور شاید یہ بھی محسوس کر لیا کہ کسی زبان یا قوم کو صرف شاعری کی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور علمی و ادبی نثر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی

نظر سے غالباً مولانا روم کا یہ قول بھی گزر چکا تھا کہ

شعر گفتن گرچہ دُر سفتن بود

شعر فہمیدن بہ از گفتن بود

یعنی شعر کہنا یقیناً موتی پرونے کا کام ہے اور بہت مشکل کام ہے لیکن شعر کی تفہیم و تنقید کا کام کچھ اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔ اسی لیے انھوں نے دانستہ شاعری کو اوروں کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے معنوی اُستاد سر سید احمد کی طرح خود کو نثر کے لیے وقف کر دیا۔

مولوی عبدالحق کا شعری سرمایہ کسی ایک جگہ مجتمع نہیں بلکہ اُن کی تحریروں خصوصاً خطبات اور مکتوبات میں جا بجا بکھرا ہوا ہے اور ہماری نگاہوں سے عموماً اوجھل ہے۔ اُن سب کا کھوج لگانا، انھیں یکجا کرنا اور جانچنا پرکھنا کسی بلند پایہ محقق کا کام ہے۔ میں تو، ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں اور مجھے چوں کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کی ذات و صفات سے خاص دلچسپی ہے، اس لیے اِس محفل میں اُن کی شاعری کے ذکر کو ضروری جانتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تلاش بسیار یا تحقیق واقعی کا بھی کوئی موقع نہیں ملا اور نہ شاید میں اس کا اہل ہوں نتیجۃً جو چیزیں آسانی سے ہاتھ لگ سکیں، بطور تبرک پیش کیا جا رہا ہے۔

اب سے کم و بیش پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں کراچی میں تھا۔ اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ عام میں "عظمتِ رفتہ" نامی کتاب دیکھ رہا تھا۔ ضیاءالدین احمد برنی کی کتاب تھی اور اس میں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے خاکے تھے۔ مجھے کتاب اچھی لگی، اپنی پسند کے سارے ادیبوں کے خاکے پڑھ ڈالے اور لطف اندوز ہوا کتاب کے آخر میں مولوی عبدالحق کا خاکہ تھا۔ اس میں ان کے چند شعر نظر آئے میں نے کچھ شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ اشعار یہ تھے ؎

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے   مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

تو نے حقی[1] کو خوب گانٹھا ہے   اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے

دیکھنے میں وہ پھول ہے لیکن   درحقیقت وہ سیہ کا کانٹا ہے

---

[1] یہ قطعہ شان الحقی کے بارے میں ہے۔ اس کے سلسلے میں برنی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ محض مذاقاً لکھا گیا ہے۔ اس سے کسی کی تنقیص مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب حقی کو بہت چاہتے تھے۔ ص ۵۰۹

عبدالحق سیمنار کے لیے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا تو یہی اشعار میرے لیے موضوع بن گئے۔ کراچی میں دو تین دن قیام کر کے میں نے مولوی صاحب کی شاعری کے بارے میں مزید مواد فراہم کرنا چاہا۔ پہلے تو مایوسی ہوئی پھر کسی نے بتایا کہ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ایک نئی کتاب "تحقیق اور تلاش" کے نام سے بازار میں آئی ہے اس میں ایک مضمون مولوی عبدالحق کی شاعری کے بارے میں بھی ہے۔ اردو بازار گیا کتاب آسانی سے مل گئی اور میرے لیے لطف و مسرت کا باعث ہوئی۔ لندن میں رہ کر بھی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کے نام اور کام سے متعارف تو تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ مولوی عبدالحق کی زندگی، شخصیت اور نثر نگاری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور اُن پر درجنوں مقالے ہی نہیں تین چار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی شاعری کے سلسلے کا مضمون بھی سیر حاصل اور محققانہ تھا نتیجۃً اس سے آگے کھوج کرنے کی ہمت نہ ہوئی میں نے اسی کو اپنے مضمون کا اصل ماخذ بنا لیا اور اس جگہ اسی کی مدد سے مولوی عبدالحق کے جستہ جستہ اشعار، آپ کی لطف اندوزی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

اوپر، ضیاء الدین برنی کی کتاب کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا گیا ہے

نہ عشقِ بتاں ہے، نہ فکرِ معیشت ✲ مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

یہ شعر، اکیلا نہیں ہے بلکہ مولوی صاحب کی مکمل غزل سے تعلق رکھتا ہے اس غزل میں گیارہ اشعار ہیں، صرف چند شعر دیکھیے ؎

ہوں آلودہ عصیاں سے گو سر بسر میں	مٹا دے گی، دھبّے مری خاکساری
نشیب و فراز اس جہاں کی ہیں ریتیں	نہ کر اے مری جان، دل اپنا بھاری
سزا چاہتا ہوں کہ پنہاں ہے جس میں	تری بردباری، مری بے قراری
کہاں تک یہ مخلوق پرستی رہے گی	کہاں تک یہ آہ و بکا نالہ زاری
ترے زہر میں پاپ ہے اور نہ پن ہے	ہے اس سے بہتر مری مے گساری
خزاں کا عمل اٹھ چکا ہے چمن سے	خبر لائی اُڑتی سی بادِ بہاری

ایک اور شعر میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ فرد کی صورت میں ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ مولوی عبدالحق میں غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ موجود تھا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے تھے لیکن انھوں نے دانستہ شعر گوئی سے گریز کیا اور افادیت کے نقطۂ نظر سے نثر نگاری ہی کو مستقلاً اپنائے رکھا

شعر یہ ہے ؎

دلوں پہ قبضہ، خیالات پر حکومت ہے　　اب اس سے بڑھ کے تمھیں اختیار کیا ہوگا

مولوی صاحب برجستہ گوئی اور تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس کی بھی کئی مثالیں اپنے مضمون میں درج کی ہیں لیکن میں انھیں اس جگہ نقل کر کے مضمون کو بے جا طول نہیں دینا چاہتا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ مولوی عبدالحق شاعر بھی تھے اور شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے لیکن ان کی خود شناسی نے انھیں شاعر بننے سے روکا اور سرسید احمد خاں کی راہ پر چلنے پر مہمیز کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس جدید اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی تھی مولوی عبدالحق نے اس پر ایک تاج محل تعمیر کر دیا اور آج ہم مولوی عبدالحق سیمینار کے حوالے سے اس تاج محل کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔
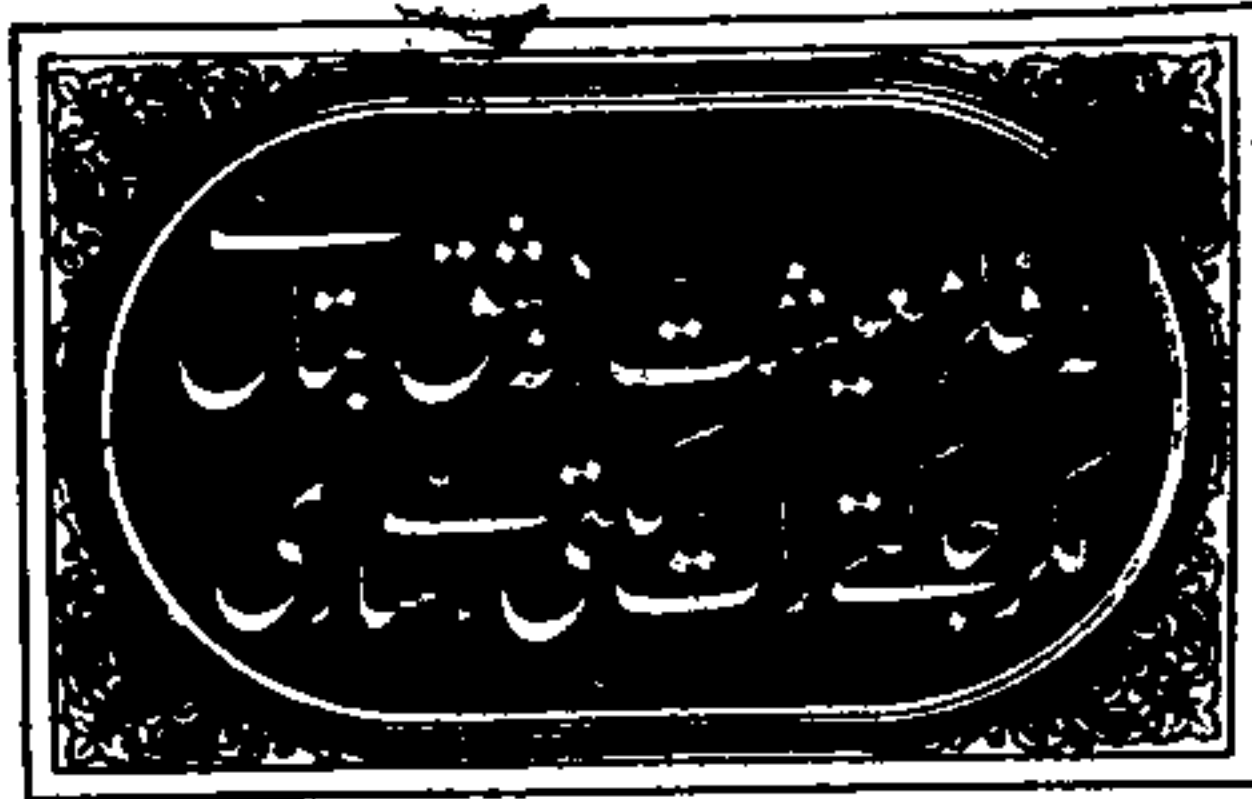
کچھ بابائے اُردو کی شادی کے بارے میں

[تحریر: جولائی ۲۰۰۱ء]

۱

انتظار حسین نے ایک موقع پر اپنے مخصوص اسلوب میں مولانا حامد علی خاں (۱۹۰۱ء۔۱۹۹۵ء) اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) کی ایک ابتدائی مُلاقات کا تذکرہ اِن لفظوں میں کیا ہے:

"حامد علی خاں کے بیان سے پتہ چلا کہ مولوی عبدالحق ..... سے جب اُن کی ملاقات ہوئی تو اس کا سماں کچھ یہ تھا:

مولوی عبدالحق: میاں تمہاری شادی ہوگئی ہے؟

حامد علی خاں: جی نہیں۔

مولوی عبدالحق (مسرت بھرے لہجے میں): کیا کہا، شادی نہیں ہوئی!

حامد علی خاں: جی نہیں۔

مولوی عبدالحق: شاباش، شاباش، اَب تم دل لگا کر اُردو کی خدمت کرو۔

حامد علی خاں نے شاباش لی اور اطمینان سے شادی کر لی! خیر، اُردو کی خدمت انہوں نے اس کے بعد بھی کی، مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک شادی شدہ آدمی کر سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا معاملہ یہ تھا کہ بقول مولانا حامد علی خاں اُنہوں نے تو اُردو ہی سے شادی کر لی تھی۔"

[روزنامہ، مشرق، لاہور ۳۰۔اگست ۱۹۷۱ء]

اُردو سے شادی کر لینے والی بات" بابائے اُردو پر مُتعدد لکھنے والوں نے یہاں تک کہ اُن کے بہت سے دوسرے قریبی احباب تک نے بارہا کہی ہے۔ یہ بات، ایک بڑے طویل عرصے سے اور اس قدر تواتر اور وثوق کے ساتھ کہی جاتی رہی ہے کہ اس نے ایک طرح سے "مُسلمہ صداقت" کی سی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) کے چھوٹے اور مولانا حامد علی خاں اور پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۲ء۔۱۹۷۴ء) کے بڑے بھائی

پروفیسر محمود احمد خاں (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۴ء) سے جو بابائے اُردو کے ہم دمِ دیرینہ تھے اور جن کی بابائے اُردو سے ۱۹۱۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی، ۱۹۶۵ء میں مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بابائے اُردو کی شادی کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر محمود احمد خاں نے کسی قدر تلخی اور عزم کی پختگی سے فرمایا کہ:

"۔ میں شادی کے بارے میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔
شادی کے بارے میں مجھے پتہ ہے لیکن مولوی صاحب نے راز رکھنا
پسند فرمایا، مجھ سے اس سلسلے میں کچھ نہ پوچھیے، اسے ROMANCE
ہی رہنے دیجیے۔"
اس موضوع پر میرا کوئی استدلال مسموع، گزارش کا کوئی انداز مقبول
اور کوشش کا کوئی طریق نتیجہ خیز نہ ہوا۔"

| قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء ص ۲۷۷ |

شادی کے موضوع سے بابائے اُردو مولوی عبدالحق "ایلر جک" نہیں تھے۔ اس حوالے سے اُن کی زندہ دلی اور شگفتہ طبعی کی بعض روایتیں ملتی ہیں۔ پروفیسر محمود احمد خاں نے ہی ایک ملاقات میں راقم الحروف (سیّد معین الرحمٰن) کو بطور "لطیفہ" ایک قصہ سنایا کہ:

"میری شادی ہونے سے ایک دو برس پہلے کی بات ہے ایک اینگلو
انڈین لڑکی مولوی (عبدالحق) صاحب کو ملی۔ مولوی صاحب اس سے
متاثر ہوئے، اور ایک روز ترنگ میں آ کر کہا، "اس کی شادی کراؤ"۔
احباب نے نام تجویز کرنا شروع کر دیے۔ مولوی صاحب نے ہاشمی
فرید آبادی سے کہا کہ "اور سب کو چھوڑ دو، بھئی محمود سے کراؤ۔ اس پر
بڑی چہل رہی۔" | قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء ص ۲۷۸ |

بابائے اُردو کے ایک پرانے خادم ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی کا کہنا ہے کہ:

" ایک دن مولوی (عبدالحق) صاحب اور اُن کے کئی دوست ہنسی
مذاق کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ

مولوی صاحب، اب تو آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ یہاں ایک کافی مالدار عورت ہے۔ اس پر مولوی صاحب خوب ہنسے اور کہنے لگے کہ اگر یہ عورت اپنی تمام دولت میری ''انجمن'' کے نام کر دے تو میں شادی کرلوں گا۔''

[بابائے اُردو کے کہانی، ان کے معتمد کی زبانی'
کراچی طبع اوّل ۱۹۸۳ء، ص ۳۹]

۱۹۶۴ء میں مجھے بابائے اُردو کے ایک بہت ہی دیرینہ اور معتمد دوست نواب معشوق یار جنگ سے مُلاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ پہلی بار ۱۹۰۱ میں مولوی عبدالحق سے ملے اور پھر مولوی صاحب سے ان کا یہ تعلق، مولوی عبدالحق کے دمِ آخر (اگست ۱۹۶۱ء) تک قائم رہا۔ انہوں نے بتایا کہ اُنہیں کئی بار'' مولوی صاحب کے والد علی حسن صاحب کے نیاز کی عزت حاصل ہوئی۔ وہ حیدر آباد تین آتے تو میں ضرور اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے، لیکن کسی خانگی بات کا اُنھوں نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا، اور نہ میں نے کبھی کچھ پوچھا۔'' (قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶)

میرے ایک سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا: ''تجرّد پسندانہ زندگی کی نعمتوں یا متاہلانا زندگی کی برکتوں کا کوئی ذکر مولوی صاحب نے مجھ سے نہیں کیا بلکہ کسی سے بھی نہیں کیا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہوگئی تھی۔ لڑکی والوں نے بعض رسموں کی انجام دہی پر اصرار کیا تو مولوی صاحب بدک گئے۔ اور وہاں سے بمبئی بھاگ آئے۔ یہاں سے کچھ دنوں بعد حیدر آباد چلے گئے۔ بعد میں سنا طلاق بھی ہوگیا تھا.... (لیکن)، یہ میں کوئی شہادت نہیں دے رہا۔ یہ سنائی بات ہے۔ میں نے جیسا سنا آپ کو بتادیا۔ اب صحیح صورت کیا تھی، اللہ جانے!'' (قومی زبان، ایضاً ص ۱۳۶)

شاہد احمد دہلوی نے مولوی عبدالحق کی شادی کے بارے میں ایک موقع پر گول مول سی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق صاحب نے شادی ساری عمر نہیں کی۔ یہ بھی سنا تھا کہ

ایک دفعہ گھر والوں نے گونتھ گانتھ کے اُن کی شادی کردی تھی تو مولوی عبدالحق نے حیدرآباد پہنچ کر طلاق نامہ بھیج دیا۔ اصل میں اُن کی شادی تو اُردو سے ہو چکی تھی۔''

[قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۴ء ص ۱۶]

بابائے اُردو کے قریبی احباب کے قیاسات سے قطع نظر، بابائے اُردو کے بعض قدیم نجی خدمت گزاروں کے بیانات سے یہ صریح شہادت ملتی ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی شادی ہوئی تھی۔ اس ضمن میں ان کے ایک قدیم اور آبائی خدمت گار صوفی عبدالرشید سے منسوب ایک روایت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس روایت کو پیش کرنے سے پہلے، یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ راوی، صوفی عبدالرشید ہیں کون؟

صوفی عبدالرشید نے، پروفیسر شمیم احمد سے ایک بات چیت میں اپنے بارے میں بتایا ہے کہ:

''....میرا سارا خاندان، مولوی (عبدالحق) صاحب کے خاندان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہا ہے... میرا اور مولوی (عبدالحق) صاحب کا تعلق میرے دادا کے وقت کا تھا۔ میرے دادا اُن کے پرانے ملازم تھے اور اس طرح میری تین پشتیں مولوی (عبدالحق) صاحب کے خاندان کی خدمت میں گزر گئی ہیں۔ میری پیدائش بھی مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق کے گھر میں ہوئی اور میرے والد عبداللطیف بھی اسی طرح اس خاندان کے دعا گو اور احسان مند رہے۔''

[قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۵ ۔ ۲۲۶]

صوفی عبدالرشید بتاتے ہیں کہ:

''علمی، تعلیمی اور قومی کاموں میں ہر وقت مصروف رہنا اور زندگی کی کسی بڑی سے بڑی رنگینی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا، ان کا خاص جوہر تھا... حتیٰ کہ مولوی (عبدالحق) صاحب نے اپنی شادی بھی اس خوئے بیگانگی کی نظر کر دی- جب اُن کی چھوٹی بہن کی شادی ''چھوٹے محل'' میں ہونے لگی جو ہاپوڑ کا زمیندار گھرانا تھا تو مولوی صاحب کی شادی بھی اسی گھر کی ایک لڑکی سے طے کر دی گئی۔ مولوی صاحب کی بیوی کا نام جعفری تھا-

یہ شادی مولوی (عبدالحق) صاحب نے والدہ کے اصرار پر کی تھی مگر اُن سے یہ زبردستی زیادہ دیر برداشت نہیں ہوئی اور بیوی سے بالکل تعلق ہی نہیں رکھا اور علی گڑھ چلے گئے- تھوڑے عرصے بعد مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اُن کی شادی کسی دوسری جگہ ہو گئی مگر مولوی (عبدالحق) صاحب نے پھر ساری عمر شادی نہیں کی- صوفی عبدالرشید نے اپنی سُنی سُنائی، یہ ساری روایات اپنی والدہ سے منسوب کی ہیں۔ [قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء ص ۲۲۶]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ایک دوسرے پرانے خادم بشیر احمد کے بیانات سے صوفی عبدالرشید کی پیش کردہ روایات کی تائید ہوتی ہے-

بشیر احمد نے بقول خود ''اپنے گھر کے نامساعد حالات کی بناء پر گیارہ برس کی عمر میں بابائے اُردو کے بڑے بھائی شیخ ضیاءالحق کی خدمت اختیار کی (یہ غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے)- ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے بشیر احمد کو اپنی خدمت کے لئے حیدر آباد بُلوا لیا''- اور پھر چالیس برس کے طویل عرصے تک بشیر احمد نے مولوی صاحب کی خدمت میں گزار دیئے-

''بابائے اردو کی کہانی'' کے نام سے بشیر احمد کا ایک کتابچہ (۷۵ صفحات پر مشتمل) ۱۹۸۳ء میں کراچی سے شائع ہُوا، جس سے بابائے اُردو کی نجی زندگی بالخصوص، اُن کی شادی کے موضوع پر

قابلِ توجہ مواد ہاتھ آتا ہے:

بشیر احمد کے بقول:

"مولوی عبدالحق صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے محلّہ قانون گویاں میں رہا کرتے تھے اور میرا خاندان بھی اسی محلّے میں آباد تھا۔ اسی محلّے میں مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق بھی رہتے تھے اور رئیس لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔" [مذکورہ کتابچہ، ص ۱۱]

بشیر احمد بتاتے ہیں کہ:

"جناب قبلہ مولوی (عبدالحق) صاحب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ شادی نہیں کی لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ اُنہوں نے شادی کی تھی اور جس لڑکی سے شادی ہوئی تھی وہ بھی مولوی صاحب کے خاندان کی تھی۔ یہ بات اس لیے بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ (ہاپوڑ میں) میرا مکان بھی مولوی صاحب (کے مکان) کے بالکل قریب تھا اور میری والدہ صاحبہ برابر اُن کے ہاں آیا جایا کرتی تھیں، اور جس دن مولوی صاحب کی شادی ہوئی، میری والدہ بھی شریک ہوئی تھیں۔ جب شادی سے فارغ ہوگئے تو سب لوگ اگلے دن صبح کو ولیمے کی تیاری میں مصروف تھے، معلوم ہوا کہ دولہا میاں علی الصبح گھر سے روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ گھر کے لوگوں کو بڑی شرمندگی اُٹھانا پڑی۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا (کہ) مولوی صاحب قبلہ نے اپنی بیوی کا مہر وغیرہ سب کچھ ادا کر دیا ہے۔ اُن کی بیوی کافی عرصے تک اپنے میکے میں بیٹھی رہیں اور پھر کافی عرصے کے بعد ایک دوسرے صاحب جناب ممتاز حسن صاحب کے ساتھ اُن کا نکاح ہوا اور کئی بچے بھی اُن سے ہوئے، جو اب تک ہاپوڑ میں موجود ہیں۔"

[مذکورہ کتابچہ، ص ۳۹-۴۰]

ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی کا کتابچہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس مختصر سی کتاب کی اشاعت سے بیس برس پہلے بشیر احمد نے والدین کے بے پناہ احترام اور مولوی عبدالحق کی شادی کے بارے میں کم وبیش یہی باتیں پروفیسر شمیم احمد سے ایک بات چیت میں ریکارڈ کرائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

"(مولوی عبدالحق کے بھائی) ضیاء الحق صاحب اپنی والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ میں نے انھیں اکثر اُن کے پیر دباتے دیکھا تھا۔ والدہ کی عزت کے معاملے میں مولوی عبدالحق صاحب کا بھی یہی احوال تھا جو ضیاء الحق صاحب کا۔ کسی بات کو اُن کی ٹال نہیں سکتے تھے۔" [قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۳ء ص ۱۸۸]

بابائے اُردو کے ایک قدیم رفیقِ کار مولانا سیّد عطا حسین کی ایک تحریر سے بھی والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت کے بارے میں بشیر احمد کے بیان کی تائید اور توثیق ہوتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں مولوی عبدالحق کو چالیس سال سے جانتا ہوں (جوہر ص ۳۲)۔ مولوی عبدالحق والد کا اِس قدر ادب کرتے تھے جس قدر کہ اب سے دو نسل پہلے ہندوستان کے شریف خاندانوں کے ممتاز لوگ کیا کرتے تھے۔ ان کی محبت اور اطاعت اور خدمت گزاری میں اُنھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ والدہ مرحومہ کے ساتھ جہاں تک میں نے سُنا، اُن کا ادب اور اُن کی محبت اور اطاعت اور خدمت گزاری اس سے بھی کچھ بڑھ کر تھی۔"

[مولانا سید عطا حسین، رسالہ جوہر، دہلی عبدالحق نمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۸]

ہاپوڑ کے بشیر احمد قریشی شہادت دیتے ہیں کہ:

"مولوی (عبدالحق) صاحب کی شادی محض والدہ کے اصرار سے ہوئی تھی، حالانکہ مولوی صاحب کی مرضی بالکل نہ تھی اور شادی کے ہی دن

وہ گھر سے فرار بھی ہو گئے تھے۔ شادی کے معاملے میں دونوں بھائی
یکساں طبیعت رکھتے تھے۔ ضیاء الحق صاحب کو بھی شادی سے بڑی
نفرت تھی، اسی لیے اُن کی شادی بہت عمر میں ہوئی۔ اُن کی شادی بھی
والدہ کے اصرار پر ہوئی۔
مولوی (عبدالحق) صاحب کی شادی کا بھی قصہ اسی طرح کا ہے میری
والدہ کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہاپوڑ میں ایک معزز خاندان
کی لڑکی سے اُن کی والدہ نے طے کر دی جبکہ مولوی صاحب کا بالکل
ارادہ نہ تھا۔ مگر وہ والدہ کی بات کو اُس وقت نہ ٹال سکے اور مجبور ہو گئے،
لیکن شادی ہی کے دن گھر سے فرار ہو گئے۔ کئی سال تک اُن کی بیوی
بیٹھی رہیں، پھر مولوی صاحب نے والدین کے انتقال کے بعد ایک
عزیز کو اُن کے مہر کا روپیہ ادا کر کے طلاق دے دی۔ اِس مطلقہ خاتون
کی شادی بعد میں ممتاز حسن صاحب (ہاپوڑی) سے ہو گئی۔۔''
[بشیر احمد کی بات چیت شمیم احمد سے، قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۶۳ء ص ۱۸۸]

''شادی و غم زمانے میں توام ہے'' کے مصداق۔ اب یہاں سے حسن اتفاق اور
سوئے اتفاق کا ایک طویل اور تھکا دینے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے:
ستمبر ۱۹۸۷ء میرا اُردو میں خواتین لیکچرار کی ایک انتخابی کمیٹی میں جانا ہوا۔ سیٹیں
کم تھیں اور اُمیدوار خواتین بہت زیادہ۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی جب انٹرویو میں ایک بچی
ناصرہ شمیم نے بتایا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی حیات اور خدمات کے موضوع سے اُسے
خاص دل چسپی ہے۔ بابائے اُردو کی عائلی زندگی کے بارے میں ناصرہ شمیم کی گفتگو کو میں نے

بالخصوص بہت معلومات افزاء پایا۔ اور رابطہ رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔

میں نے ناصرہ شمیم کو اپنی کتاب ''ذکرِ عبدالحق'' بھیجی اور درخواست کی کہ بابائے اُردو کی ابتدائی خانگی زندگی کے بارے میں اُن قریبی اور قیمتی مآخذ کی بنیاد پر، جو اُن کی دسترس میں تھے، مجھے ضروری معلومات فراہم کریں۔ مدتوں انتظار رہا۔ اُن کی جانب سے یکسر خاموشی! پھر ایک خوشگوار صبح مجھے کالج کے پتے پر اُن کا ۱۵۔ اپریل ۱۹۸۸ء کا خط ملا، جس نے مجھے حد درجہ شاد و شادکام کیا۔

ناصرہ شمیم نے اپنے خط میں بابائے اُردو کی شادی کے موضوع پر جو اطلاعات فراہم کیں اور مولوی عبدالحق کے دوسرے اقرباء کی نام بنام جو تفصیلات عطا کیں وہ بے حد قیمتی تھیں۔ ''تھیں'' اس لیے کہتا ہوں کہ یہیں سے خرابیء قسمت یا سوئے اتفاق کے مضمحل کر دینے والے سانحے یا سلسلے سے دوچار ہونا پڑا۔

''شادی و غم زمانے میں توام ہے۔'' ناصرہ شمیم کا یہ خط میرے کاغذوں میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا اور صد ہزار کوشش اور تلاش کے باوجود یہ مجھے نہ ملا۔ اُن کا گھر کا پتہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ خط کا مضمون اور خلاصہ تو ذہن میں رہا لیکن خط کے متن سے محرومی نے مجھے حد درجہ بے کیف کیا اور کوئی چودہ برس بے بس اور بے چین رکھا۔

''چودہ برس'' بعد حُسنِ اتفاق سے پچھلے دنوں عزیزہ ناصرہ شمیم کا ۱۹۸۸ء کا لکھا ہوا خط مجھے رسالہ جوہر، دہلی کے عبدالحق نمبر مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں رکھا ہوا مل گیا۔ بابائے اُردو میرا پہلا عشق تھے حالات اور حادثات مجھے اپنے اس محبوب موضوع سے دور لے گئے۔ کہنا یہ ہے کہ بابائے اُردو کے احوال و آثار کے ادنیٰ طالب علم کے طور پر میں ناصرہ شمیم کے اس خط کو اپنے مشمولات کے اعتبار سے بہت اہم خیال کرتا ہوں، اس لیے اسے یہاں درج اور محفوظ کرتا ہوں۔ وہ لکھتی ہیں:

۱۵۔ اپریل ۱۹۸۸ء

گرامی قدر جناب پروفیسر سیّد معین الرحمٰن صاحب، السّلام علیکم

اُمید ہے کہ آپ اور تمام اہل خانہ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا نوازش

نامہ اور خوب صورت قیمتی کتاب کا تحفہ گھر کے پتے پر ملا۔ بہت مسرت
ہوئی، بے حد شکریہ۔ جواب تحریر کرنے میں اس لیے تاخیر ہوئی کہ
میں (بنوں کے ایک گرلز کالج میں) ایڈ ہاک لیکچرار ہوں۔ چھٹیوں میں
گھر گئی تو خط موصول ہوا۔

میں آپ کو معلومات بھیج رہی ہوں، اگر مزید معلومات کی ضرورت ہو تو
لکھیے گا..... تاحال ایڈ ہاک کی تلوار سر پر ہے اور مُستقل ہونے کے آثار
نظر نہیں آتے۔ میری ذاتی لائبریری میں ''ذکرِ عبدالحق'' ہے لیکن ''نقد
عبدالحق'' ابھی تک پڑھنے سے محروم ہوں۔ جنابہ زہرا معین صاحبہ کی
کتاب یونیورسٹی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

کبھی آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لایئے گا۔ خط ملتے ہی رسید
ضرور بھیجیے گا تاکہ اطمینان ہو کہ خط مل گیا ہے۔ آپ کو اور زہرا صاحبہ کو
بہت سلام۔

خدا حافظ، خیراندیش

ناصرہ شمیم

اپنے اس خط کے ساتھ عزیزہ ناصرہ شمیم نے بابائے اُردو کی خانگی زندگی کے بارے
میں جو قیمتی اطلاعات فراہم کی ہیں وہ اُن کے حوالے اور شکریے کے ساتھ اُردو ادب کے خوش
ذوق قارئین اور بابائے اُردو کے مداحوں کی نذر کرتا ہوں:

مولوی عبدالحق کے والد کا نام شیخ علی حُسین تھا۔ بابائے اُردو کی بہن فاطمہ بیگم کی
شادی، ہاپوڑ کے ایک خوش حال گھرانے میں مولوی محمد الیاس کے بیٹے محمد حسن سے ہوئی۔
مولوی محمد الیاس کی دو بیٹیاں ذکرالنساء اور جعفرالنساء تھیں۔ مولوی عبدالحق کی والدہ لطیفن بیگم،
ذکرالنساء کا رشتہ لے کر مولوی محمد الیاس کے گھر گئیں۔ مولوی محمد الیاس ادلے بدلے کی شادی
کے سخت خلاف تھے لیکن اپنی بیوی کے مجبور کرنے پر رشتہ قبول کرلیا۔

مولوی عبدالحق صاحب دکن میں مقیم تھے اور اُنہیں رشتہ طے ہونے کی کوئی اطلاع

نہیں تھی، جب وہ ہاپوڑ آئے تو اُن کی والدہ نے رشتے کے متعلق بتایا جس سے وہ بہت ناراض ہوئے اور شادی سے انکار کر دیا، اور والدہ کو قائل کرنے کوشش کی کہ وہ کسی کی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتے لیکن والدہ کے اصرار پر وہ والدہ کا حکم نہ ٹال سکے اور شادی ہو گئی۔ یہ غالباً ۱۸۹۵ء۔ سے ۱۹۰۰ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔ جس دن شادی ہوئی، اسی دن اپنی والدہ کو طلاق نامہ تھما کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ والدہ نے طلاق نامہ ذکر النساء عرف ذکری بیگم سے چھپا لیا۔ ذکر النساء کچھ دنوں بعد اپنے والدین کے گھر ''محل'' میں واپس آ گئیں۔ ''محل'' کو ذکر النساء کے نانا مولوی محمد حسین نے جو جج اور صدر الصدور کے عہدوں پر فائز رہے، ہاپوڑ میں تعمیر کرایا تھا۔

ذکر النساء چودہ (۱۴) سال گھر بیٹھی رہیں۔ اس دوران میں مولوی ممتاز احمد جو ہاپوڑ کے رئیس اور میونسپل بورڈ کے ممبر تھے، اور بابائے اُردو کے قریبی دوستوں میں سے تھے، بابائے اُردو کے پاس گئے اور ذکر النساء کا حال بیان کیا۔ بابائے اُردو نے نہایت افسوس کیا اور اپنے حالات اور مجبوریوں سے مولوی ممتاز احمد کو آگاہ کیا۔

بابائے اُردو نے دوبارہ طلاق کے کاغذ تیار کیے اور مہر کی رقم پانچ صد روپے ادا کی۔ مولوی ممتاز احمد کی پہلی بیوی فردوسی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابائے اُردو نے مولوی ممتاز احمد سے کہا کہ آپ ذکر النساء سے شادی کر لیں اور اس طرح مولوی ممتاز احمد نے ذکر النساء سے شادی کی اور اُن کے تین بچے ہوئے جن میں آمنہ بیگم بقید حیات ہیں۔

عزیزہ ناصرہ شمیم، ذکر النساء کے دوسرے شوہر جناب ممتاز احمد کی بیٹی آمنہ بیگم سے ملی ہیں۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی اُنہوں نے خاصی معلومات اکٹھی کیں۔ اُن کی فراہم کردہ اطلاعات کا ایک ماخذ بابائے اُردو کے ماموں محمد صدّیق کے بیٹے جناب سُلطان احمد قریشی بھی ہیں۔ ناصرہ شمیم کے بقول سلطان احمد قریشی صاحب ریٹائرڈ سی ایس پی آفیسر ہیں۔ اُن کی پرورش خود بابائے اُردو کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ سب ماخذ بڑے قریبی اور بے حد مُصدقہ ہیں۔

ناصرہ شمیم نے اپنے چچا کے حوالے سے، بابائے اُردو کا شجرۂ نسب بھی فراہم کیا ہے

جس کی تفصیل یہ ہے:

(بابائے اُردو)
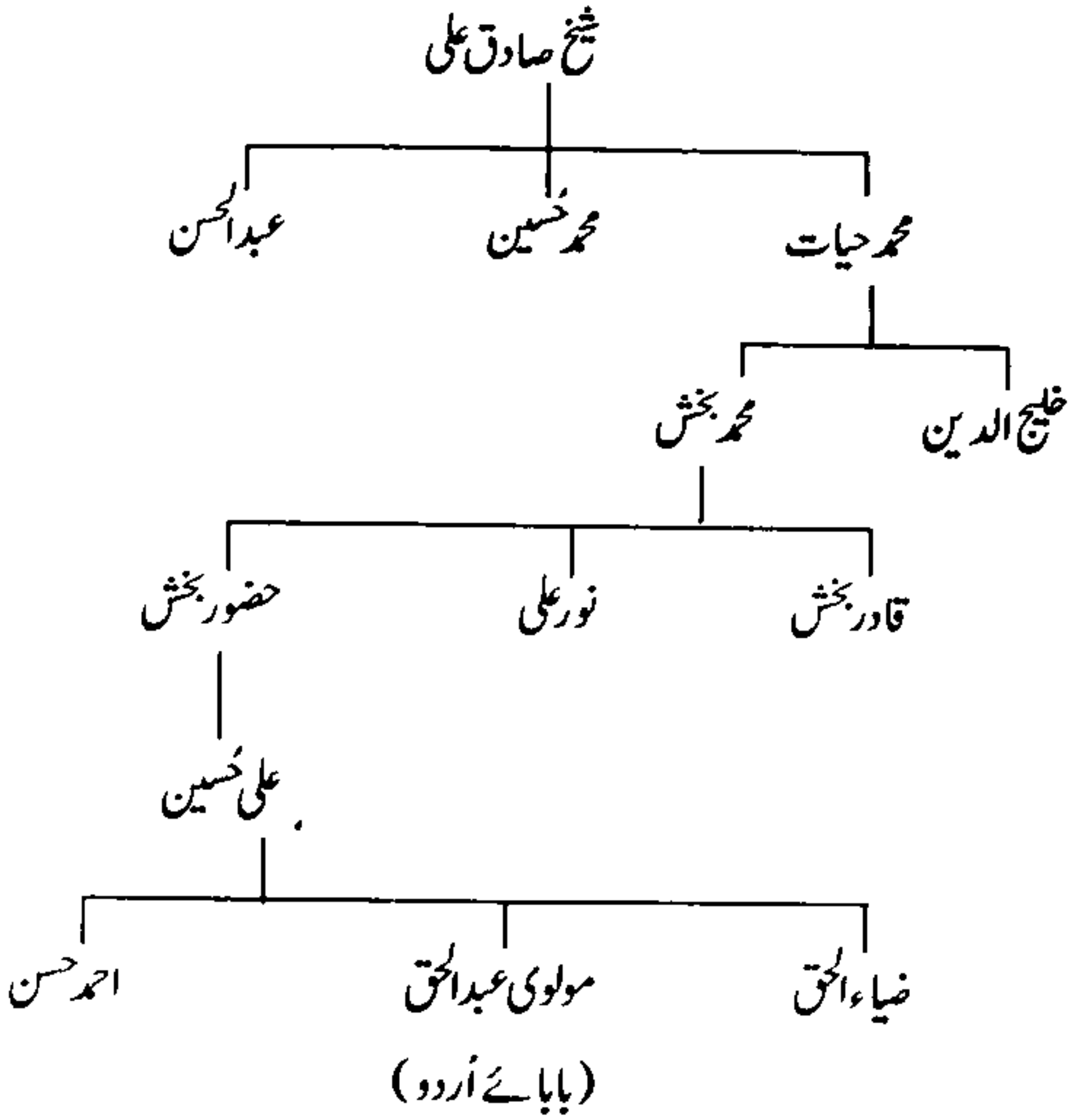
میں عزیزہ ناصرہ شمیم سے اَزسرِنو رابطے کے لیے کوشاں ہوں۔ میرے استفسارات کے جواب اور بعض دستاویزات کے حصول کی صورت میں، اس موضوع پر کسی اگلی فرصت میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے لیکن سرِ دست ''موجود اور حاضر'' مال اور مواد کو محفوظ اور عام کر دینا میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔

اس موضوع کا ایک دوسرا رخ بھی تحقیق طلب ہے کہ مولوی عبدالحق عمر بھر شادی نہ کرانے پر حد درجہ بضد اور مُصر اور اس سے بیزار اور نفور کیوں رہے؟ میں، اس بارے میں، اپنے طور پر تلاش و تحقیق کی روشنی میں ایک سمتی مفروضے پر پہنچا ہوں۔ لیکن اس سمتی مفروضے (Directional Hypothesis) کو رتبۂ اعتبار دینے کے لیے جن ضروری اور بنیادی دستاویزی یا عینی شہادتوں کی ضرورت ہے، اُس میں ابھی مجھے پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اس

لیے نظرِ بظاہر اور بشرطِ حیات ''کچھ مزید'' پھر کبھی۔ خدا توفیقاتِ مزید سے نوازے۔

یہاں ''تحقیق اور موضوعِ تحقیق'' کے بارے میں خود اپنی ایک پرانی تحریر کی طرف دھیان جاتا ہے جس کا اس موقع پر اعادہ بے محل نہ ہوگا:

''تحقیق کا عمل مچھلی کا شکار کرنے سے مشابہ ہے۔ کنڈی ڈال کر ہمیں بیٹھ رہنا ہے۔ صبر، ضبط، انتظار۔ اس میں حسنِ اتفاق، یا تائیدِ ایزدی کو بھی دخل ہے۔ کب، کہاں اور ناگہاں بہت کچھ ہاتھ آ جائے اور کب ہم تا دیر خالی ہاتھ رہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کیل کانٹے سے لیس، ہمیں یہ بہر حال دیکھنا ہوگا کہ صحیح جولان گاہ ہے کہاں؟ یا کہاں ہو سکتی ہے۔ پانی اُتھلا ہے، آلودہ ہے، پُرسکون نہیں یا نمکین ہے، یا میٹھا کس رخ ہے؟ بعد کے سارے مراحل خود ہماری محنت، نظر، خبر، مزاجی مُناسبت اور مقدر کا حاصل ہوں گے۔''

بابائے اُردو مولوی عبدالحق:

ضرورت مندوں کی مدد کر کے وہ خوش ہوتے تھے اور سب سے زیادہ خیال اپنے شاگردوں کا رکھتے تھے۔ کسی شاگرد کی شیروانی پھٹ گئی ہے، مولوی صاحب نئی شیروانی کا انتظام کر رہے ہیں۔ سائیکل ٹوٹ گئی ہے۔ مولوی صاحب اس کے لیے سائیکل منگوا رہے ہیں۔ کسی کے گھر سے منی آرڈر نہیں آیا۔ کوئی فکر نہیں مولوی صاحب کی تنخواہ تو موجود ہے۔

ایک بار شاگردوں کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر خشک میوے بھی موجود تھے بہتوں نے میووں سے جیبیں بھر لیں۔ سنجیدہ اور شرمیلے طالب علم اس حرکت سے باز رہے۔ مہمان رخصت ہونے لگے تو حکم ہوا جن کی جیبوں میں میوے بھرے ہیں وہ ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور خالی جیب والے دوسری طرف۔ جن کی جیبیں بھری ہوئی تھیں شرم سے ان کے سر جھک گئے مگر شامت ان کی آئی جن کی جیبیں خالی تھیں۔ فرمایا: نالائقو، تمھیں یہ خیال نہ آیا کہ تمھارے سوا میرا ہے کون، جو انھیں ٹھکانے لگائے گا۔ چلو اپنی اپنی جیبیں بھرو۔ یہ تھا اپنے شاگردوں کے لیے مولوی صاحب کی شفقت کا حال!

—— پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن نقوی

بابائے اُردو کا مقصدِ حیات

انجمن ترقی اُردو پنجاب کے زیر اہتمام جمعرات ۷۔ دسمبر ۱۹۸۹ء کی سہ پہر قائداعظم لائبریری' باغ جناح لاہور کے ہال میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی یاد میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت' انجمن ترقی اُردو پاکستان کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی۔ اس تقریب میں مجھے بابائے اُردو کے مقصدِ حیات کے بارے میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ یہاں اس بات چیت کے ابتدائی کلمات محفوظ کیے جا رہے ہیں۔

[سید معین الرحمٰن]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق میرا پہلا ادبی عشق اور میرا پہلا موضوع تھے۔ میری اور اُن کی عمر میں بہتر برس کا فرق اور فاصلہ تھا۔ مجھے ان کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ان کی خدمت میں حاضری کا اور کسی قدر خدمت کا موقع ملا۔

یہ تیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں نے بابائے اُردو کے قائم کردہ ادارے اُردو کالج' کراچی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ کالج کی عمارت کے ایک حصے کی بالائی منزل ہی میں بابائے اُردو کا قیام تھا۔

اُردو کالج کراچی نے بابائے اُردو کی سترویں سالگرہ منانے کا اہتمام کیا اور بابائے اُردو کی ادبی خدمات کے موضوع پر ملک بھر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات کے درمیان مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان کیا۔ اس مقابلے میں میری متعلمانہ کوشش انعام کی مستحق ٹھہری' کس قدر قابلِ لحاظ' یہ میرا ادبی اور تنقیدی نوعیت کا پہلا مضمون تھا۔ پھر مجھے ''برگ گل'' کے بابائے اُردو نمبر کی ترتیب و ادارت کی عزت بھی حاصل ہوئی اور مولوی صاحب کی خدمت میں بار بار کی حاضری کی سعادت کے مواقع عام ہوئے۔

اوائل عمر میں جو ایک سبق مجھے مولوی صاحب سے ملا اور جو مجھے ہمیشہ یاد رہا' وہ تھا: ''باتیں کم' کام زیادہ۔'' باتیں بنانا مجھے کبھی نہ آیا' اور کام' اپنی بساط کے مطابق میں نے کیا' اگرچہ اس کی طرف سے مطمئن کبھی نہیں ہو پایا۔

''بابائے اُردو .... احوال و افکار'' کے نام سے میری پہلی کتاب' اب سے ۲۵ برس پہلے ''انجمن'' نے شائع کی پھر ترمیم اور اضافے کے بعد یہ کتاب یہاں لاہور

سے ۱۹۷۶ء میں چھپی' کتاب کی تیسری اشاعت اب سے دس برس پہلے ۱۹۷۹ء میں دہلی سے عمل میں آئی ...... اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

بابائے اُردو کے بارے میں میری تین اور کتابیں : ''نقد عبدالحق'' (۱۹۶۸ء) ......''ذکر عبدالحق'' (۱۹۷۵ء) اور ''فرمودات عبدالحق'' (۱۹۷۸ء) لاہور میں شائع ہوئیں اور ان کتابوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکلے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ بابائے اُردو میرا پہلا ادبی عشق اور موضوع تھے۔ ان کو ہم سے جدا ہوئے ۲۸ برس ہو چلے۔ شوق اور ضرورتیں مجھے دوسرے موضوعات کی طرف لے گئیں لیکن مولوی صاحب کی یادوں اور ان کے اثرات سے میں نے اپنے آپ کو کبھی بے نیاز نہیں پایا۔

اپنی ذات کے حوالے سے ان تمہیدی کلمات اور اس پس منظر کا ایک جواز ہے۔ ایسی کوئی تقریب جو مولوی صاحب کے حوالے سے ہو' اس میں حاضری کو میں اپنی پہلی ترجیح اور ذمہ داری خیال کرتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے قیام کے ایک سو پچیسویں جشن سالگرہ کی مناسبت سے آج کالج کے بخاری آڈیٹوریم میں بڑے پیمانے پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کالج میں سوسائٹیز بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے اس تقریب کے ایک منتظم اور میزبان کے طور پر میری موجودگی ضروری تھی۔ لیکن کسی ایسی تقریب میں جو بابائے اردو کی ذات سے منسوب ہو اور کسی ایسی تقریب میں شرکت' جس کی دعوت ڈاکٹر وحید قریشی کی جانب سے ہو اور جو قائداعظم لائبریری کے خوشگوار اور باوقار ماحول میں ہو ...... اور ان سب پر مستزاد ایسی تقریب جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر کی زیر صدارت منعقد ہو' شریک ہونا بڑے اعزاز اور عزت کی بات ہے اور میں نے اس سے محروم ہونا گوارا نہیں کیا ...... اگرچہ تا آخر (یعنی چائے تک اگر یہاں یہ آج پروگرام میں شامل ہے) میں شاید نہ ٹھہر سکوں۔

میں نے ابھی ''صدر انجمن'' کے عالی رتبہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ ''صدر انجمن'' ہونا ایک معنی رکھتا ہے اور ایک بڑی تاریخ بھی۔

دسمبر ۱۹۰۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سے جس کے صدر ہز ہائی نیس آغا خاں تھے' دہلی میں اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے چار ذیلی شعبے قائم کیے:

ایک : مدارس کا۔

دوسرا: اصلاح تمدن کا۔

تیسرا: تعلیم نسواں کا' اور

چوتھا: اردو کا۔

"اردو" کا یہ آخری ذیلی شعبہ' انجمن ترقی اردو کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سیکرٹری مولانا شبلی قرار پائے۔

انجمن کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ' گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد تھے' جہاں علامہ اقبال نے ان سے اکتساب کیا' خود آرنلڈ نے بھی اقبال سے فیض پایا اور ان سے عربی پڑھی ...... خیر' تو انجمن کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ ...... بعد کے صدور میں :

نواب عماد الملک' نواب مسعود جنگ' سرراس مسعود' سر تیج بہادر سپرو' سر شیخ عبدالقادر' دتا تریہ کیفی' خود بابائے اُردو' گورنر اختر حسین' قدرت اللہ شہاب اور جناب نور الحسن جعفری۔

جناب نور الحسن جعفری کا آج' لاہور کی اس تقریب میں ہونا اور آج کی اس تقریب کی صدارت کرنا ہمارے لئے دل کشا ہے اور ایک معنیٰ تکریم رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق متفقہ طور پر بڑی شخصیت کے مالک تھے اور "بڑی شخصیت کی مشکل یہ ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جا سکتا"۔ بابائے اردو کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور اس قدر رنگا رنگ ہیں کہ ایک مضمون یا کسی ایک نشست میں ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں یہاں اختصار کے ساتھ مولوی عبدالحق کے مقصد حیات کے بارے میں جو

ان کی زندگی کے ہر دور میں ایک ہی رہا' خود مولوی عبدالحق کی ایک بات کی جانب اشارہ کرکے اجازت چاہوں گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میری زندگی کا مقصد' صرف دنیا میں ایک ہی ہے' وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور وہ علمی زبان بن جائے ...... آئندہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ اہل ملک کو "آزادی" ملے گی (خدا کرے کہ وہ زمانہ جلد آئے)۔ (آزادی یا) حکومت کی کوئی صورت بھی ہوئی خواہ ملک امریکہ کی طرح مختلف ریاستوں میں تقسیم ہوا یا ایک انتظام (وفاق) کے تحت میں رہا' زبان کا سوال ناگزیر ہے۔ ہمیں ابھی سے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

(۸ نومبر ۱۹۲۰ء بنام ڈاکٹر انصاری)

مولوی عبدالحق کے یہ کلمات' قیام پاکستان سے ۲۷ برس پہلے کے ہیں لیکن یہ ان کی سوجھ بوجھ' معاملہ فہمی' دیدہ وری اور پیش قیاسی کے امین اور ان کے مقصد حیات کے منہ بولتے مظہر ہیں۔

علامہ اقبال کا مولوی عبدالحق کو یہ لکھنا بالکل بجا تھا کہ:

"آپ کی تحریک' اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں' جس کی ابتدا سر سید احمد نے کی تھی۔"

قیام پاکستان کے بعد اردو کو بوجوہ اس کا صحیح منصب دینے میں بعض مصلحتیں اور کمزوریاں حائل رہیں۔ مولوی عبدالحق کو اس سے بڑی اذیت ہوئی۔ انتقال سے ایک برس پہلے انہوں نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے جو اپیل شائع کی وہ بے حد حزنیہ اور رقت آمیز ہے اور ہمارے نوجوانوں کو اسے پڑھنا اور اپنی ذمہ داری کو جاننا چاہیے۔

۱۹۶۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر نے کہا تھا کہ:

"خیرہ ذوقی اور اغراض جوشی کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں مولانا عبدالحق جیسے کسی فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا

ہے۔"

لیکن خود مولوی عبدالحق کے بقول تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں جب دل بجھ گئے ہوں، سکوت اور سناٹے کا عالم ہو:

"ایسے باہمت جوان مرد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں۔"

(لاہور، ۷ دسمبر ۱۹۸۹ء)

انجمن ترقی اردو پاکستان
قائم شدہ ۱۹۰۳ء

شمار ....

تاریخ ۱۹ء

اردو روڈ۔ کراچی ۱

ٹیلیفون
صدر دفتر: ۲۳۲۴۸۳
اردو کالج: ۲۳۰۱۹۱
انجمن پریس: ۴۰۳۱۱

[illegible]

بزمِ حق:

۷۔ بابائے اُردو اور نواب معشوق یار جنگ ۱۲۵

۸۔ بابائے اُردو اور پروفیسر محمود احمد خاں ۱۴۱

۹۔ بابائے اردو اور پروفیسر حمید احمد خاں ۱۵۱

۱۰۔ بابائے اُردو اور مسٹر ایس۔ اے رحمن ۱۶۷

۱۱۔ بابائے اُردو اور حکیم اسرار احمد کریوی ۱۷۹

کتاب میں بھی ''بزمِ حق'' کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ اس بزم کے پانچوں سوار، افسوس کہ اب ہم میں نہیں، لیکن بابائے اُردو کے بارے میں اُن کے بیانات، تخمینے اور تجزیے بابائے اُردو کے مزاج اور اُن کی افتادِ طبع کو سمجھنے کے لئے بالذات دائمی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس سے قطع نظر بابائے اُردو کے ان ہم جلیسوں کی سحر آگیں باتوں میں اپنائیت اور محبت کی جو خوشبو اور مہک رچی بسی ہے۔ وہ بجائے خود بھی ایک کشش اور حُسن رکھتی ہے۔

ـــــ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

بابائے اُردو اور نواب معشوق یار جنگ

[مکالمہ کراچی یکم اگست ۱۹۶۴ء]

یکم اگست ۱۹۶۴ء کو نواب معشوق یار جنگ سے بابائے اُردو کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ مسودہ صاف کر کے میں ۴۔ اگست ۱۹۶۴ء کو نواب صاحب کی خدمت میں باردگر باریاب ہوا کہ احتیاطاً وہ اسے دیکھ لیں تاکہ کسی غلطی کی راہ پا جانے کا امکان نہ رہے۔

اس روز میری فرمائش پر انہوں نے اپنے مختصر حالات اور کوائف بھی اپنے قلم سے تحریر فرما کر عطا کیے جس کا عکس محفوظ کیا جا رہا ہے۔ "وفیاتِ مشاہیر پاکستان" (مطبوعہ: مقتدرہ اسلام آباد ۱۹۹۰ء) کے مولف پروفیسر محمد اسلم کے مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں نواب معشوق یار جنگ کا انتقال ہوا۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

نواب معشوق حسین یار جنگ بہادر، بابائے اُردو کے رفقائے قدیم میں سے ہیں۔ بابائے اُردو سے آپ کی ملاقات ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور یہ ایسی ہوئی کہ پھر عمر بھر کا ساتھ ہوگیا۔ آپ کے والد ماجد خان بہادر عنایت حسین خاں۔ سرکار انگریزی کی ملازمت میں ڈپٹی کلکٹر اور ریاست بھوپال میں وزیر عدالت تھے۔ نواب صاحب ۱۸۸۰ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ گلبرگہ شریف کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ پھر سر علی امام۔ صدر اعظم ریاست حیدرآباد کے ایما پر ضلع بیڑ میں ڈپٹی کمشنر کے منصب پر ترقی پا گئے۔ یہاں سے آپ کا تبادلہ رائچور ہوا اور پھر وہاں سے گلبرگہ شریف گئے۔ یہاں دو سال کار سرکار انجام دینے کے بعد آپ کا تقرر بلدۂ حیدرآباد یونیو سکریٹریٹ میں شریک معتمد مال (جوائنٹ سیکرٹری) کے طور پر ہوگیا۔ وہاں سے آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور واپسی پر ۱۹۲۷ء میں ناظم عطیات (انعام کمشنر) کی خدمت تفویض ہوئی۔ اسی عہدے سے ۱۹۲۸ء میں وظیفۂ حُسن خدمت پایا اور اب کراچی میں خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نواب صاحب نے متعدد کتابیں تالیف و ترجمہ فرمائیں۔ تصوف سے خاص شغف ہے۔ پہلی صدی سے آٹھویں صدی ہجری کے متصوفین پر آپ کی تالیف لطیف "اخبار الصالحین" اس موضوع پر بڑی مستند خیال کی جاتی ہے۔ اس میں سوانح کے علاوہ کلمات طیبہ کو بھی بڑی کاوش اور صحت کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔

نواب صاحب حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ سر راس مسعود، مولینا وحید الدین سلیم پانی پتی اور عبد الحلیم شرر کے ہم صحبت رہے ہیں۔ بابائے اُردو سے آپ کے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔

انجمن ترقی اُردو، پاکستان کی جانب سے یکم اگست ۱۹۶۴ء کو نواب صاحب سے انٹرویو لیا گیا۔ بتقاضائے احتیاط انٹرویو ترتیب دینے کے بعد موصوف کو دکھا لیا گیا ہے۔ اس طرح اب اس گفتگو میں واقعات اسمار اور سنین وغیرہ کی غلطی کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

— سیّد مُعین الرّحمٰن

۱۱ بجے کے قریب میں طے شدہ پروگرام کے مطابق بابائے اُردو سے متعلق ایک غیر رسمی انٹرویو کے لیے نواب معشوق یار جنگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف غالباً میرے منتظر ہی تھے۔ چھوٹے سے جدید طرز کے روشن ڈرائنگ روم میں نشست دیتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا:

"میں لکھاؤں یا آپ کچھ پوچھیں گے؟"

میں کچھ پوچھنے کے لیے تو حاضر ہوا ہی تھا، پوچھنا ہی تھا اس لیے میں نے اوّل اُسے لکھ لینا غنیمت خیال کیا جسے از خود نواب صاحب لکھانے کی پیش کش فرما رہے تھے۔:

— مولوی صاحب کا عجیب طریقہ تھا۔ وُہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ نئے گریجویٹس کو اپنے قریب آنے کا موقع دیتے اور انھیں اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وُہ ان کے ذوق کی تربیت اور تعمیر کر سکیں۔ ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ سے بی اے کر کے واپس حیدر آباد پہنچا تو پہلے تو مولوی صاحب سے پہلی بار نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی صاحب ان دنوں مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس تھے۔"

نواب صاحب ذرا کی ذرا رکے اور ماضی کو اپنے ذہن میں اچھی طرح اُجال کر پھر گویا ہوئے:

کالج سے ہم خام نکلتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ کہ گویا سب کچھ ہو گئے۔ میرا حال اس سے

ذرا مختلف نہ تھا۔ مولوی صاحب کی صحبت نصیب ہوئی تو پتہ چلا کہ کس قدر تہی مایہ اور خام ہیں۔ اس احساس کی بیداری پر مولوی صاحب کی ترتیب صحیح نے پرش کا کام کیا۔ میرا ہی نہیں مولوی صاحب کے ساتھ رہ کر بہت سے نوجوانوں کا یہ حال ہوا انھیں راہ مل گئی۔"

میں نے اس ذیل میں کچھ اسماء دریافت کرنے چاہیے تو جواباً نواب صاحب نے مولانا سید ہاشمی فرید آبادی اور جناب اختر حسین رائے پوری کا نام لیتے ہوئے فرمایا :

"یہ مولوی صاحب ہی کے صحبت یافتہ ہیں۔ اُن کے ہاں ذوق صحیح کی نمو مولوی صاحب ہی کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب چھوٹوں پر شفقت تو فرماتے ہی تھے۔ ان سے بے تکلف بھی ہو جاتے۔ اُن میں گھل مل کر رہتے۔ بے جا پندار نہ فرماتے اور تفوق تو ذرا بھی نہ جتاتے۔ طالب علموں میں تب ہی تو وہ بہت مقبول رہے۔ طالب علم انھیں گھیرے رہتے اور مولوی صاحب خود ان میں بالکل بچہ بنے رہتے۔ اور باتوں ہی باتوں میں انھیں کام کی باتیں تعلیم کرتے رہتے۔ میرے ایک چھوٹے بھائی لطافت حسین خان کا رجحان میڈیشن کی طرف تھا۔ تب علی گڑھ میں بیالوجی نہیں تھی۔ وہ انٹر کر کے میرے پاس حیدر آباد دکن آ گئے۔ یہاں میں نے طب کے بعض ہشیار اساتذہ سے ان کی تعلیم کا انتظام کرا دیا۔ انھیں لے کر میں مولوی صاحب کے پاس بھی گیا۔ مولوی صاحب نے بہت جلد لطافت کو اپنے آپ سے مانوس کر لیا۔"

نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ سامنے کے دریچے سے باہر دور کہیں نظریں گاڑے وہ شاید اُس وقت کو، اُن دنوں اور لمحوں کو دیکھ رہے تھے جو خواب ہو چکے۔ ہلکی بادامی رنگ کی صوفیانہ سی شیروانی کے پورے بٹن لگائے، کچھ خمیدہ سے وہ صوفے پر گم صم بیٹھے تھے اور میں سحر زدہ سا انھیں تک رہا تھا کہ ایکا ایکی وہ کھلکھلا پڑے۔ تب مجھ پر روشن ہوا کہ تبسم میں ایک خاص معصومیت، الوہیت، تازگی اور سرشاری صرف شیر خواروں کا حصّہ ہی نہیں! — از خود رفتگی کے سے عالم میں نواب صاحب جیسے اپنے آپ سے گویا تھے :

"۔ مدرسہ آصفیہ کے سامنے ڈھال پر مولوی صاحب لطافت کے ساتھ خوب ہی تو
لوٹا کرتے تھے ۔ ! "

اور میں یہ سن کر بدتمیزی سے ہنس دیا ۔ نواب صاحب چونک سے گئے اور معاً مجھے اپنی حرکت خفیفہ کا احساس ہو گیا ۔ اس دم مہکتے ماضی نے اپنا آنچل شاید لپیٹ لیا اور نواب صاحب پھر اسی کثیف دنیا میں چلے آئے اور میں نے سنا وہ فرمارہے تھے :

لطافت کا لگاؤ حالانکہ میڈیسن کی طرف تھا ۔ لیکن مولوی صاحب کی صحبت کا ان پر خوب خوب اثر ہوا ۔ ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور علمی مذاق ابھر آیا ۔ پھر لطافت انڈین میڈیکل سروس پاس کیا ۔ لیفٹننٹ کرنل ہوئے ۔ ۱۹۰۹ء میں وہ لندن سے واپس لوٹے تو مولوی صاحب نے ان سے فرمائش کر کے انجمن پر "دیباچہ الصحت" کے نام سے کتاب لکھوائی اور انجمن نے اسے شائع کیا ۔ ایک زمانہ تھا کہ معروف جرمن پروفیسر EBERS کے ایک ناول تھا بھی بہت غیر معمولی ۔ اس کی کہانی تین تہذیبی ادوار پر پھیلی ہوئی تھی انگریزی میں اس کے ترجمے کا نام "THE PRINCESS" تھا مولوی صاحب کے ایما پر لطافت نے اسے ایضاحی حواشی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ۔ مولوی صاحب نوجوان صالح دیکھ کر اسکی ٹریننگ کرتے تھے ۔ اس میں صحیح ذوق اور مذاق پیدا کر دیتے اور پھر اس کی حوصلہ افزائی کر کے اس کی مخفی قوتوں کو بیدار کرتے اور اس سے اچھے اچھے کام لیتے ۔ یہ ان کی خاص ادا تھی ۔ مجھ میں بھی لکھنے پڑھنے کا جو کچھ ذوق ہے مولوی صاحب ہی کا فیض اور عطیہ ہے ۔ ورنہ ایک ذمہ دار سرکاری ملازم ادب کی طرف کب متوجہ ہو سکتا ہے ! انجمن کے لیئے میں نے "مبادی سائنس" کے نام سے ایک کتاب ترجمہ کی اور "بجلی کا کرشمہ" کے نام سے ایک کتاب جو تالیف کی تو اسے بھی میں مولوی صاحب کی صحبت کے اثر ہی کی ایک یادگار خیال کرتا ہوں !"

نواب صاحب نے ذرا ٹھہر کر پھر بتانا شروع کیا :

"نومبر ۱۹۳۳ء میں لیفٹننٹ کرنل لطافت حسین خاں ناگپور میں انسپکٹر جیلز کے منصب پر فائز تھے کہ شہید کر دیئے گئے ۔ نواب صاحب اتنا کہہ کر چپ ہو گئے اور اس ذکر سے ان کے چہرے پر فسردگی نے جو سایہ ڈالا تو میں اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ قدرے

توقف کے بعد نواب صاحب پھر گویا ہوئے :

"مجھے آج بھی یاد ہے ۔ میں اپنے دفتر میں مصروف کار تھا کہ ناگپور سے اس سانحہ کا تار ملا تو گھبرا کر میں اوّل مولوی صاحب کے پاس ہی دوڑا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے طبیعت پر اس کا بہت اثر لیا ۔ وہ یہ خبر سن کر آبدیدہ ہو گئے تھے ۔ یہ ان کی محبت اور انسان دوستی پر دلالت کرتا ہے ۔"

نواب صاحب خاصی دیر خاموش رہے ۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ذہن میں واقعات کی کڑیاں ترتیب دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اس لیے میں بھی چُپ سادھے رہا ۔ آخر نواب صاحب نے کہنا شروع کیا :

"اُس زمانے میں جب مولوی صاحب نے طالب علمی کا دور ختم کر کے عملی زندگی اختیار کی وہ بہت خاموش خاموش رہا کرتے تھے ۔ لیکن ان میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ دبتے کسی سے نہیں تھے ۔ بہت دبنگ تھے ۔ سر افسر الملک مدرسہ آصفیہ کے صدر اور بانی تھے ۔ مولوی صاحب انھیں کے مدرسے میں رہتے ہوئے ان سے کبھی دب کر نہ رہے ۔ ایک دفعہ سر افسر الملک نے باقاعدہ وقت طے کر کے کسی ضرورت سے مولوی صاحب کو بلایا ۔ یکّے میں بیٹھ کر میں بھی مولوی صاحب کے ساتھ گیا ۔ راستے میں میں نے پوچھا "آپ کتنی دیر لگائیں گے ۔؟" فرمایا "بس ایک منٹ میں آیا ، دیکھو تو" میں حیران ہوا ۔ خیر ۔ یہ گئے ۔ سر افسر الملک نے آنے میں دیر کی اور یہ وہاں ایک مختصر پیغام چھوڑ کر اٹھ آئے کہ "مجھے اتنی فرصت نہیں کہ بیکار بیٹھ کر وقت ضائع کروں ۔" یہی رویہ مولوی صاحب کا گاندھی اور نہرو وغیرہ کے ساتھ رہا ۔ کسی سے بے جا وہ خائف ہوئے نہ مغلوب ۔ حیدر آباد میں مولوی صاحب کی قدر بھی خوب ہوئی ۔ ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں ۔ حیدر آباد میں ایک علمی و ادبی جلسہ ہوا ۔"

میں نے درمیان میں پوچھا "یہ اندازاً کب کی بات ہو گی ؟" نواب صاحب نے ذرا غور کے بعد فرمایا : سنہ تو مجھے صحیح یاد نہیں رہا ۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری تھے ۔ ان کی صدارت میں ہی جلسہ ہوا تھا ۔ مولوی صاحب نے اکبر بادشاہ

---

[1] مولوی عبدالحق کے مضمون کا عنوان تھا : "اکبر کی تمدنی اصلاحیں" یہ طویل مضمون حیدر آباد ینگ مینز ریڈنگ روم کے روبرو پڑھا گیا اور رسالہ "زمانہ" کانپور نومبر ۱۹۰۷ء ص ۲۶۱ تا ۲۹۰ میں شائع ہوا ۔ (سید معین الرحمٰن)

پر مضمون پڑھا۔ خوب داد ملی۔ خود مولوی عزیز مرزا صاحب نے فرمایا۔ میں بھی اکبر پر مضمون لکھ کر لایا تھا لیکن یہ مولوی صاحب کے پر مغز مضمون کے سامنے ہیچ ہے۔ میں اسے پھاڑ کر پھینکتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر داد اور قدر افزائی بھلا اور کیا ہو سکتی تھی؟ مولوی صاحب کو اُردو مخطوطات کی تلاش کا جنون تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُن کی فراہمی میں انھوں نے بہت محنت کی اور اس میں بہت کھکھیڑیں اُٹھائیں۔ میں ۲۷-۱۹۲۵ء میں رائچور میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں ایک گاؤں "اناہسور" میں مشائخین کے مزارات اقدس ہیں۔ جہاں مجھے اُردو کے نادر مخطوطات کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ مولوی صاحب کے ہم راہ میں نے بھی وہاں کا سفر کیا۔ مولوی صاحب کو یہاں بعض کارآمد کتابیں دستیاب ہوئیں۔ بیجاپور کے ایک معزز خاندان کے بانگی صاحب سے میں نے مولوی صاحب کی ملاقات کرا دی تھی ان صاحب کے توسط مولوی صاحب کو بہت سی کتابیں ملیں۔"

رائچور کے زمانہ قیام ہی میں میں نے مولوی صاحب کے اشارے ہمت افزائی اور مذاقِ صحیح کی رہنمائی میں موسیو رنیان کی کتاب "فلسفہ ابن رشد" کے نام سے ترجمہ کی۔ ۱۹۲۷ء میں میری تبدیلی گلبرگہ شریف ہوگئی۔ یہاں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے مزار اقدس پر مولوی صاحب قدیم اُردو کتب کی تلاش میں تشریف لائے اور بعض نادر نسخے فراہم کیے۔ ان دو ایک مواقع پر میری موجودگی سے اُنھیں جو قدرے آسانی میسر آئی، اسے اُنھوں نے بے وجہ ہمیشہ یاد رکھا۔ یہ بھی ان کی ایک وضع تھی۔"

نواب صاحب نے کچھ توقف کے بعد مولوی صاحب کی خوش مذاقی اور ظرافت کے ذیل میں ایک واقعہ بیان کیا۔ زمانہ وقوع یہاں بھی ان کے ذہن سے جاتا رہا تھا۔ اسے نواب صاحب نے اس طرح متعین کیا:

جس زمانے میں اورنگ آباد میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بڑے بھائی نواب رضا جنگ بہادر ڈپٹی کمشنر تھے۔ وزیر اعظم فرانس موسیو کلیمنسیو تشریف لائے۔ مولوی صاحب رابعہ درانی کے مقبرے کے قریب رہا کرتے تھے۔ موسیو، ایلورہ وغیرہ کے غار دیکھنے آئے تھے۔ کئی روز رہے میں اس زمانے میں "جالنے" میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ ہم سب ایلورہ دیکھنے ایک

ساتھ گئے۔ کئی روز لطفِ مجلس رہا۔ موسیلو کو مولوی صاحب سے بوجوہ بہت دل چسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مولوی صاحب بھی موسیلو سے بہت آزادی سے گفتگو کرنے لگے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب موسیلو کے سیکرٹری . . . کے ساتھ رابعہ کے مقبرے پر ٹہل رہے تھے کہ سیکرٹری نے فرانسیسی میں مولوی صاحب سے کچھ دریافت کیا مولوی صاحب کچھ نہ سمجھے اور بظاہر بغور سنا اور پھر کمال متانت سے اُنھوں نے خود ساختہ زبان میں "آواں بیواں شیوں شاں" ایسے بے ربط کلمات میں جواب دینا شروع کر دیا۔ سیکرٹری کئی زبانوں سے واقف تھا لیکن یہ زبان اور ہی تھی کہ نہ کبھی پڑھی اور نہ سنی سمجھ گیا کہ اس میں ضرور گڑبڑ ہے۔ قہقہہ مار کر مولوی صاحب سے لپٹ گیا اور مولوی صاحب بدستور بنے رہے۔ چہرے پر ذرا بھی تو مسکراہٹ نہ آنے دی۔ فرانسیسی خود بڑے خوش طبع ہوتے ہیں۔ سیکرٹری مولوی صاحب کی اس ظرافت سے خوب محظوظ ہوا۔ مولوی صاحب طبعاً خوش مذاق تھے لیکن پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحب کے مزاج میں شوخی اور زندہ دلی بہت کم ہوگئی تھی۔ میں ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سے بوجوہ آزردہ خاطر ہو کر اپنے لڑکے کے پاس کراچی آگیا تھا لیکن جلد ہی مولوی صاحب کے پاس اُٹھ آیا اور ایک کمرہ لے کر مولوی صاحب کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ اس زمانے میں مجھ سے مولوی صاحب نے آکسفورڈ ڈکشنری کے ترجمے کی نظرِ ثانی کا کام لیا۔ پھر کالج میں توسیع ہوئی اور انجمن کے دفاتر وغیرہ کے لئے گنجائش کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں از خود مولوی صاحب کے پاس سے چلا آیا لیکن مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر برابر ہوتا رہا۔

نواب صاحب نے ذرا رک کر پھر کہنا شروع کیا:

مولوی صاحب مستغنی طبیعت کے آدمی تھے حکومت نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن مدتوں انھیں اس کے اٹھانے میں تامل رہا وُہ خود پریشان ہو لیتے۔ لیکن اپنی پریشانی کو کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ پاکستان میں ان پر ایک وہ وقت بھی آیا کہ ایک اعتبار سے ان پر کڑی نگرانی ہونے لگی۔ ان کے ملنے جلنے والوں تک پر نظر رکھی جاتی۔ ایک صاحب

زاویے سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے۔ میں سب سوالغات کے باوجود گاہ گاہ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ اس زمانے میں وہ قیدِ تنہائی کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ملنے والا پہنچ جاتا تو بہت مسرور ہوتے انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے دانت میں تکلیف تھی اور وہ اسے نکلوانا چاہتے تھے۔ لیکن کوئی مددگار نہ تھا۔ مجھ سے ذکر کیا تو میں نے ہم راہ لے جا کر اپنے ایک عزیز سے جو نیول ہسپتال میں ڈینٹل ایکسپرٹ تھے ان کا دانت نکلوا دیا۔ اس عرصے میں بھی وہ صاحبزادے ہمارے ساتھ رہے انھیں تنہا مولوی صاحب کا میرے ساتھ جانا بھی شاید خلاف احتیاط نظر آیا۔ کہ مبادا میں خلوت میں مولوی صاحب کو کوئی پٹی پڑھا دوں ـــ وُہ ناداں کیا جانے کہ اس قسم کی سیاست سے میں ہمیشہ غیر متعلق رہا۔"

نواب صاحب نے پھر ذرا رک کر سانس لے کر کہنا شروع کیا :

آخر وُہ وقت بھی آپہنچا کہ مولوی صاحب مریض الموت میں مبتلا ہوئے۔ مجھے اس کی دیر سے اطلاع ملی۔ مزاج پُرسی کے لیے میں جناح ہسپتال ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہ جاتی۔ پیر دبانا چاہتا تو وہ کھینچ لیتے۔ خاموش بیٹھ کر چلا آتا ـــ اس بیماری نے اُنھیں بہت چڑچڑا کر دیا تھا۔ اور ہم کمبخت ان کے دوستوں نے ان کا ذرا خیال نہ کیا۔ ذرا بھی رواداری کا ثبوت نہ دیا۔ وہ بے خیال تکدر کا اظہار کر دیتے۔ اس کے سہنے میں ہمیں تامل ہوتا اور اس طرح ان کے احباب ٹوٹتے گئے۔ الحمدللہ مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی کہ میں اُن کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ اسی علالت کے دوران ایک روز ان کی یاد فرمائی پر حاضر ہوا تو فرمایا کہ" علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا چاہتا ہوں۔ صحیح یاد نہیں۔ غالباً پندرہ بیس ہزار روپے اُنھوں نے فرمایا کہ" مجھے علاج کے لیے درکار ہیں۔ اگر حکومت قرض حسنہ کا انتظام کر دے تو یہ رقم بعد میں میری حیدر آبادی پنشن سے وضع ہوتی رہے گی۔" مولوی صاحب نے صدر مملکت کے نام اسی مضمون کا ایک خط مجھے دیا کہ میں اسے اپنے داماد فائنانس منسٹر محمد شعیب کے ذریعے صدر مملکت کو بھجوا دوں۔ شعیب اتفاق سے ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے صدر ایوب کے نام مولوی صاحب کا خط ان کے حوالے کیا اور ان کے سامنے حیدر آباد کی شالیں

دے کر اس امر پر زور دیا کہ ایسے بڑے آدمی کے معالجے کو تو خود حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔ صدر مملکت نے سے پہلے ہی مولوی صاحب کے علاج کے لیے آمادہ ہو چکے تھے۔ شعیب کی ملاقات نے دو آتشے کا کام کیا اور از راہ معارف نوازی مولوی صاحب کو اپنے مہمان کے طور پر ملٹری کمبائنڈ ہسپتال علاج کے لیے بلوا لیا۔"

نواب صاحب نے جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا اور اب میری باری تھی۔ میں نے ان سے چند سوالوں کی اجازت لی۔ تب میرے ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے فرمایا۔

"مولوی صاحب اپنے والد کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ بالکل پرانے وقتوں کی سی ادا تھی یعنی ان کے سامنے بالکل سمٹ کر مؤدب ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے والد علی حسن صاحب بہت مذہبی آدمی تھے۔ مجھے کئی بار ان کے نیاز کی عزت حاصل ہوئی۔ وہ حیدر آباد میں آتے تو میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پھر میری مذہب پسندی کی وجہ سے وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے اکثر وہ مجھے نصیحتیں کیا کرتے تھے لیکن کسی خانگی بات کا انہوں نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ میں نے کبھی کچھ پوچھا۔ مولوی صاحب اپنے بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب کا بھی بہت لحاظ اور احترام کیا کرتے تھے۔ میری بھی ان سے ملاقات تھی لیکن سرسری، بس ایک دو بار کی۔"

میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا:

"تجرد پسندانہ زندگی کی نعمتوں یا متاہلانہ زندگی کی برکتوں کا بھی کوئی ذکر مولوی صاحب نے مجھ سے نہیں کیا۔ بلکہ کسی سے بھی نہیں کیا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی ہو گئی تھی۔ لڑکی والوں نے بعض پرانی رسموں کی انجام دہی پر اصرار کیا تو مولوی صاحب بدک گئے اور وہاں سے بمبئی بھاگ آئے۔ یہاں سے کچھ دنوں بعد حیدر آباد چلے گئے۔ بعد میں سنا طلاق ہو گیا تھا۔"

نواب صاحب بات کہہ کر ذرا ٹھٹکے اور فرمایا:

"یہ میں کوئی شہادت نہیں دے رہا۔ یہ سماعی بات ہے۔ میں نے جیسے سنا، آپ کو بتا دیا۔ اب صحیح صورت کیا تھی اللہ جانے!"

میں نے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک سوال کیا تو نواب صاحب نے فرمایا :

"مولوی صاحب کو بے دین کہا جاتا ہے ۔ ایسا نہیں تھا ۔ مولینا شاہ عبدالوحید قادری مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ " اس شخص کا ایمان بڑا پختہ ہے ایسا پختہ ایمان تو میں نے کم کسی کا دیکھا ہے " مولوی صاحب بچپن میں بڑے نمازی تھے لیکن جب ذرا ہوش سنبھال کر اُنھوں نے مولویوں کے کردار اور افعال کو دیکھا تو وُہ "مولویت" سے باغی ہو گئے ۔ لیکن صحیح اور سچے مولویوں سے اُنھیں تب بھی اُنس رہا ۔ نبی کریم صلعم سے اُنھیں بے حد محبت اور عقیدت تھی لیکن اس کا اظہار عام طور پر کسی کے سامنے نہیں کرتے تھے ۔ مولوی صاحب اولیاءاللہ سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے ۔ بیجاپور میں اُردو مخطوطوں کے لیے مارے مارے پھرنے پر جو ہاتھ لگے انھیں بہ غور پڑھا ۔ تو اندازہ ہوا کہ یہ دین کا صحیح راستہ بتانے والے بزرگ تھے ۔ اس بات نے مولوی صاحب کی طبیعت پر اثر کیا اور اولیائے کرام کی محبت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی ۔ بیدم شاہ وارثی سے بھی مولوی صاحب کی ملاقات تھی ۔ وارثی صاحب اچھی نثر اور نظم لکھتے تھے ۔ مولوی صاحب وارثی صاحب کی نظم کو بہت پسند کرتے ۔ یہی اسرار دونوں میں تعلق کا باعث بن گیا تھا ۔ مولوی صاحب سخت عقیدہ تھے ۔ علمائے ظاہر سے انھیں بے عقیدگی تھی رسوم و روایات کو جنھیں اصل احکام مذہب سے زیادہ اہمیت دے لی گئی تھی ۔ وُہ ذرا خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ یوں وہ بہت کھرے باطن کے شخص تھے ۔ اپنے باطن کا انھوں نے کسی سے انکشاف نہیں کیا "

معتقدات کے ذیل میں میرے ایک ضمنی سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :

"یہ صحیح نہیں کہ مولوی صاحب وہابی العقیدہ تھے ۔ وُہ پکے سنّی تھے ۔ اہل تشیع حضرات سے تعصب تو نہ تھا لیکن وُہ اُنھیں بھٹکا ہوا ضرور سمجھتے تھے ، اہل تشیع حضرات میں صرف نواب سراج یار جنگ اور نواب عماد الملک سے ان کے تعلقات تھے اور یہ بھی صرف علمی مذاق کی ہم آہنگی کی وجہ سے ۔ خود یہ دونوں بزرگ متعصب نہیں تھے ۔ نواب عماد الملک سے تو مولوی صاحب خوردانہ ملتے ۔ اور ان کا بہت ادب کرتے تھے اس مرحلے پر بہت بچ بچا کر میں نے نواب صاحب سے کچھ اس قسم کا سوال کیا کہ مولوی صاحب ایک عام شخص کے لیے

پیکرِ علم، غرض ہنر میں بے باک لیکن کسی حد تک ضدی ۔ اکھڑ اور تنگ مزاج تھے۔ کیا آپ نے اُنھیں نج میں بھی ایسا ہی پایا اور نہیں تو کیا وہ دوہری زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ نواب صاحب نے میرے اس سوال پر خاصی برہمی کا اظہار فرمایا ۔

دُہری زندگی سے آپ کی مراد منافقت ہے ناں ؟ لاحول ولاقوۃ !

مولوی صاحب منافقت سے حد درجہ متنفر اور منقبض ہوتے ۔ وُہ اس لعنت سے بہت دور تھے ۔ کوئی منافق ان کی مجلس میں بار تک نہیں پا سکتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اُنھیں اس کا علم اور احساس ہو جائے ۔ پھر وہ منافق کو ذرا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے ۔ وہ اثر پذیر ہوتے تو اخلاق اور محبت سے اور اسی کی قدر کرتے اور اسے بہت سی باتوں پر افضل ٹھہراتے ۔ میرے اور ان کے مابین تعلق کی بنیاد خلوص اور مودت ہی تھی ۔ ورنہ ایک تو میری اور ان کی ملاقات کم رہتی ۔ پھر میں شعبۂ مالگزاری کا ایک ملازم ، ادب سے ربط ضبط واجبی ہی سا تھا لیں ! وہ خود بڑے مخلص تھے ۔ سچے اور صاف گو تھے اور حق کہنے میں بہت بے باک ۔ وُہ متاثر ہوتے تو کسی شخص کے اخلاص سے ۔ حالی سے ان کی عقیدت کا راز یہی ہے۔ حالی سے ان کے ایسے مراسم تھے جیسے بیٹے کے باپ سے اور کسی مرشد کے اپنے پیر سے ہوں۔

میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :

ضیاء الدین اور حافظ ولایت اللہ وغیرہ مولوی صاحب کے ہم جماعت تھے۔ مولوی صاحب کے سیشن میں حافظ ولایت اللہ نے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ مولوی صاحب کے ایک اور ہم جماعت مولانا حمید الدین فراحی شبلی کے عزیز تھے ۔ انھیں عربی زبان اور علم القرآن پر بے حد قدرت تھی ۔ مولوی صاحب کے ان سے بہت مراسم تھے۔ مولوی صاحب ان کی قدرت کرتے تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں کی صلاحیتوں کے بھی مولوی صاحب معترف تھے لیکن وُہ اُنھیں پُرگو ناظم سمجھتے تھے ۔ مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی سے ان کے بے تکلفانہ اور گہرے مراسم تھے ۔ سر راس مسعود سے تو انھیں بے حد محبت تھی راس مسعود ان کے بہت منہ چڑھے اور لاڈلے تھے ۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو سناؤں ۔ :

مسعود حیدر آباد سے دلی یا علی گڑھ جا رہے تھے ۔ مولوی صاحب انھیں الوداع کہنے

اسٹیشن پر آئے۔ مسعود اُنھیں اپنے کمپارٹمنٹ میں لے گئے۔ گاڑی نے وسل دیا۔
مولوی صاحب نے اترنا چاہا تو مسعود نے اُنھیں پکڑ لیا۔ اترنے نہ دیا۔ گاڑی چلی تو
مسعود نے مولوی صاحب کو تنگ کرنا شروع کیا " اب ٹکٹ کلکٹر آیا اور آپ کو پکڑا۔
بے ٹکٹ اور وُہ بھی فرسٹ کلاس میں۔ جو چلے تو دیکھئے۔ المختصر یہ کہ مسعود نے مولوی صاحب
کو بہت بنایا۔ یہاں تک کہ اُنھیں اوپر برتھ پر جا لٹایا کہ نہیں تو کوئی آن دھر پکا پھر جہاں
کوئی بڑا اسٹیشن آتا مسعود مچاتے کہ " آیا آیا ٹکٹ کلکٹر! اور مولوی صاحب واقعی دبک
سے جاتے۔ یہاں تک کہ آخری اسٹیشن آیا۔ نہ کسی نے پکڑا یا اور مولوی صاحب کو
کو اسٹیشن سے صاف نکال لے گئے۔
ایک اور سوال کے جواب میں نواب نے فرمایا۔
دَوروں میں میرا ان کا ساتھ کم رہا۔ بیجا پور اور جالنہ وغیرہ کے سفر میں ضرور ساتھ تھا اور میں
نے محسوس کیا کہ سفر میں ان کے مزاج کا اعتدال جاتا نہیں تھا " سفر سوار تو نہیں ہونا تھا؟
سے غالباً آپ کا منشا یہی پوچھنا تھا۔ ؟" "
میرے اس سوال کے جواب میں کہ وُہ آب و نمک کا کیسا ذوق رکھتے تھے نواب صاحب فرمایا :
" کھانا مولوی صاحب اچھا کھاتے اس معاملے میں ان کا اصول یہ تھا کہ کھانا کم ہو لیکن
اچھا میسر نہیں ہوتا تو چٹنی روٹی سے پیٹ بھر لیتے کچھ شکوہ اور شکایت کسی سے
نہ کرتے۔"
ایک دوسرے سوال کے جواب میں نواب صاحب نے ایسے کسی واقعہ سے لاعلمی کا اظہار فرمایا
جس سے اہلِ علم کے مقابل صاحبانِ ثروت کی طرف مولوی صاحب کے جھکاؤ کا پتہ چلتا ہو۔
میرے ایک اور سوال کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا :
"مولوی صاحب سے میرے مخلصانہ تعلقات ضرور تھے۔ لیکن راز دارانہ نہیں، اس
لیے میں اس ادعا کے ساتھ کوئی بات آپ کو نہیں بتا سکتا کہ صرف میں ہی اس سے
واقف ہوں "
کیا حالی مولوی صاحب کی کمزوری تھے؟ میرے اس استفسار کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا۔

"حالی سے مولوی صاحب کو بڑی عقیدت تھی۔ معین صاحب اسے آپ کمزوری کہہ لیجئے میں تو اسے پختگی کہونگا۔ حالی کے خلاف وُہ کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔ جو حالی سے کبیدہ خاطر ہوتا، مولوی صاحب اس سے خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چند وہ شبلی کے کام کے قدر دان تھے لیکن طبیعت ان سے ملتی نہیں تھی۔"

نواب صاحب آپ آخر حیات تک مولوی صاحب کی خدمت میں باریاب رہے ہیں کوئی ایسی تفصیل آپ بتا سکیں گے جسے مولوی صاحب کی "خواہش ناتمام" کا درجہ دیا جا سکے؟ نواب صاحب نے جواباً فرمایا:

مولوی صاحب بہت زندہ دل تھے۔ دل زندہ ہو تو خواہش کبھی مرا مٹا نہیں کرتیں۔ بہرنوع میں اس ضمن میں کچھ تفصیل نہیں دے سکتا۔ ایک بات ہے آخری علالت کے دنوں میں انہیں اپنے پھیلائے ہوئے منصوبوں اور کاموں کے ادھورا رہ جانے کا غم کھائے جاتا تھا۔ اس لیے بیماری سے جس نے خود ان کو بقول انہیں کام کرنے سے روک دیا تھا پریشان تھے۔ کچھ ماحول کی ناسازگاری نے ان کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وُہ بہت بھولے اور فیاض تھے دنیا کے مکر و فریب سے واقف نہیں تھے اپنی شرافت نفس اور سادگی کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے ایسا قیاس کر لیتے تھے اور ہر شخص کی بات پر اعتماد کر بیٹھتے یہی ان کا بھولا پن تھا۔ خدا انکی مغفرت کرے! (قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء ص ۱۳۱-۱۳۹)

○

"نواب معشوق یار جنگ کا انٹرویو ("قومی زبان" کے) اس نمبر (اگست ۱۹۶۴ء) کی ایک خاص چیز ہے۔ معین الرحمٰن نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ نواب صاحب سے مولوی صاحب کے بارے میں جو کچھ پوچھا جا سکتا ہے، پوچھ لیا جائے۔"

(مقالہ: ۶۴ء کے ادبی رسائل کا جائزہ، ماہنامہ چراغِ راہ، کراچی، مارچ ۱۹۶۵ء)

بابائے اُردو اور پروفیسر محمود احمد خاں

[ولادت: ۱۸۹۳ء وفات: [illegible]]

[مکالمہ لاہور ۲۹۔نومبر ۱۹۶۵ء]

پروفیسر محمود احمد خان، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دیرینہ ہمدموں میں سے ہیں۔ وہ ان معدودے چند خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں بابائے اردو نے تاحینِ حیات بہت عزیز رکھا۔ میں نے بابائے اردو کے رفیق کار جناب حکیم اسرار احمد کریوی کی زبانی پروفیسر محمود احمد خان کا اتنا، اور کچھ اس طرح، ذکر سنا تھا کہ شمارِ شوق کا اندازہ نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ ان سے ملنے کے لیے میرا دل سخت آرزومند تھا۔ لاہور آئے ہوئے مجھے دو ماہ ہو چلے تھے۔ جہاں تہاں خان صاحب کی تلاش میں رہا، ٹیلیفون ڈائریکٹری میں خان صاحب کا پتا دیکھا۔ بعض احباب سے معلوم کیا۔ اسی فکر میں اک روز پروفیسر سید وقار عظیم سے بھی ذکر آیا۔ یہ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی۔ فرمایا "چاہیے تو آج ہی مل لیجیے۔ وہ سہ پہر کو ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی کی ہفتہ وار میٹنگ میں آرہے ہیں۔ ساتھ چلیے گا۔ مل لیجیے گا تفصیلی ملاقات کے لیے وقت لے لیجیے گا۔"

پروفیسر محمود احمد خان ۱۸۹۳ء میں پنجاب کے ایک انتہائی علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ پروفیسر حمید احمد خان کے بڑے اور مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی کیا۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ کیمیا میں اسسٹنٹ پروفیسر" کے منصب پر فائز ہوئے اور بعد میں انہیں کے لفظوں میں اس منصب کا لقب "ریڈر" ہو گیا۔ اڑھائی برس تک جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس خدمت سے رٹیائر ہوئے تو پاکستان تشریف لے آئے۔ یہاں "مجلس زبان دفتری" کی نظامت آپ کو تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ارشاد پر "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" کے لیے

متعدد تحقیقی مقالات لکھے ۔ نظرِ ثانی کی خدمت انجام دی "فرہنگ کلن" کے لیے نظرِ ثانی اور ترجمے کا کام کیا ۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے ادارۂ تالیف و ترجمہ سے وابستہ ہیں ۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے ۔۔۔۔ ادارۂ تالیف و ترجمہ کے دفتر ہی میں پروفیسر محمود احمد خان سے نیاز حاصل ہوا ۔ آدھ گھنٹے بعد میٹنگ شروع ہونے والی تھی ۔ اس لیے بہت مختصر اور سرسری نشست رہی اور میں بابائے اُردو کے بارے میں بہت کچھ جاننے ۔ سننے اور پوچھنے کا شوق لیے اُن سے رخصت ہوا ۔۔۔۔ بابائے اُردو سے خان صاحب کے تعلقات اور مراسم کی داستان زمانی اعتبار سے نصف صدی پر محیط ہے ۔ یہ داستان ابھی لکھی نہیں گئی ۔ خان صاحب کا حافظہ غضب ناک حد تک قابلِ رشک ہے ۔ ایک ایک پل کی تصویر ان کے ذہن پر نقش ہے ۔ کاش وہ یہ داستان قلم بند فرما دیں اور یا محفوظ کر سکے ۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ بابائے اُردو سے ابتدائی ملاقات کا کوئی نقش شاید آپ کے دل میں ہو ۔ پروفیسر محمود احمد خان نے فرمایا ۔

مولوی صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں ہوئی ۔ جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا اور میری عمر ہو گی کوئی پندرہ سولہ سال ۔ مولوی صاحب والد مرحوم و مغفور سراج الدین احمد صاحب بانی و مدیر "زمیندار" کے انتقال پر تعزیت کے لیے ہمارے آبائی گاؤں کرم آباد تشریف لائے ۔ یہ ہے پہلا نقش ۔۔۔۔۔۔ پھر ۱۹۱۳ء میں ایک بار مولوی صاحب علی گڑھ تشریف لائے ۔ میں وہاں تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا ۔ مجھے اطلاع ملی تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوا ، لیکن بس چند منٹ کے لیے مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا ۔"

ان ملاقاتوں کی کچھ تفصیل ۔۔۔۔ ؟ خان صاحب نے فرمایا :

"صرف ایک بات یاد ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی جب علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھا ۔ پوچھا :

کس جماعت میں ہو ؟ " میں نے بتایا ، کہا : شاباش "

اس ملاقات کی " تفصیل " یوں ایکا ایکی ختم ہوئی تو بات بڑھانے کے لیے میں نے عرض کیا

"مولوی صاحب کہیں ٹھہرے ہوں گے ؟ - خان صاحب نے زچ ہوئے بغیر جواب دیا :

"جی ہاں - مولوی صاحب عبدالکریم فاروقی کے ہاں ٹھہرے - یہ علی گڑھ کے کالجیئٹ اسکول میں ٹیچر تھے اور کبھی حیدرآباد میں رہ چکے تھے - وہاں مولوی صاحب سے نیاز حاصل ہوا - اب جو مولوی صاحب علی گڑھ آئے تو فاروقی صاحب ہی کے ہاں قیام کیا -"

مولوی صاحب سے آپ کی باقاعدہ ملاقات کا سلسلہ کب شروع ہوا - ؟ خان صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا :

"باقاعدہ ملاقات کے سلسلے کی عجیب داستاں ہے - ۱۹۱۵ء میں میرا تقرر مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ (اورینٹل ہائی اسکول) اورنگ آباد میں ہو گیا -"

یہاں ضمناً میں یہ پوچھ بیٹھا کہ اس ادارے میں کیا خدمت آپ کے سپرد ہوئی تھی ؟ - خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کچھ یوں فرمایا :

"آپ کو ٹھیک تردد ہوا اس ادارے کا ذریعہ تعلیم اردو تھا - مولوی اور منشی کے درجنوں کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی - ایک خصوصیت اس کی یہ تھی کہ منشی وغیرہ کے درجے میں بھی سائنس اور ریاضی کے مضامین لازمی تھے"

یہاں پہنچ کر خاں صاحب نے خوشدلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا :

اُمید ہے اس وضاحت کے بعد "اورینٹل اسکول" میں ایک سائنس گریجویٹ" کے تقرر پر آپ کا تردد جاتا رہا ہوگا -"

میں نے موضوع کی طرف متوجہ کیا تو خان صاحب نے سلسلہ کلام ماقبل سے مربوط کرتے ہوئے فرمایا :

"اس مدرسے میں میرا تقرر ہوا تو مولوی صاحب کا مستقر بھی اورنگ آباد تھا - وُہ مقبرہ رابعہ دورانی کے پاس ایک سرکاری کمرے میں چند کمرے زائد ، اپنی ضرورت کے لیے بنوا کر رہتے تھے - مجھے تقرر نامہ حیدرآباد ہی میں مل گیا تھا - اس کے مطابق میں اورنگ آباد پہنچا - مولوی صاحب ان دنوں معتمدِ تعلیمات

(انسپکٹر آف اسکولز) تھے اور دورے پر گئے ہوئے تھے۔ میں ان کی عدم موجودگی کے باوجود اُن کے ہاں فروکش ہوگیا۔ لیکن اِس طرح کہ قبضہ کرتے ہی لکھ دیا کہ آگیا ہوں اور آپ ہی کے ہاں قیام ہے۔" مولوی صاحب نے جواب دیا کہ "بہت خوشی ہوئی آپ آگئے ہیں، اطمینان سے رہیئے۔"

لیکن مولوی صاحب کے ہاں ٹھہرے چند روز ہوئے ہوں گے کہ اتنے میں الگ مکان کا انتظام ہوگیا۔ میں وہاں اُٹھ گیا۔ بعد میں مولوی صاحب دورے سے آئے تو ملاقات ہوئی اور ایسی ہوئی کہ پھر ہر ہفتے اُن سے ایک بار ملاقات ضرور ہو جاتی۔ میں اورنگ آباد میں چار سال رہا اور اِس پورے عرصے میں برابر مولوی صاحب سے نیاز حاصل کرتا رہا۔ ان کی عادات وخصائل کا میری زندگی پر بہت اثر ہوا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔"

میں نے اس کی تفصیل چاہی تو خان صاحب نے فرمایا:

"یہ تو بے معنی بات ہے۔ اس کی تفصیل میں پڑنے سے کیا حاصل۔ یہ تو میرا اشتہار بن جائے گا۔ میں اِسے پسند نہیں کرتا۔ پبلک کو آخر اس سے کیا فائدہ؟"

جی نہیں۔ یہ غالباً اِتنی اپنے اشتہار کی بات نہیں، جتنی مولوی صاحب کے اُفتادِ مزاج کے اظہار کی بات ہوگی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مولوی صاحب کے قدیم رفیق نواب معشوق یار جنگ صاحب نے اثنائے گفتگو میں ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ یہ اُن کی ایک خاص اَدا تھی وُہ ذرا کسی میں استعداد دیکھتے تو اسے اپنے قریب آنے کا موقع دیتے اپنے ساتھ کام میں لگاتے اِس طرح کہ اُس کی مخفی صلاحیتیں بروئے کار آئیں...... آپ مولوی صاحب سے بہت قریب رہے ہیں۔ یقیناً انہوں نے آپ کو چھوٹ نہیں دی ہوگی۔ مختلف کاموں میں لگایا اور الجھایا ہوگا.... خان صاحب نے فرمایا:

"میں اورنگ آباد میں چار سال رہا۔ اِسی دوران میں دارالترجمہ بنا

اور یہ ان کی کوششوں سے بنا۔ وہ اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ مجھ سے انھوں نے شروع ہی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً اسکول کی سائنس کی کتاب مہدی خان کوکب کی ترجمہ کی ہوئی نظرِ ثانی کے لیے مجھے دی۔ یہ مہدی خان کوکب ایک اعلیٰ عہدیدار ایرانی نژاد تھے۔ ان کی کتاب ہوگی کوئی سو، ڈیڑھ سو صفحات کی۔ میں نے نظرِ ثانی کی۔

۱۹۱۸ء کی بات ہے مولوی صاحب نے حسین بلگرامی مرحوم کے پچاس برس پہلے کے لکھے ہوئے ایک مضمون کا ترجمہ کرنے کے لیے مجھ سے فرمایا۔ ترجمہ کیا بہت پسند فرمایا۔ یہ ترجمہ کئی سال بعد "اردو" کے پہلے پرچے میں چھپا اور میرے نام کے حوالے کے بغیر۔ میرے پاس وہ ترجمہ اب بھی محفوظ ہے۔ اب جو پڑھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ میں نے اتنا اچھا ترجمہ کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم اور مولانا ہاشمی فریدآبادی نے بھی کہ میرے علی گڑھ کے ساتھی تھے (اب مرحوم ہوئے) اس ترجمے کو پسند کیا تھا۔"

آپ نے فرمایا: کہ آپ اورنگ آباد میں چار سال رہے۔ آیا اس کے بعد آپ وہاں سے چلے آئے؟

"جی ہاں، دراصل اُسی زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی میں نے اس کے لیے اپیلائی کیا اور اپنے اُس ترجمے کا حوالہ بھی دیا جس کا ابھی آپ سے ذکر کیا اور سچی بات ہے کہ تقرر میں اُس سے مدد ملی اس لیے کہ میں نے سنا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو انتخابی کمیٹی کے رُکن تھے اس ترجمے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کہا کہ جس کا یہ ترجمہ ہے، ہمیں اُس سے مدد ملے گی۔" میں اس جگہ پر لے لیا گیا اور حیدرآباد چلا آیا۔ دیکھیے تو بالواسطہ اس تقرر میں بھی مولوی صاحب کا تصرف شاملِ حال تھا۔۔۔۔"

کیا مولوی صاحب بھی کم و بیش اسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ نہیں ہو گئے تھے؟ ..... جواباً پروفیسر محمود احمد خان صاحب گویا ہوئے:

"جی اسی زمانے میں مولانا وحیدالدین سلیم کے بعد مولوی صاحب کئی برس جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ اُردو کے منصب پر فائز رہے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے سلسلے میں اُنہیں ۶۰۰/- روپے پنشن ملتی تھی۔ پروفیسری کے کُل۔ ۱۰۰۰/- روپے۔ یہ خلافِ قاعدہ تھا، لیکن سر حیدری، مولوی صاحب کے بہت قدردان تھے۔ اُن کے ایمار سے مولوی صاحب کو یہ مشاہرہ ملتا رہا..."

حیدرآباد میں بھی مولوی صاحب کے علمی مشاغل کا وہی عالم رہا۔ اس زمانے میں بھی آیا آپ کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا؟ ..... خان صاحب نے فرمایا:

مولوی صاحب کام کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں بھی وہ کام کرتے رہے۔ ایک علمی رسالہ "سائنس" نکالا اس رسالہ میں ہم سے کام لیا۔ میجر آفتاب اس رسالے کی مجلس ادارت میں تھے ...."

اس لمحے میں نے میجر آفتاب صاحب سے مولوی صاحب کی کشاکش کا ذکر کیا تو خان صاحب نے بلا تأمل فرمایا کہ:

"آفتاب صاحب، مولوی صاحب کے بڑے دوست تھے۔ پاکستان آکر اُن سے اخیر میں معلوم نہیں کیوں اختلاف پیدا ہو گیا .... میں نے مولوی صاحب کا لکھا ہوا "المیہ" دیکھا۔ یہ مجھے پسند نہیں آیا۔ میں مولوی صاحب کا بہت مدّاح ہوں۔ ان کی بے حد تعظیم کرتا ہوں لیکن بایں ہمہ میری رائے یہی ہے کہ وہ "المیہ" انہیں نہ لکھنا چاہیئے تھا۔ ان کی شان اس طرح کے کاموں سے بہت اَرفع و اعلیٰ تھی"

میں نے اس قضیئے کو یہیں چھوڑا اور خان صاحب سے پوچھا کہ رسالہ "سائنس" میں آپ نے مولوی صاحب سے کس طرح کا کام لیا؟ .... خان صاحب نے ذرا کی ذرا توقف

کیا اور پھر یوں گویا ہوئے:

"رسالہ "سائنس" میں مستقل عنوانات قائم کیے گئے تھے اور یہ عنوانات بعض اشخاص کے سپرد تھے۔ یہ اصحاب اپنے اپنے عنوانات کے تحت رسالے میں لکھا کرتے۔ دو عنوان "دلچسپ معلومات" اور "سائنس کی دُنیا" میرے سپرد تھے۔ مَیں انھیں دیکھتا اور اِن کے تحت لکھتا۔ بعض اچھے مضامین کا ترجمہ بھی مولوی صاحبؒ نے کرایا لیکن یہ سب کام اعزازی تھا اور صرف مولوی صاحب کی وجہ سے ہم خوشی خوشی اِس میں لگے رہتے۔"

اِس رسالے کے علاوہ کسی اور علمی منصوبے میں مولوی صاحب کے شریک رہے ہوں تو اس کی تفصیل...؟ خان صاحب نے فرمایا:

"تفصیل تو کیا۔ ویسے جامعہ عثمانیہ کے دورانِ قیام میں ایک اور اہم کام، اصطلاحات کی نظر ثانی کا ہوا۔ فزکس اور کیمسٹری کی اصطلاحات جو وہاں وضع ہوئیں اور یکجا کی گئیں، ایک کمیٹی اس پر نظر ثانی کرتی۔ اس کمیٹی میں چند آدمی تھے۔ مجھے بھی مولوی صاحب نے اس میں رکھا۔"

وضع اصطلاحات کی میٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ اس کے دوسرے ارکان آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجبوراً مجھے گفتگو کو سمیٹنا پڑا اور نگ آباد کے روز و شب کے بارے میں ... سار کے جواب میں خان صاحب نے فرمایا:

"اورنگ آباد میں جب مولوی صاحب تھے۔ انجمن کے کام میں زیادہ تقویت پیدا کی۔ دفتر بنایا۔ باقاعدہ کام کیا۔ کام بڑھا تو اسسٹنٹ رکھا۔ اورنگ آباد میں پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری سیّد سجّاد ہوئے اور سالہا سال تک کام سنبھالے رہے۔ دفتر کا کام سیّد غلام ربّانی بھی کرتے رہے۔ جو خود بھی اچھی اُردو لکھتے تھے۔ سیّد سجاد بعد میں جامعہ عثمانیہ میں اُردو لیکچرار ہو کر چلے گئے۔ لندن سے ڈاکٹریٹ بھی کیا اور جامعہ میں ریڈر ہو گئے۔ ان کے بعد مولوی صاحب نے عبدالحلیم شرر کے لڑکے صدیق کو لکھنؤ سے

بُلایا۔ یہ پریس کا کام کرتے تھے۔" اُردو" اور "سائنس" ان کے اہتمام میں چھپتے ۔"

میرے ایک سوال کے جواب میں خان صاحب نے فرمایا:

"مولوی صاحب بہت فیّاض تھے۔ طلبہ کے ساتھ بہت سُلوک کرتے تھے۔ ایک ہندو طالب علم کو جس میں گانے کے جوہر تھے وظیفہ دے کر موسیقی سیکھنے کے لیے پونا بھیجا۔ اچھے ذہین طلبہ سے تو وہ بہت محبّت کرتے تھے۔ جب مولوی صاحب حیدرآباد آ گئے تھے، اختر حسین رائے پوری ایک سال مولوی صاحب کے پاس رہے۔ عزیز احمد بھی مولوی صاحب کے پاس رہے۔ یہ اصحاب، مولوی صاحب کے فیضِ تربیت کے رہینِ منّت ہیں۔"

میرے ایک دوسرے سوال کے جواب میں خان صاحب نے قدرے سختی سے فرمایا کہ:

"میں شادی کے بارے میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ شادی کے بارے میں مجھے پتا ہے لیکن جسے مولوی صاحب نے راز رکھنا پسند فرمایا، مجھ سے اُس سلسلے میں کچھ نہ پُوچھیے، اسے (ROMANCE) ہی رہنے دیجیے۔"

اس موضوع پر میرا کوئی اِستدلال مسموع، گذارش کا کوئی انداز قبول اور کوشش کا کوئی طریق نتیجہ خیز نہ ہوا تو خان صاحب نے فرمایا کہ ایک لطیفہ سُن لیجیے اور اِس قصّے کو چھوڑ دیجیے:

"میری شادی ہونے سے ایک دو برس پہلے کی بات ہے ایک اینگلو انڈین لڑکی مولوی صاحب کو ملی۔ مولوی صاحب اُس سے مُتاثر ہوئے اور ایک روز ترنگ میں آ کر کہا کہ "اِس کی شادی کراؤ" احباب نے نام تجویز کرنا شروع کر دیئے۔ مولوی صاحب نے ہاشمی فرید آبادی سے کہا کہ " اور سب کو چھوڑ دو بھئی، محمود سے کراؤ۔" اس پر بڑی چہل

رہی اور مولوی صاحب لطفاً مدتوں اس واقعے کا ذکر کرتے رہے"۔
چلتے چلتے میں نے مراسلت کے بارے میں بھی سوال کر لیا۔ خان صاحب نے بتایا کہ :

"کبھی کبھی مولوی صاحب مجھے خط لکھا کرتے تھے لیکن ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد سے پاکستان آیا تو کچھ ساتھ نہیں لا سکا۔ بہت سے کاغذات تلف کرنے پڑے۔ اس طرح مولوی صاحب کے سب خط ضائع ہو گئے اور اب میرے پاس ان کا کوئی خط محفوظ اور موجود نہیں"۔

اُٹھتے اُٹھتے خاں صاحب نے فرمایا :

"مولوی صاحب عمر میں مجھ سے ۲۱، ۲۲ سال بڑے تھے۔ میں اُن کا بہت ادب کرتا تھا۔ اُن کی زندگی بالکل علمی تھی۔ نیاسی گفتگو بھی کرتے تھے۔ اظہارِ رائے میں بہت جری اور بے باک تھے۔ (He used to speak without mental reservation) خدا اُن کی مغفرت کرے"۔

پروفیسر محمود احمد خاں سے یہ ملاقات جیسا کہ ابتدا میں کہیں لکھ چکا ہوں نومبر ۱۹۶۵ء میں ہوئی لیکن اس کی رُوداد لکھنے کی توفیق آٹھ نو ماہ بعد جولائی ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہو۔۔۔ اصحابِ انجمن کا اصرار تھا کہ خان صاحب کی تصویر بھی بھیجی جائے۔ ادارہ تالیف و ترجمہ کی میٹنگ ۱۱ جولائی ۱۹۶۶ء ساڑھے چار بجے سہ پہر کو ہو رہی تھی۔ خان صاحب عادتاً پندرہ بیس منٹ پہلے تشریف لے آتے ہیں۔ میں نے اس موقع کو کافی خیال کرتے ہوئے اپنے ایک کرم فرما جناب اسلم عامر کو جو مضافات میں رہتے ہیں اور فنِ تصویر کشی میں درک رکھتے ہیں خصوصیت سے اس خدمت کے لئے لاہور آنے کی زحمت دی لیکن یہ سب اہتمام و انصرام خان صاحب کی اس وضع کی نذر ہو گیا "میں اپنا اشتہار دینا پسند نہیں کرتا"۔ اور یہ کہ "میری تصویر رسالے میں چھاپنے کی آخر تک کیا ہے"۔

(قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۲ - ۲۶۸)

بابائے اُردو اور پروفیسر حمید احمد خاں

[ولادت: لاہور، یکم نومبر ۱۹۰۳ء

وفات: لاہور، ۲۲۔ مارچ ۱۹۷۴ء]

[مکالمہ، لاہور جون ۱۹۶۵ء]

انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی کی جانب سے بابائے اُردو کی ذات گرامی سے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سے گفتگو کرنے کے لئے، مَیں مہاول نگر سے لاہور پہنچا تھا۔ یہ ۱۷ر جون ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں صبح سے کوشاں تھا کہ ملاقات کے لئے وقت لیا جا سکے۔ کئی بار اقامت گاہ اور یونیورسٹی میں ٹیلی فون پر رابطے کی ناکام کوشش کر کے مضمحل ہو چکا تھا کہ کہیں پانچ بجے کے قریب حمید احمد خاں صاحب سے بات ہو سکی اور جس محبت، اپنائیت اور شفقت سے اُنہوں نے گفتگو فرمائی اُس نے مجھے نئے سرے سے تازہ کار کر دیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں تعلیم اور تعلّم سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اُن کی ساری عمر درس و تدریس میں گزری ہے۔ ان کا شمار ملک کے اِنے گنے ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ پچھلے چھتیس سال سے وہ مختلف ادبی و فکری اور تعلیمی و تاریخی موضوعات پر فکر انگیز اور پُرمغز مقالات و مضامین لکھ رہے ہیں۔ وہ خوب گھومے پھرے بھی ہیں، اُنہوں نے دُنیا دیکھی ہے۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک وہ ہمہ جہتی مقاصد سے برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، ترکی، یونان، امریکہ، ملایا اور انڈونیشیا وغیرہ کی سیاحت کر چکے ہیں۔ خدا کی طرف سے انہیں فکرِ روشن عطا ہوئی ہے۔ سیاحت نے اس پر برش کا کام کیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۴ء میں جب وہ اسلامیہ کالج، لاہور میں شعبۂ انگریزی کے صدر تھے، کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کیا۔ دس سال شعبۂ انگریزی کے پروفیسر اور صدر رہنے کے

بعد ۱۹۵۸ء میں وہ اسلامیہ کالج، لاہور ہی کے پرنسپل ہو گئے اور اب اگست ۱۹۶۴ء سے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خان اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انہوں نے امریکن فرینڈز سروس انٹرنیشنل سیمنار کا افتتاح کیا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں وہ ایشین امریکن اسمبلی منعقدہ کوالالمپور میں شریک ہوئے اور گروپ چیئرمین کی باوقار خدمت انجام دی۔ جون ۱۹۶۴ء اور پھر امسال مارچ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایفرو ایشیائی اسلامی کانفرنسوں میں پاکستانی وفد کے قائد کے طور پر شرکت کی اور بڑی سرگرمی دکھائی۔ ان کی ہمہ جہت علمی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز عطا کیا گیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں بڑی دل نواز شخصیت کے مالک ہیں۔ طبعاً وہ بزرگوں کی اس نسل کی باقیات میں سے ہیں جو وضع نبھانا اور تہذیبی اقدار کو برتنا جزوِ ایمان جانتی ہے بایں ہمہ وہ جدت، اختراع اور اپچ کے دشمن نہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کے ورثہ دار ہیں لیکن جدید علوم و افکار اور ان کے فضائل سے مجتنب نہیں۔ وہ بے حد شائستہ اور شستہ ہیں اور اچھی سچی اور کام کی بات کو قبول کرنے اور پھر اسے چلن دینے میں بڑے جری ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے مضامین میں اردو کو اعلیٰ مدارج تک ذریعہ تعلیم کے بطور اختیار کرنے کی تحریک اور پنجاب یونیورسٹی میں عملاً اس کا نفاذ، ان کا یادگار اور سدا بہار کارنامہ ہے۔ وہ انگریزی کے استاد ہیں اور اردو کے سچے عاشق ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحقؒ سے انہیں بے انتہا ارادت ہے۔ وہ ایک اعتبار سے بابائے اردو ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور ان طالع وروں میں ہیں جنہیں بابائے اردو کی رفاقتِ کار کا موقع تو بے شک نہ ملا لیکن ان کی چشمِ نگراں ضرور میسر آئی۔

میں لاہور میں اجنبی نہیں تھا لیکن راہوں اور شاہراہوں سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھا۔ آٹھ بجے مجھے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ مغل پورہ سے (جہاں میرا قیام تھا) میں سات بجے

ہی میں وہاں بینٹ ہال پہنچا تو آٹھ بجا چاہتے تھے۔ حمید احمد خاں صاحب کام میں منہمک تھے مگر بڑے تپاک سے ملے، فرمایا:

"میں بچپن سے مولوی عبدالحق صاحب کے نام اور کام سے واقف ہوں مجھے اُن کے رفیقِ کار ہونے کی سعادت تو نصیب نہیں ہوئی تاہم میرا شمار قوم کے ان بے شمار افراد میں کیا جا سکتا ہے جنہیں بابائے اُردو کے جذبۂ ایثار و جہاد سے بے انتہا عقیدت تھی۔ مجھ پر اُن کی شفقت ہمیشہ رہی اور نیازمندی کا ربط اور رشتہ آخر دم تک قائم رہا۔"

آپ مولوی صاحب کے رفیقِ کار نہ رہے ہوں اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ میں مولوی صاحب سے متعلق کسی خاص بات کی کرید میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ مولوی صاحب سے آپ کے لحاظ اور نیاز کے رشتے کی داستان سُننے کا چسکا مجھے کشاں کشاں آپ کی خدمت میں لایا ہے۔ آپ کا حافظہ شاید ساتھ دے مولوی صاحب کا نام آپ نے پہلی بار کب سُنا؟"

حمید احمد خاں صاحب مسکرائے، لیکن مُسکرانا بقول شخصے کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہارِ طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی جما رہا:

"آپ بچپن سے مولوی صاحب کے نام سے واقف رہے ہیں۔ کوئی ایسا نقش کہ پہلا نقش کہہ سکیں جسے، آپ کے ذہن میں ضرور ہوگا۔" حمید احمد خاں صاحب کچھ دیر یادوں کا تعاقب کرنے کے بعد کچھ یوں گویا ہوئے:

"میرے علاتی برادرِ بزرگ مولانا ظفر علی خاں اور بابائے اُردو نے علی گڑھ میں سید احمد خاں مرحوم کے زیرِ سایہ ایک ہی زمانے میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں بھی دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے باہم وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں جب والد مرحوم و مغفور سراج الدین احمد خاں بانی و مدیر "زمیندار" کا انتقال ہوا تو مولانا ظفر علی خاں، حیدرآباد سے خارج البلد ہو کر واپس وطن پہنچ چکے تھے۔ میں اُس وقت چھ برس کا بچہ تھا لیکن

مجھے اطلاع ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اُس زمانے میں والد مرحوم کی وفات پر تعزیت کے لیے ہمارے گاؤں کرم آباد تشریف لائے تھے۔"

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ سیلیکشن بورڈ کے ارکان یا شاید تاریخ ادب اُردو پر مامور اصحاب نے آنا شروع کر دیا۔ غالباً کوئی میٹنگ تھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے معذرتاً مجھ سے فرمایا:

"اس ہنگامے میں کچھ نہ ہو سکے گا۔ آپ دوسرے کمرے میں تشریف رکھیے، میٹنگ سے فرصت ملے تو اطمینان کے ساتھ آپ سے باتیں ہوں گی"

اور ساتھ ہی اُنھوں نے اپنے سکریٹری اصغر احمد نثار صاحب کو کچھ اس طرح کی ہدایت کی کہ مجھے بٹھایا جائے۔ کچھ کھلایا پلایا جائے۔

وائس چانسلر روم میں میٹنگ کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران میں نثار صاحب مختلف النوع کاموں میں اُلجھے رہنے کے باوجود میری دل داری سے غافل نہیں ہوئے۔ میٹنگ کے بعد حمید احمد خاں صاحب نے یاد فرمایا، تعظیم دے کر بٹھایا، شرمسار کیا، اور اس پر بے حد افسوس کا اظہار فرمایا کہ مجھے کافی انتظار کرنا پڑا۔ خاصی دیر بیکار بیٹھے رہنا پڑا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں کہ بابائے اُردو سے پہلی ملاقات کیونکر ہوئی۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

"اپنے ہوش میں اُن کو پہلی بار دیکھنے کا شرف غالباً ۱۹۲۲ء کے اواخر میں حاصل ہوا۔ میں اُن دنوں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں ایف۔ اے کا طالب علم تھا اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک شام بابائے اُردو بھائی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ اُنھوں نے اپنا نام ظاہر نہ فرمایا مگر میں نے قافیے سے سمجھ لیا کہ مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ دراصل ہوا یوں کہ اُنھوں نے آتے ہی کہا "کیوں بھئی محمود کہاں ہیں، اور یہ تم اس وقت گھر کے اندر کیوں بیٹھے ہو؟ ہیں کتاب کا کیڑا"، یہ شام کا وقت تھا اور مولوی صاحب سیر کے عادی۔ ذرا

کی ذرا میں اِن نو وارد بزرگ کی باز پرس پر گھبرایا لیکن معاً اندازہ ہو گیا کہ "او ہو! یہ تو مولوی صاحب ہیں"

یہ تھا مولوی صاحب سے میرا پہلا سامنا!

میرے ایک اُلجھے ہوئے سوال کے جواب میں کہ بعد کی ملاقاتوں میں کوئی بات، جسے راز کہہ سکیں، یعنی کوئی واقعہ یا کسی واقعے کا عقب یا وہ مخصوص حالات جس کے تحت انہوں نے کوئی فیصلہ کیا ہو اور آپ اُس میں شریک یا اُس سے واقف رہے ہوں اور یا بعض اشخاص اور اداروں وغیرہ کے بارے میں آپ کے سامنے کبھی اظہارِ خیال کیا ہو تو اُس کی تفصیل؛ حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

"۱۹۳۶ء میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کا لیکچرار تھا مولوی صاحب سر سکندر حیات کی حکومت سے اُردو زبان کے بارے میں گفت و شنید کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ اُن کے قیامِ لاہور کے درمیان میں اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے یاد ہے کہ سر سکندر حیات کے نوجوان پارلیمنٹری سکریٹری نواب مشتاق احمد گورمانی سے اُردو کی سرکاری حیثیت کے بارے میں مولوی صاحب کی ایک لمبی گفتگو ہوئی اور میں بھی اس گفتگو کے دوران میں موجود تھا۔"

حمید احمد خاں صاحب نے قدرے توقف سے فرمایا اور پھر کچھ یوں گویا ہوئے:

"ایک واقعہ مجھے اور یاد آتا ہے غالباً ۱۹۳۶ء ہی کا ذکر ہے مولوی صاحب انجمن ترقی اُردو کو حیدر آباد سے منتقل کرنے کا خیال کر رہے تھے، شاید اسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو مَیں نے گذارش کی کہ انجمن کو لاہور لے آیئے۔ مولوی صاحب کو اِس میں تامل تھا اور جب ایک محفل میں میرے دوست ڈاکٹر تاثیر مرحوم، مولوی صاحب سے کسی قدر رد و قدح سے پیش آئے تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ مَیں اِسی وجہ سے لاہور آنے کا فیصلہ کرنے میں متامل ہوں۔ میں نے بعض دوسرے صاحبوں کی

طرف اشارہ کیا جو اس محفل میں موجود تھے کہ انھوں نے اس بحث میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ مولوی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ لائی کرگس کے قانون کے مطابق اُن لوگوں کے لیے تازیانے کی سزا ہے جو ایسے وقت سکوت اختیار کریں جب سچی بات کہنے کا موقع ہو۔

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا:

"اس کے بعد مولوی صاحب سے کب کب اور کہاں کہاں ملاقات کے مواقع ملے اس کے بیان میں حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک میرا قیام دلّی میں رہا اور اس دوران میں مولوی صاحب اور سیّد ہاشمی فرید آبادی صاحب دونوں انجمن کے دفتر کی دریا گنج والی عمارت میں مقیم تھے۔ یہاں بارہا مولوی صاحب کی خدمت میں باریابی ہوتی رہی۔ جو بات خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب تقریباً ہر ملاقات کو کھانا کھانے یا چائے پلانے کا موقع ضرور بنا لیتے تھے۔"

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے ارشاد فرمایا:

"جلسوں وغیرہ میں مجھے مولوی صاحب کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا ہے بلکہ اینگلو عربک کالج کے ایک جلسے میں مولوی صاحب کی زیرِصدارت میں نے ایک ادبی مقالہ بھی پڑھا اور مولوی صاحب نے اسے رسالہ "اردو" میں چھاپنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ افسوس ہے کہ میں ان دنوں اس مقالے کو اشاعت کے قابل بنانے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ وہ جلسے میں حتی الوسع وقت پر پہنچنے کی کوشش فرماتے اور جلسے کی غایت اور نوعیت کا پورا پورا خیال رکھتے۔"

بابائے اُردو سے اپنی ملاقاتوں کے ضمن میں حمید احمد خاں صاحب نے ایک تقریب کا کچھ یوں ذکر فرمایا:

"دسمبر ۱۹۵۸ء جنوری ۱۹۵۹ء میں مَیں نے مولوی صاحب سے یہ

درخواست کی کہ وہ اُردو کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لئے، جس کا اہتمام ہم لاہور میں کر رہے ہیں، لاہور تشریف لائیں۔ بالآخر فروری میں یہ کانفرنس ہوئی اور مولوی صاحب تشریف لائے۔ اِس سلسلے میں مولوی صاحب ایک تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اسلامیہ کالج لاہور میں بھی تشریف لائے جہاں میں نے "بزمِ فروغ اُردو" کی طرف سے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس کے متعلق تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی روداد رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ صرف یہ کہنا مناسب ہے کہ مولوی صاحب پر اس تقریب کے دوران میں رقت طاری ہوگئی اور سپاسنامے کے جواب میں اُنہوں نے جو تقریر کی اُس کا آغاز، اُن کی طرف سے ایسی گلوگیر آواز میں ہوا کہ حاضرین میں سے کوئی بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہا۔"

۱۹۵۹ء کے بعد چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی ہی میں رہے۔ آپ سے مراسلت ہوئی ہو شاید؟ اور کراچی میں بھی کیا آپ میں بھی کیا آپ کی ان سے کوئی ملاقات ہوئی؟ حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں فرمایا:

"جی ہاں! آخری چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی میں رہے اور کبھی کبھی بذریعہ خط کسی خدمت کی تکمیل کے لئے یاد فرماتے رہے۔ جب میں کراچی جاتا تو انجمن کے دفتر میں مولوی صاحب کی ملاقات کو حاضر ہوتا۔ کراچی کی آخری ملاقات کی یہ کیفیت یاد ہے کہ مولوی صاحب نے کافی منگوائی اور ایک بڑے غیر معمولی گھیر کا بسکٹ کھلایا، خود بھی کھایا۔"

اس موقع پر ضمناً میں نے دریافت کیا کہ اِس دوران میں وہ کس نوع کی خدمات کی تکمیل کے لئے اِرشاد فرماتے رہے؟ حمید احمد خاں صاحب مُسکراتے ہوئے گویا ہوئے:

"یہ بڑی عام سی باتیں ہوتی تھیں، مثلاً: کسی صاحب کا تبادلہ کراچی سے لاہور ہوا تو وہ مولوی صاحب سے ایک تعارفی رقعہ لے کر میرے

پاس آئے۔ یا کسی صاحب نے لاہور سے مولوی صاحب کو لکھا کہ فلاں مقصد کے لئے پیغام بھیجئے یا فلاں مقصد کے لئے مجھے مالی امداد دیجئے تو مولوی صاحب کا خط میرے نام آگیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ بتائیے پیغام بھیجوں یا نہ بھیجوں، مالی امداد دوں یا نہ دوں؟"

میں نے حمید احمد خاں صاحب سے آخری ملاقات کی تفصیل جاننا چاہی تو وہ پژمردہ سے ہو گئے اور بہ کوشش سنبھلے ہوئے لہجے میں فرمانے لگے:

"معین صاحب! مولوی صاحب کے ساتھ میری آخری دو ملاقاتوں کی یاد دردناک ہے۔ یہ دونوں ملاقاتیں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ریل کے ڈبے میں ہوئیں۔

حکیم اسرار احمد صاحب نے مجھے خط لکھا کہ مولوی صاحب صدر ایوب خان کی دعوت پر معالجے کے لئے جاتے ہوئے فلاں وقت لاہور سے گزریں گے۔ اس ملاقات میں میرے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب اور حامد علی خاں صاحب دونوں شریک تھے۔ مولوی صاحب کی حالت غیر اطمینان بخش نہیں تھی۔ لیٹے لیٹے بھی وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی گفتگو میں شگفتگی، اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیتے رہے۔ مثلاً کوہ مری کے متعلق فرمایا کہ مقام بے صحت افزا اور نام پوچھیئے تو جواب ملتا ہے کہ "مری"۔ اس کے بعد مولوی صاحب کی ٹرین روانہ ہوئی تو ہم سب دل میں یہ اُمید لئے ہوئے واپس آئے کہ مولوی صاحب کا سرکاری اہتمام سے ہسپتال میں رہنا ضرور کوئی بہتر صورت پیدا کرے گا، لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

حکیم اسرار احمد صاحب کے خطوں سے مولوی صاحب کی صحت کے متعلق بدستور تشویشناک خبریں آتی رہیں تاآنکہ یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب علاج سے مایوس ہو کر واپس کراچی جا رہے ہیں۔"

حمید احمد خاں صاحب خاموش ہو گئے وہ بہت تھکے تھکے بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے تھے۔ خود میری طبیعت بھی اس احساس سے کہ میں اُن کے اضمحلال کا موجب ہوا ہوں، بوجھل ہو گئی۔ میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے ان کی آواز سنائی دی جیسے وہ کہیں بہت دور سے بول رہے ہوں۔ لرزاں لرزاں مدھم مدھم!

"مولوی صاحب سے آخری ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر پھر اُسی طرح ریل کے ڈبے میں ہوئی۔ اب مولوی صاحب کی حالت دگرگوں تھی۔ بے حد نحیف ہو چکے تھے۔ حکیم اسرار احمد صاحب مجھے پلیٹ فارم پر الگ لے گئے اور اشکبار آنکھوں سے کہنے لگے کہ اب مولوی صاحب کی زندگی کی اُمید باقی نہیں رہی۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب کبھی کبھی فرماتے ہیں "کسی پہلو چین نہیں آتا" جب میں مولوی صاحب سے ملا تو انہوں نے بہت نحیف آواز میں حکیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

"ان کو بتا دیا؟"

اس سے زیادہ مولوی صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔ اور حکیم صاحب نے تسلّی دی کہ میں نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہے۔"

حمید احمد خاں صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اس اشارے سے مراد یہ تھی کہ مولوی صاحب نے انجمن ترقی اُردو کی رکنیت سے متعلق اپنی چند خواہشات کا اظہار فرمایا تھا اور یہ چاہا تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد، کہ وہ بھی اب مرحوم ہیں اور میں انجمن کے ارکان میں شامل ہوں۔"

میں نے بدتمیزی سے ایک سوال اور کر ڈالا کہ آپ نے مولوی صاحب کے انتقال کی خبر کس طرح سُنی؟ حمید احمد خاں صاحب نے اس بے تُکے سوال کے جواب میں بڑے تحمّل سے فرمایا:

"لاہور ریلوے اسٹیشن پر جب مولوی صاحب کو خدا حافظ کہا تو دل
میں یہ یقین تھا کہ اب اس عالم اسباب میں پھر ملاقات نہ ہوگی۔ میری اپنی
صحت بھی اُن دنوں اچھی نہ تھی اور لاہور میں گرمی کی شدت اِس قدر زیادہ
تھی کہ میں خود دوسرے تیسرے دن چند روز کے لئے مری چلا گیا۔ مجھے
مری پہنچے دوسرا ہی دن تھا کہ میں شام کو گھومنے کے لئے نکلا اور ایک
بنگلے میں سے شام کی ریڈیو کی خبریں سڑک پر سُنائی دیں۔ اس طرح
مولوی صاحب کی وفات کی اطلاع ہوئی۔ باوجود اس کے کہ یہ خبر خلافِ توقع
نہ تھی دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اب مری میں قیام کا سوال ہی نہ تھا
طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ صبح میں نے رختِ سفر باندھا اور لاہور چلا آیا تاکہ
یہاں کے ماتمی جلسوں اور قرار دادوں میں شریک ہو سکوں۔"

اَب دبے دبے میں اُن خطوں کا طلب گار ہوا جو مختلف مواقع پر بابائے اُردو نے
انہیں لکھے۔ حمید احمد خاں صاحب نے بڑی خوش دلی سے فرمایا:

کل صبح آٹھ بجے بلکہ نہیں، آٹھ سے پہلے ہی تشریف لے آیئے،
خط لے لیجئے، اِس بہانے ایک مُلاقات آپ سے اور سہی!

مَیں سراپا نیاز، زیر بار رخصت ہوا۔ اگلی صبح حمید احمد خاں صاحب نے بابائے اُردو
کے مکاتیب مرحمت فرمائے، یہ تعداد میں چھ تھے۔ ان میں سے ایک خط جسٹس ایس اے
رحمٰن کے نام تھا۔ مَیں نے اِن خطوں کی نقل اُن کے پاس بیٹھ کر ہی کی۔ نقل نویسی
کے اس خُشک اور بیزار کُن کام میں بھی مَیں اُن کی عنایت اور توجہ سے متمتع ہوا یعنی
سیون اپ نے فریش اپ کیا۔ آخر آخر مَیں نے اُن سے سوانحی خاکے کی فرمائش کی تو انہوں
نے بے اختیار فرمایا:

"۱۹۰۳ء میں لاہور میں پیدا ہوا اور ارادہ بھی یہیں مرنے کا ہے۔
تاریخِ وفات کا پتہ نہیں۔"

ان کے سکریٹری اے۔ اے۔ نثار صاحب کی عنایت سے سوانحی خاکہ میسّر آگیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے انجمن اور اصحابِ انجمن کے بارے میں اخلاص اور محبّت آمیز جذبات اور کلمات کے ساتھ بڑی عزّت و منزلت سے رخصت کیا اور میں نے بڑی شدّت سے محسوس کیا کہ اخلاق و انکسار اور عجز و نیاز کی دولت کس قدر ناقابلِ تسخیر ہے اور انسان چاہے تو یہ کتنی آسانی سے ہاتھ آجانے والی بھی ہے لیکن خدا کے ایسے نیک نفس بندے ہیں بڑے خال خال جنہیں یہ نصیب ہوتی ہے — اور انسان ذرا سوچے اور غور کرے تو محض اسی ایک بات میں عبرت اور بصیرت کے بڑے سامان پوشیدہ ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے نام بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مکاتیب حمید احمد خاں صاحب کے دلی شکریے کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)

کراچی

۲۷۔ دسمبر / رجسٹرڈ[1]

عزیز مکرّم سلّمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا خط اور جناب ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب کا عنایت نامہ دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور دونوں کو میں نے ساتھ ساتھ پڑھا۔ میں حیران تھا کہ میں اب بھی اس عزّت کا مستحق سمجھا جاتا ہوں۔ شاید آپ نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک لاہور میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو قدیم تہذیب کے دل دادہ ہیں۔ ورنہ لاہور میں ایسے باکمال حضرات موجود ہیں جن کے سامنے میری کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے میں اسے آپ کی عنایت اور قدامت پرستی پر محمول کرتا ہوں۔ طوالتِ عمر جس سے میں سخت بیزار ہوں، آخر آج کام آ ہی گئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسی اہم کانفرنس کی صدارت کا مستحق نہیں۔

---

[1] ڈاک خانے کی مہر کے مطابق سنہ تحریر ۱۹۵۸ء (سیّد معین الرحمٰن)

یہ ازراہِ انکسار نہیں بلکہ ازراہِ حقیقت ہے۔

آپ نے میری اطلاع کے لیے جو امور لکھے ہیں ان سے آگاہی ہوئی۔ مصلحت کا لفظ دیکھتے ہی تلملا اٹھتا ہوں۔ ان مصلحتوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا اور آخر کار ان مصلحتوں نے ہی ہم کو ڈبویا۔ جو کچھ کہنا ہے صاف کہو اور دو ٹوک کہو ہم کب تک مصلحتوں کی خاطر حق گوئی سے آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے۔ زیادہ کیا کہوں، حالات آپ کے سامنے ہیں۔

آپ کی کانفرنس ۱۸ جنوری کو شروع ہوتی ہے۔ وہاں کب حاضر ہو جاؤں۔ میں وہاں کم سے کم دن رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی ملاقات کا منتظر رہوں گا۔

خیر طلب،
عبدالحق

(۲)

کراچی

۱۲ جنوری ۱۹۵۹ء

عزیز مکرم زاد لطفہ

آپ کا خط پہنچا۔ اچھا ہوا آپ نے کانفرنس کی تاریخیں بدل دیں۔ آج کل لاہور میں غضب کی سردی ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جس روز آپ کا خط پہنچا ہے اسی روز مس فاطمہ جناح کا بیان موجودہ نظامِ تعلیم کے خلاف شائع ہوا ہے۔ اس میں زبان کا بھی ذکر ہے۔ ایسے میں کانفرنس کے افتتاح کے لیے اُن کا انتخاب بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوا۔ میں آپ کے وفد میں شریک ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔ مس فاطمہ جناح ہماری درخواست قبول کریں، اس کی مجھے بہت کم توقع ہے۔ بہرحال کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ اگر انھوں نے یہ درخواست قبول کرلی

تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ جو وفد آپ تجویز کریں اس میں لاہور کے دو ایک شخص ضرور ہونے چاہئیں۔

خیر طلب،

عبدالحق

(۴)

کراچی

۲۶۔ جنوری ۱۹۵۹ء

مکرمی و عزیزی سلمہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ جسٹس رحمٰن کا خط فضلی صاحب کے پاس ہے اور وہ مس فاطمہ جناح کی خدمت میں وفد لے جائیں گے۔ فضلی صاحب نے اس بارے میں مجھے کوئی اطلاع ابھی تک نہیں دی۔ آپ نے یہ ضرور لکھا تھا کہ ایسا وفد ترتیب دیا جائے گا اور مجھے بھی اس میں شرکت کے لیے لکھا تھا۔ میں منتظر رہا۔ مجھے مطلق اس کا علم نہیں کہ وفد گیا یا نہیں اور گیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ امید ہے فضلی صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع آپ کی یا جسٹس رحمٰن صاحب کی خدمت میں پہنچ گئی ہوگی۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب دو ایک روز میں آنے والے ہیں ان سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ لاہور میں اس تحریک کی مخالفت کی جا رہی ہے میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اُردو کی اِس قسم کی تحریک کی حمایت اہلِ پنجاب، خاص کر اہلِ لاہور کریں گے اور پاکستان میں اُردو پنجاب والوں ہی کے دم سے زندہ رہے گی اور ترقی کرے گی۔ عجب بات ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے اُردو اُن تمام علاقوں میں مقبول تھی جو اب

پاکستان میں شامل ہیں اور اُسے قومی زبان سمجھتے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد سب سے اوّل مشرقی پاکستان سے مخالفت کی آواز آئی اور اس کے بعد دوسرے صوبوں نے منحرف ہونا شروع کیا۔ باوجود اس کے اب بھی مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان میں پنجاب ہی کی بدولت اسے فروغ ہوگا۔

خیر طلب،
عبدالحق

(۴)

کراچی
۱۵- فروری ۱۹۵۹ء

شفیقی و عزیزی سلمہٗ

آپ کا خط ابھی ملا۔ تیز گام میں جگہ نہیں ملی۔ اس لئے شاہین سے ۲۰ فروری کو روانہ ہو کر ۲۱- فروری کو پونے بارہ بجے لاہور پہنچوں گا۔

میں اپنا خطبہ آج ہی سیّد عبداللہ صاحب کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے زیادہ تر ذریعۂ تعلیم سے بحث کی ہے اور یہی مجھے اس کانفرنس کا مقصد بتایا گیا تھا۔ سُنا ہے کہ سردی وہاں بہت شدّت سے پڑ رہی ہے بعض احباب نے لکھا ہے کہ ادھر کا رُخ نہ کروں۔ لاہور تو ضرور جاؤں گا۔ اگر سردی کی ایسی ہی شدت ہے تو ۲۲ کے بعد قیام میرے لیے مناسب نہ ہوگا۔ ویسے اب میں لوگوں سے ملنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ آپ لوگ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے تو اب آپ لوگوں کے سامنے کچھ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

اب باتیں ملاقات ہی کے وقت ہوں گی۔

خیر طلب،
عبدالحق

(کراچی)

۱۹- فروری ۱۹۵۹ء

عزیز مکرّم سلمہٗ

آپ کا خط ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھ چکا ہوں پہنچ گیا ہوگا۔ انشاء اللہ ۲۱- فروری کو شاہین گاڑی سے پونے بارہ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

آپ نے یہ سپاسنامے کی رَٹ کیسی لگا دی۔ میں اس قابل نہیں رہا۔ سپاسنامے وزیروں اور لیڈروں کے لیے ہوتے ہیں۔ اب تک غریب مہاجر ہوں جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا اور یہاں آکر جو کرنا چاہتا تھا وہ نہ کر سکا بلکہ میرے ساتھیوں نے مجھے اِس قابل نہ رکھا کہ کچھ کر سکوں۔ اب سپاس نامہ کس بات کا، حرماں و محرومی کا؟ یہ ہنسی کی بات ہوگی۔ آپ میرے دل کے داغ کیوں تازہ کرتے ہیں اور سپاس نامہ پیش کر کے مجھے کیوں شرماتے ہیں۔ اُردو کا جو حشر بھارت میں ہوا اور ہو رہا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا اور یہاں جو ہو رہا ہے وہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ زمانہ سپاس ناموں کا نہیں، کچھ کر گزرنے کا ہے۔ آپ اسے موقوف ہی رکھیے تو اچھا ہے۔ میں اسی کو سب سے بڑا سپاس نامہ سمجھوں گا۔ امید ہے آپ میرا منشا سمجھ گئے ہوں گے اور اصرار نہ فرمائیں گے۔

خیر طلب

عبدالحق

(قومی زبان، کراچی، بابائے اُردو نمبر، اگست ۱۹۶۶ء، ص ۲۸۸-۲۹۸)

" حمید (احمد خاں) کو شادی کی مبارک باد ابھی سے میری طرف سے پہنچا دیجئے گا وہ بھی ہاتھ سے گئے۔ شاید اسی وجہ سے محمود احمد خاں وطن گئے ہیں، اُنہوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

(بابائے اُردو: ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء، مکتوباتِ عبدالحق، جلیل قدوائی، ص ۲۵۱)

بابائے اُردو اور جسٹس ایس اے رحمٰن

[ولادت: ۴۔ جون ۱۹۰۳ء

وفات: ۱۱۔ فروری ۱۹۷۹ء]

[مکالمہ: لاہور ۱۷۔ جون ۱۹۶۵ء]

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کو اُردو سے دلی لگاؤ ہے۔ وہ شعر بھی کہتے ہیں، نثر بھی خوب لکھتے ہیں اور تقریر بھی بڑی پُرکار کرتے ہیں، اُن کے خطبات کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ "ترجمانِ اسرار" رحمٰن صاحب کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ یادگار تالیف "کاروانِ ادب" نے شائع کی اور اب کمیاب ہے۔ حال ہی میں مرکزی ترقی اُردو بورڈ نے رحمٰن صاحب کی ایک گراں قدر کتاب "سفر" شائع کی ہے۔ اس میں چند چھوٹی چھوٹی نظموں کے علاوہ ایک طویل نظم ہے جس میں ایک مہاجر کے سفر کی صورت میں بڑی ایمائیت اور بلاغت کے ساتھ پاکستان کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم کے بعد ایک بوڑھا مشرقی پنجاب سے ہجرت کرتا ہے۔ راہ میں تھک کر وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی آنکھ لگ جاتی ہے اور تاریخِ ہند کے مناظر اُس کی نظروں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح علامتوں کے ذریعے آریاؤں سے لے کر انگریزوں کے عہد تک ساری تاریخ اُس پر روشن ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پاکستان کی تاریخ کا ذکر آیا ہے اور گویا پاکستان کی سرحد میں پہنچنے پر اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے پاکستان کی تخلیق کی تمثیل ہے اور رحمٰن صاحب نے اسے انتہائی سوجھ بوجھ اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں بطور اسسٹنٹ کمشنر سروس میں داخل ہوئے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں خدمات انجام دیں۔ حکومت پنجاب کے مشیرِ قانونی ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج ہوئے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں جسٹس منیر سپریم کورٹ میں گئے تو رحمٰن صاحب لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب پر ترقی پا گئے۔ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور یہاں

سے ۱۹۵۸ء میں سپریم کورٹ چلے گئے۔

رحمٰن صاحب مرکزی اُردو بورڈ کے صدر ہیں۔ بزمِ اقبال اور مجلسِ ترقیٔ ادب کے ساتھ بھی وہ شروع ہی سے وابستہ ہیں۔ مرکزی ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے بورڈ آف گورنرز میں ہیں اور انجمن ترقی اُردو کے لائف ممبر وہ ایک مدت سے ہیں۔ غرض اُردو کے خدمت گذاروں میں رحمٰن صاحب کا درجہ بڑا بلند ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی جلسے کی صدارت فرمائیں اُردو ہی میں تقریر فرماتے ہیں الاّ یہ کہ فضا ہی دوسری ہو! ۵۱۔۱۹۵۰ء میں جب رحمٰن صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، اُنہوں نے علومِ شرقیہ کے طالب علموں کو سندیں عطا کیے جانے کے موقع پر ہمیشہ اُردو میں خطبے دیئے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، رحمٰن صاحب کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان پر بڑا اعتبار رکھتے تھے۔ انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان (کراچی) کے ایما پر بابائے اُردو کے بارے میں بعض دیگر بزرگوں کے بشمول جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب کے تأثرات محفوظ کرنے کے لیے میں مہادل نگر سے لاہور پہنچا یہ ۱۷۔ جون ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ رحمٰن صاحب کے ہاں ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ "دفتر" گئے ہوئے ہیں۔ دو بجے تک لوٹیں گے اور دفتر پر ٹیلیفون نہیں تھا۔ دو بجے کے قریب معلوم ہوا کہ آرام فرما رہے ہیں۔ چار بجے کے بعد بیدار ہوں گے۔ عرض کیا! بیدار ہونے پر اطلاع کرا دی جائے کہ میں بہت دُور سے حاضر ہوا ہوا ہوں۔ پانچ بجے پھر رابطہ قائم کیا۔ رحمٰن صاحب خود تھے۔ ارشاد ہوا کہ بے شک ابھی آجائیے۔

گلبرگ کا خوبصورت علاقہ، کوٹھی سفید اور کشادہ، ہر طرف سکوت اور سناٹا، پھر رحمٰن صاحب کی شخصیت کا ہیولا۔ میں بڑی عقیدت و ارادت لیے رحمٰن صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا اور لطف و مرحمت اور مہر و مکرمت سے سرفراز واپس آیا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے بارے میں رحمٰن صاحب نے فرمایا:

"وہ خود گویا اپنی ذات میں انجمن تھے۔ مجسّم انجمن ترقی اُردو! جس تندھی سے اور سرگرمی سے انہوں نے اُردو کی خدمت کی اس کی مثال نادر بلکہ

معدوم ہوگی۔ سب کچھ اُنہوں نے اُردو کی خاطر قربان کر دیا۔ ساری زندگی گویا
اُردو ہی کے ہو کر رہے۔ قوم نے انہیں جو "بابائے اُردو" کا خطاب دیا وہ ان
کی ذات کے علاوہ اور کسی پر سج ہی نہیں سکتا، بات تو دراصل یہی ہے۔"
سفید کرتا پاجامہ پہنے، رحمٰن صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے، چھوٹی سی
میز پر بابائے اُردو کے مکتوبات اپنے سامنے پھیلائے، دھیمے دھیمے مُسکراتے ہوئے
فرما رہے تھے:

"ہر نقش، خونِ جگر کے بغیر ناتمام ہے، اقبالؔ کا یہ فرمان بالکل بجا
ہے۔ تنہا مولوی صاحب کے اخلاص اور سوزِ جگر نے وہ کام کیا جو کئی انجمنوں
کا کام تھا۔ اُنہوں نے خونِ جگر استعمال کیا اور اُردو کا نقش تمام رعنائیوں
کے ساتھ اُبھرا، اور اُردو نے اپنا سکہ منوایا۔ وہ زندگی بھر اس کی خاطر
چومکھی لڑائی لڑتے رہے، کہیں مغرب زدہ طبقے سے اُلجھ رہے ہیں، کہیں
کانگریس سے، کہیں ہندوؤں کے قدامت پسندوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔
یہ سب کچھ محض اس لیے کہ اُردو کا بول بالا ہو اور یقیناً زندگی میں اُنہیں
بہت حد تک کامیابی ہوئی۔ اُن کی کامیابی میں ان کے شگفتہ اسلوبِ بیان
کو بہت دخل تھا۔ وہ زبان ایسی سادہ، پیاری اور دلکش لکھتے تھے کہ جو
اُن کی بات سُنتا تھا، یقین کرتا تھا کہ یہی ہماری زبان ہے۔"

میرے ایک استفسار کے جواب میں رحمٰن صاحب نے فرمایا:

"رسالہ" اُردو" میں مطبوعہ مولوی صاحب کے مضامین اور خطبات
وغیرہ سے میں استفادہ کرتا رہا ہوں۔ پہلے پہل مجھے غالباً مولانا عبدالحق
کے مضامین سے اُس وقت آشنائی ہوئی جب مولانا ظفر علی خاں "پنجاب
ریویو" شائع فرماتے تھے، مولوی صاحب اس میں غالباً جہاں تک مجھے یاد
ہے "مجذوب کی بڑ" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ وہ رسالے اب میرے
پاس نہیں ہیں۔ بڑی مدّت ہوئی وہ میری نظر سے گزرے تھے۔ یہ غالباً

۱۳-۱۹۱۲ء کی بات ہوگی "پنجاب ریویو" اچھا رسالہ تھا۔ یہ کچھ عرصہ چلا اور پھر بند ہوگیا۔ مولوی صاحب کے علاوہ اِس میں اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں اور مولانا ظفر علی خاں کے مضامین اور افسانے بھی ہوا کرتے تھے"

رحمٰن صاحب نے میرے ایک اور استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"مولوی صاحب عام طور پر لاہور ایک آدھ روز کے لیے آتے تھے اور میاں بشیر احمد صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ ہرچند کہ جب تک وہ حیات رہے مجھ پر کرم فرماتے رہے" کچھ خط بھی آئے جو میں آپ کی نذر کرتا ہوں لیکن مجھے ان کی قربت کا ایسا زیادہ شرف حاصل نہیں رہا بس خط وکتابت ہوئی یا جلسوں میں دیکھ لیا، دعوتوں میں ملاقات ہوگئی یا پھر مرض الموت میں مری دیکھا۔ آخری بار ملٹری ہسپتال مری میں گیا۔ اُس وقت وہ نحیف تھے اور عام طور پر لوگوں کو پہچانتے نہیں تھے۔ ڈاکٹر کرنل عبدالرشید، نگران تھے اور علاج میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ ڈاکٹر سے پوچھا تو اُنھوں نے حالت کی طرف سے اطمینان دلایا لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ یوں.... چھوڑے چلے جارہے ہیں"

رحمٰن صاحب نے آخری جملہ خاصی دل گرفتگی سے مکمل کیا۔ چند ثانیے کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے لیکن پھر فوراً ہی اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے شگفتہ اور سنجیدہ انداز میں گویا ہوئے تو اعتماد اور اطمینان کی لہر ان کے لب ولہجہ میں جاری وساری تھی:

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے لوگ شاذ ونادر ہی پیدا ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں زندہ قوموں ہی میں ایسے لوگ اُبھرتے ہیں۔ اِس لیے ہمیں اپنے مستقبل سے متعلق مایوس نہ ہونا چاہیے جو کام اُنھوں نے ادھورا چھوڑا ہے اسے آگے بڑھا کر ہی ہم ان کی روح کو تسکین پہنچا سکتے ہیں۔ استعمال سے ہی زبانیں بنتی اور منجھتی ہیں۔ اُردو کو اعلیٰ فنی اور سائنسی علوم کے لیے اختیار کرلیا گیا ہے۔ اس کے دور رس نتائج ہوں گے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ

ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ وہ تو نہ ہوا لیکن کراچی میں ایک اُردو کالج
اُن کی زندگی میں قائم ہو گیا جو بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ یہ گویا ان کی زندہ
یادگار ہے۔ ان کی تصانیف کے علاوہ ....."

اَب رحمٰن صاحب نے بابائے اُردو کے چند مکاتیب مرحمت فرمائے کہ میں اُن کا شمار
کرلوں! میں نے احتراماً عرض کیا "اس کی کیا ضرورت ہے، جیسے اور جتنے آپ فرما
رہے ہیں بس ٹھیک ہیں" فرمایا " لفافے ضرور چھ ہیں لیکن خط تعداد میں سات ہیں، یعنی
دو خط ایک ساتھ ملفوف ہیں معین صاحب آپ ان کی نقل لے کر اصل خط مجھے
واپس کر دیجئے گا" تب مجھے پتہ چلا کہ " احتیاطی" تدبیر کیوں اختیار کی جا رہی تھی!
رحمٰن صاحب کے لیے یہ خط واقعی ایک یادگار اہمیت کے حامل ہیں کہ مکتوب نگار
فردوس نشین ہوئے اور پھر مکتوب نگار بھی وہ کہ جن کی شخصیت پورے ایک عہد پر حاوی ہے۔
جسٹس ایس - اے۔ رحمٰن صاحب کے نام بابائے اُردو کے مکاتیب رحمٰن صاحب کے
دلی شکریے کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں :

(۱)

۱۷ر فروری ۱۹۵۰ء[1]

(بصیغۂ رجسٹری)

مخدوم و مکرم زاد لطفہ، السلام علیکم
کئی بار لاہور جانے کا ارادہ کیا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا کام
آگیا کہ میں قاصر رہا۔ لاہور جانے کا ایک مقصد آپ کی ملاقات بھی تھا
اور آپ سے بعض امور پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔
اس وقت یہ خط خاص غرض سے لکھ رہا ہوں ..... صاحب پنجاب

---

[1] لفافے پر ڈاک خانے کی مہر ۱۹۵۱ء کی ہے۔ غالباً مولوی صاحب سے التباس ہوا کہ نیا سال چڑھے
زیادہ دن نہیں ہوئے

یونیورسٹی میں اُردو کے سینئر لیکچرار ہیں۔ عربک کالج دہلی کے لیے کوئی ایک درجن اُمیدواروں میں سے میں نے انہیں کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں انہوں نے بحیثیت صدر شعبۂ اُردو بہت قابلِ تعریف کام کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی وہ میرے لکھنے اور اصرار پر آئے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ قابل اور کام کے لوگ کسی نہ کسی طرح پنجاب یونیورسٹی میں آجائیں۔ عربک کالج نے طویل رُخصت دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے انہیں استعفٰی دینا پڑا اور پاکستان آجانے کی وجہ سے اُنہیں موروثی جائیداد سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ نہایت قابل، سلیم الطبع اور پرجوش نوجوان ہیں۔ علم و ادب سے خاص شغف ہے اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان کی کتاب . . . . جو انہوں نے بڑی قابلیت اور جامعیت سے لکھی ہے، انجمن ترقّیِ اُردو چھپوا رہی ہے۔ ان وجوہ سے میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے اور میں انہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ آج کل انہیں بعض ایسی مشکلات پیش آگئی ہیں جن کی وجہ سے وہ بہت پریشان خاطر اور دل شکستہ ہیں۔ ان مشکلات کو صرف آپ رفع فرما سکتے ہیں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مشکل پیش کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ازراہِ کرم ان کی امداد فرمائیں گے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

نیاز مند

عبدالحق

۱۳؍ مارچ ۱۹۵۱ء

(بذریعہ رجسٹری)

جنابِ مکرم و معظم زاد مجدہ۔ السلام علیکم

انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان نے ایک اُردو کانفرنس اعلیٰ پیمانے پر انعقاد کرنے کا اہتمام کیا ہے جس کے اجلاس ۱۳-۱۴-۱۵-اپریل کو ہوں گے پہلے دو اجلاس کی صدارت جناب عبدالرب نشتر صاحب نے منظور فرمالی ہے۔ افتتاحِ کانفرنس کی درخواست، عالی جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیرِاعظم سے کی جائے گی۔ اس کانفرنس میں دو شعبے خاص طور پر رکھے گئے ہیں۔ ایک علمی و ادبی نمائش ہے جس میں قدیم اُردو مخطوطات، خوشخطی کے نمونے، جامعہ عثمانیہ دائرہ المعارف حیدرآباد دکن اور انجمن ترقیٔ اُردو کی مطبوعات، ٹائپ کی مطبوعہ قدیم کتابیں، جدید اُردو ٹائپ کے نمونے، قدیم مصوروں کی تصاویر، اردو ٹائپ رائٹر وغیرہ پیش کیے جائیں گے۔ اس کے افتتاح کے لیے عالی جناب خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان سے درخواست کی گئی ہے۔

دوسرا شعبہ تعلیمی ہے جس کے دو اجلاس ۱۵-اپریل بروز یکشنبہ ہوں گے پہلے اجلاس میں جو دن کے وقت ہوگا علمی مقالات پڑھے جائیں گے۔ شب کے اجلاس میں ہم عملی طور پر اس بات کا مظاہرہ کریں گے کہ اُردو زبان میں سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم اُسی خوبی اور آسانی سے دی جاسکتی ہے جیسی انگریزی میں۔ اس کے لیے ہم نے خاص اہتمام کیا ہے۔ اس تعلیمی شعبے کے لیے انجمن کی بہ ادب درخواست ہے کہ اس کی صدارت آپ ازراہِ نوازش قبول فرمائیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ انجمن کی اس استدعا کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

نیازمند

عبدالحق

(۳)

۲۰-اپریل ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

اُردو کانفرنس بہ خیر و خوبی ختم ہوگئی اور ہر شعبے کا کام خوش اسلوبی سے انجام

پایا۔ پاکستان کے ہر علاقے کے نمائندوں نے شرکت کی اور اپنے تعاون سے کانفرنس کو کامیاب کیا۔

آپ کے پیغام کو جو اُردو تار کے ذریعے موصول ہوا لوگوں نے بہت پسند کیا۔ کانفرنس کے کامیاب بنانے میں آپ نے جو اعانت فرمائی اس کا انجمن کی طرف سے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نیازمند

عبدالحق

(۴)

۸۔ مئی ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

آپ کی خدمت میں اُردو کمیٹی کا ایجنڈا اور کاغذات پہنچ گئے ہوں گے۔ اس کمیٹی کو قائم ہوئے تخمیناً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس کی کاروائی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ابھی تک ہم نے کچھ نہیں کیا۔ سب سے اہم مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا ہے، خاص کر سائنس کی تعلیم میں اس پر سالہاسال سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے اور اب جب پھر یہ معرض بحث میں آتا ہے تو وہی فرسودہ دلائل پیش کی جاتی ہیں اور کوئی بات طے نہیں ہونے پاتی۔ وجہ یہ ہے بعض صاحب جو اپنے آپ کو ماہر سائنس خیال کرتے ہیں نہیں چاہتے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم ہو۔ اس لیے طرح طرح کے اُلجھاؤ ڈال کر ایسی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں کہ معاملے میں تاخیر ہوتی چلی جائے۔ اب اس جلسے میں بھی یہی صورت پیش آنے والی ہے۔ اس لیے میری یہ عین خواہش ہے کہ آپ اس جلسے میں ضرور شرکت فرمائیں۔ جب تک آپ جیسے اہل الرائے حضرات اس میں شریک ہو کر ان مسائل پر غور نہیں فرمائیں گے یہ امور طے نہیں ہوں گے اور عزیز وقت فضول بحثوں میں ضائع ہوگا۔ میں مولوی سید ہاشمی صاحب جوائنٹ سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کو آپ کی

خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہ آپ سے تمام حالات عرض کریں گے۔ آپ کی مصروفیت کا حال مجھے معلوم ہے۔ آپ کی صرف ایک دن کی شرکت کافی ہوگی۔ آپ ہوائی جہاز سے آکر واپس جا سکتے ہیں۔ اس میں ایک دن سے زیادہ صرف نہ ہوگا۔

نیاز مند

عبدالحق

۵

کوئٹہ۔ لٹن روڈ نمبر ۴۷

۲۶، اکتوبر ۱۹۵۱ء

مخدوم و مکرم زاد لطفہ۔ السلام علیکم

گرامی نامہ پہنچا۔ تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ بلاشبہ آپ پر کام کا ہجوم ہے اور اس پر اتنے کام اور ذمہ داریاں۔ ایسی صورت میں آپ کا کوئٹہ آنا دشوار تھا اور آپ کا عذر بالکل بجا ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے المناک سانحے کی وجہ سے کانفرنس ملتوی کرنی پڑی۔ اب آئندہ سال مئی کی ۸۔ ۹۔ ۱۰ کو قرار پائی ہے۔ اگر اس زمانے میں ایک دو روز کے لیے زحمت فرمائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ ہم سب کی یہی آرزو ہے کہ آپ ہی بلوچستان کی پہلی اُردو کانفرنس کو اپنی صدارت سے عزت بخشیں۔ امید ہے کہ ہماری درخواست قبول فرمائی جائے گی۔

نیاز مند

عبدالحق

۶

۲۴ اگست ۱۹۵۲

مکرم و معظم بندہ زاد لطفہ، السلام علیکم

انجمن ترقی اردو بلوچستان کی صدارت کے متعلق گذشتہ سال آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ اس وقت آپ نے عدم فرصت کا عذر فرمایا تھا۔ چودھری محمد علی صاحب نے میری درخواست بخوشی منظور فرمائی تھی مگر ان کی علالت کی وجہ سے کانفرنس ملتوی کرنی پڑی۔ وہ اب بھی تیار تھے مگر ڈاکٹروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ لہٰذا اب میں پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ازراہِ کرم انجمن کی درخواست قبول فرمائی جائے۔ اہلِ انجمن یہ کانفرنس ماہ ستمبر ہی میں کرنا چاہتے ہیں ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴ ستمبر کی تاریخیں تجویز ہوئی ہیں۔ اگر یہ مناسب نہ ہوں تو ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ ستمبر ہو سکتی ہیں یا جو تاریخیں آپ مناسب خیال فرمائیں۔ امید ہے جواب جلد عنایت فرمایا جائے گا۔

نیازمند

عبدالحق

(۷)

۲۷۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

(رجسٹرڈ)

مکرم و معظم زاد مجدکم[1] السلام علیکم

گرامی نامہ شرف صدور لایا، بہت ممنون فرمایا۔ آپ کی دعوت شکر و احسان مندی کے ساتھ بسر و چشم قبول کرتا ہوں۔ کانفرنس کی صدارت کا انتخاب میرے لیے موجبِ عزت و افتخار ہے۔ حسبِ ارشاد مقررہ تاریخوں میں حاضر ہو جاؤں گا۔

نیازمند

عبدالحق

---

[1] جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب کے نام بابائے اردو کا یہ خط پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے ذخیرۂ مکاتیب سے میسر آیا۔

(۸)

۲ ر مارچ [۱]

مخدوم ومکرم زاد لطفکم۔ السلام علیکم۔

آپ کی توجہ اور سرپرستی سے اردو کانفرنس بخیر وخوبی اور کامیابی سے ہوئی۔ اس کی قراردادیں عام طور پر پسند کی گئیں اس کام کے انجام دینے میں جو محنت اور کوشش کی گئی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس کا ضرور اثر ہوگا۔

خلیفہ عبدالحکیم کی وفات بھی ایک سانحہ ہے، خصوصاً ادارہ ثقافت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم بہت اچھا کام کر رہے تھے اور بڑے شوق اور خلوص سے کر رہے تھے ان کی جگہ کسی ایسے شخص کا انتخاب ہونا چاہیئے جو اس کام کو سنبھالے جائے۔ میری نظر میں ڈاکٹر عابد احمد علی اس کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عربی زبان اور علوم اسلامی پر ان کی اچھی نظر ہے۔ دائرۃ المعارف اسلامی کے لیے جو دو تین مضمون انہوں نے لکھے ہیں ان سے مجھے ان کی قابلیت کا اندازہ ہوا۔ آپ انہیں طلب کر کے گفتگو فرمائیں۔ گفتگو کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس کام کے اہل ہیں یا نہیں۔

ان کے والد سید احمد علی، سرسید احمد خاں کے نواسے تھے۔ ڈاکٹر عابد احمد علی بہت شریف النفس اور محنتی شخص ہیں۔ اگر ان کا انتخاب ہوا تو وہ خلیفہ صاحب مرحوم کا بدل ثابت ہوں گے۔

اگر آپ ملاقات کے لیے انہیں طلب کرنا پسند فرمائیں تو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کی وساطت سے طلب فرما سکتے ہیں۔

نیاز مند

عبدالحق

(قومی زبان، کراچی، بابائے اُردو نمبر، اگست ۱۹۶۶ء ص ۲۷۹-۲۸۷)

---

[۱] ڈاک خانے کی مہر سے سنہ تحریر ۱۹۵۹ء طے پاتا ہے۔

بابائے اُردو کے رفیقِ دیرینہ

حکیم اسرار احمد کریوی سے ایک مکالمہ

[ولادت : کوری، الٰہ آباد، یکم مارچ ۱۹۰۶ء

وفات : کراچی، ۲۔جنوری ۱۹۹۱ء]

[طویل تحریری مکالمہ: اکتوبر ۱۹۷۵ء]

①

ضلع الہ آباد اور تحصیل الہ آباد (یوپی'انڈیا) کے پرگنہ چایل کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کوری۔۔۔۔۔ جو شہر الہ آباد سے تیرہ میل مغرب میں دریائے گنگا کے داہنی کنارے پر چایل کی سب سے بڑی بستی مہگاؤں سے دو میل جنوب میں واقع ہے ۔۔۔۔۔اس گاؤں (کوری) کی آبادی سو گھروں سے زیادہ پر مشتمل نہیں رہی۔

اس چھوٹے سے گاؤں کے ایک سفید پوش متوسط زمیندار گھرانے کے سربراہ فیاض احمد مرحوم کے دو بیٹوں نے اردو زبان و ادب کے خدمت گزار کی حیثیت سے بڑا نام پایا۔۔۔۔۔۔ان میں سے بڑا بیٹا پیشے کے اعتبار سے "ڈاکٹر" تھا اور چھوٹا "حکیم"۔۔۔۔۔ یہ ہیں اردو کے مشہور افسانہ نگار' دیہی زندگی کے ترجمان اور عکاس' پریم چند کے معاصر ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم۔۔۔۔اور معروف صحافی 'معلم' صاحب تدبیر سیاسی کارکن' آشفتہ مزاج لیکن بڑے مہم جو' منصوبہ ساز' اردو کے قدیم خدمت گزار اور بابائے اوردو کے دیرینہ ہم دم اور دمساز: حکیم اسرار احمد کریوی مرحوم۔

حکیم اسرار احمد کریوی کے انتقال پر انجمن ترقی' اردو پاکستان کے ترجمان رسالہ "قومی زبان" نے لکھا:

> تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما 'ماہر تعلیم اور سٹی کالج (کراچی) کے سابق پرنسپل اور بزرگ صحافی مولانا اسرار احمد کریوی۔۔۔۔۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئے اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔۔۔۔نماز جنازہ کے شرکاء میں سیاسی رہنما' احباب واعزہ' سابق وزراء' علمائے دین اور میئر کراچی شامل تھے۔

حکیم اسرار احمد کریوی نے تحریک پاکستان میں قائد اعظم محمد علی جناح' مولانا حسرت موہانی' چودھری خلیق الزماں اور نواب صدیق علی خاں کی معیت میں خدمات انجام دیں۔انہوں نے تیس برس تک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی کام کیا ۔۔۔۔۔۔وہ اردو کش اسکیموں' واردھا اور ودیا مندر کے خلاف جہاد میں بابائے اردو کے ساتھ رہے۔

حکیم اسرار احمد کریوی نے ایک معرکتہ الآرا کتاب "سی پی میں کانگریس راج" لکھی۔وہ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے چھوٹے بھائی تھے۔حکیم اسرار احمد کریوی نے پس ماندگان میں چار بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔عزیز اکرم' نصیر اکرم اور زہیر اکرم ندیم ۔۔۔۔۔۔آخر الذکر' کونسلر' ایم پی اے اور سابق صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔"

[قومی زبان کراچی' جنوری ۱۹۹۱ء ص ۸۴]

جناب شمیم صبائی متھراوی نے ان کا قطعہ تاریخ وفات موزوں کیا:

"حکیم اسرار احمد کریوی نگہبانِ قصرِ خلد"

۱۹۹۱ء

تمہیں اب کہاں دہر میں وہ ملیں گے
کریوی تو جنت میں کرسی نشیں ہیں
شمیم ان کی تاریخ ترحیل لکھ دو
"کریوی بہشتِ بریں کے امیں ہیں"

۱۴۱۱ھ

"تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما' ماہر تعلیم سٹی کالج کراچی کے سابق پرنسپل اور بزرگ صحافی حکیم اسرار احمد کریوی نے ۳۔جنوری ۱۹۹۱ء مطابق ۱۶ جمادی الآخر بروز پنج شنبہ ----- کراچی میں انتقال فرمایا مرحوم کو سرشاہ سلیمان روڈ پر واقع قبرستان میں سپرد لحد کیا گیا ہے"

[قومی زبان' کراچی فروری ۱۹۹۲ء ص ۵۵]

حکیم اسرار احمد کریوی کے مزاج آشنا اور تربیت یافتہ برادرم متین الرحمٰن مرتضٰی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

حکیم اسرار احمد کریوی پیشے کے لحاظ سے طبیب' جوانی کے مشغلے کے اعتبار سے سیاسی کارکن' علمی مذاق کے اعتبار سے ادیب وشاعر اور افتادطبع کے اعتبار سے سیلانی تھے۔ گھر سے زیادہ حلقہ یاراں میں خوش رہنے والے۔ ہجرت سے قبل حکیم صاحب اپنی متوسط زمیندرانہ حیثیت میں کسی مستقل ذریعہ معاش کے پابند نہیں رہے۔ مشغلے کے طور پر سیاست کی اور ضرورتاً صحافت کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ وہ روزنامہ "انجام" کراچی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔

حکیم اسراز احمد کریوی مرحوم' بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سیاسی مشیر رہے' خصوصاً اردو ہندی تنازعے کی تحریک مں وہ بابائے اردو کے ساتھ بہت زیادہ فعال رہے۔ انہوں نے سی پی میں مسلم لیگ کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا' "سی پی میں کانگریس راج" حکیم اسرار احمد کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس نے بڑی شہرت پائی اور قائد اعظم کے صد سالہ جشن ولادت

پر یہ کتاب قائد اعظم اکیڈمی سے مسلم لیگ کے یادگاری و بنیادی لٹریچر کے طور پر دوبارہ بھی شائع ہوئی -----"

[اداریہ ہفت روزہ تکبیر' کراچی' ۔ ۱۶ جولائی ۱۹۹۸ء ص ۷]

O

حکیم اسرار احمد کریوی سے میرا تعارف ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ یہ تعلق ان کے وصال تک کوئی تیس برس سے زیادہ تک قائم اور برقرار رہا----- بہاول نگر سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد میں نے اگست ۱۹۵۹ء میں بابائے اردو کے بنا کردہ اردو کالج کراچی میں تھرڈائیر میں داخلہ لیا----- اردو کالج میں پڑھنے والے ہر طالب علم کا بابائے اردو کی خدمت میں باریاب ہونا محالات میں نہ سہی' کچھ ایسا آسان اور ضروری بھی نہیں تھا یہ حسن اتفاق اور میری خوش قسمتی کہ مجھے اوّل دن ہی سے ان کی خدمت میں حاضری کی عزت حاصل ہوئی۔

صدر انجمن بابائے اردو کے کتب خانے میں بابائے اردو کے رفیقِ دیرینہ حکیم اسرار احمد کریوی سے تعارف کی خوشی میسر آئی ----- ان سے نیاز مندی کا یہ سلسلہ کچھ ایسا جڑا ----- اور یہ بندھن گزران وقت کے ساتھ ساتھ اس درجہ مضبوط اور قوی تر ہوا کہ وہ میرے اور متین بھائی کے معاشی' ادبی و تعلیمی' یہاں تک کہ ہمارے شخصی اور خانگی معاملات اور مسائل تک میں دخیل ہو گئے ----- اور ایک مہربان اور قدر دان سرپرست کے طور پر وہ ہم دونوں بھائیوں کو کچھ اپنی ذمہ داری سی خیال کرنے لگے۔ حکیم صاحب کا توسط' بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ذات اور خدمات سے میرے گہرے شغف اور عشق کا ایک باعث بنا۔

حکیم صاحب بابائے اردو کے بے حد مقرب اور معتمد اور ان سے بڑے مخلص تھے ۔ وہ بابائے اردو کی زندگی کی آخری چوتھائی صدی کی سرگرمیوں میں ان کے ہم قدم اور شریکِ غالب رہے ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور پھر پاکستانی دور کی سالانہ رودادوں میں' نیز مختلف اصحاب کے نام بابائے اردو کے خطوں میں حکیم صاحب کا ذکر بڑے تواتر

کے ساتھ اور بڑے اچھے لفظوں میں آیا ہے۔"انجمن" کی پنجاہ سالہ تاریخ (مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی) بھی حکیم اسرار احمد کے ذکر خیر سے خالی نہیں۔

حکیم صاحب، بابائے اردو کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے ایامِ آخر کے چشم دید رفیق اور گواہ تھے۔صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی دعوت پر بابائے اردو کو علاج کے لئے کمبائنڈ ملٹری ہاسپٹل، مری لے جایا گیا تو حکیم صاحب ان کے ساتھ تھے صحت سے مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں حکیم صاحب ہی بابائے اردو کو لے کر مری سے بذریعہ ٹرین کراچی لائے۔ بابائے اردو کے مزاج دان ہونے کی حیثیت سے حکیم صاحب کی متعدد نگارشات بابائے اردو کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بڑی خیال افروز اور معلومات افزاء ہیں!۔ وہ ان پر ایک مستقل اور مفصل کتاب لکھنے کے آرزومند بھی تھے، جو بڑی چونکا دینے والی ہوتی۔

کسی دوسرے موقع پر یہ لکھ چکا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصیت:

> "تحققہ طور پر عظیم تھی ------اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے عظیم شخصیت کی نشانی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جاسکتا------بابائے اردو کی پہلو دار اور عظیم شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے بھی اتنے ہی زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون، ایک نمبر یا ایک کتاب میں بیان نہیں ہو سکتے ------بیان کیے بھی نہیں جاسکتے کہ بڑی شخصیت کا متحمل ہونا آسان نہیں ۔اس کے لئے بجائے خود بڑی شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہے اور یہ خود اختیاری بات نہیں!
>
> مولوی عبدالحق کی بلند اور غالب شخصیت اپنے بھرپور احاطے اور تجزیے کے لیے کسی حالی کی منتظر ہے ------یہ حکیم اسرار احمد کریوی بھی ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی ______"

[۱۹۶۸ء]

افسوس، صد افسوس کہ اب نہ ڈاکٹر شوکت سبزواری ہم میں رہے نہ حکیم اسرار احمد کریوی!!

O

حکیم اسرار احمد کریوی، اس نقطۂ نظر کے بڑے پُر جوش موئید اور حامی تھے کہ مولوی عبدالحق کی کتاب ''چند ہم عصر'' میں قدم قدم پر خود مولوی عبدالحق کے اپنے مزاج، ان کی پسند ناپسند اور ان کے رہن سہن، رویوں اور طرزِ فکر کی تصویریں آویزاں ہیں۔

حکیم صاحب کی رہنمائی میں، میں نے ''چند ہم عصر'' کے آئینے میں مولوی عبدالحق کی سیرت اور شخصیت کو پانے کی کرید اور جستجو کی ------اس تلاش و تفحص میں مجھے کوئی دو برس لگے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کا بڑا حصہ حکیم صاحب کے پاس بیٹھ کر ''چند ہم عصر'' کو سمجھنے اور دیکھنے بھالنے میں صرف ہوا۔ میری اس کاوش کے حاصل نے رسالہ ''نقوش'' لاہور شمارہ ۱۰۲، مئی ۱۹۶۵ء میں جگہ پائی ------اور بعد میں اس مطالعے نے بابائے اردو کے بارے میں بعض تالیفات میں بھی اپنی جگہ بنائی۔

۱۹۷۵ء میں اپنے اس مطالعے اور جائزے پر ایک طائرانہ نظر (Air view) کے نتیجے میں میرے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوئے جن کے تحریری جوابات کے لیے میں نے حکیم اسرار احمد کریوی سے رجوع کیا------میں اس زمانے میں اپنی منصبی ذمہ داری پر فیصل آباد (لائل پور) میں تھا------اور حکیم صاحب بدستور کراچی میں فروکش تھے۔

میں نے اپنی الجھنیں ان کی خدمت میں لکھ بھیجیں اور بابائے اردو کی زندگی اور ان کے مزاجی رویوں کے بارے میں حکیم صاحب سے تائید، تصدیق یا تصحیح کی صورت میں کچھ تفصیل عطا کرنے اور اپنی شہادتوں کو قلم بند کرنے کی بہ عجز اور بہ شدت درخواست کی------جس کے جواب میں انہوں نے ازرہِ معین نوازی اپنی مصروفیات، اپنی طویل العمری اور خرابیِ صحت کے باوجود مجھے اٹھائیس تیس سطری مسطر کے اٹھارہ انیس فل اسکیپ اوراق اپنی گھنی اور گتھی ہوئی لکھائی میں گھسیٹ بھیجے۔

سوچتا ہوں کہ اس شفقت اور کرم فرمائی کا مظاہرہ، میں حکیم صاحب کی عمر اور

خستگی صحت کو پہنچ کر اگر یہ میری قسمت میں لکھی ہے اپنے کسی عزیز کے لیے روا رکھ پاؤں گا!؟

O

اس تمہید و تجید کے بعد میرے اور حکیم اسرار احمد کریوی کے مابین تحریری بات چیت قارئین کی نذر ہے آغازِ تحریر میں حکیم صاحب کا ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کا گرامی نامہ ہے جو انہوں نے اپنے طویل جواب نامے کے ساتھ ارسال کیا۔۔۔۔۔ پھر میرے سوالات کے جواب میں حکیم اسرار احمد کریوی کے اپنے قلم سے خود ان کے کوائفِ حیات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آئے ہیں ۔۔۔۔۔ اس کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزاجی اوصاف امتیازات اور رویّوں اور ان کے بہت سے واقعاتِ حیات کے بارے میں حکیم صاحب نے اپنے مشاہدے قلم بند کیے ہیں۔

میرے ذخیرے میں حکیم اسرار احمد کے دو اور خط بھی نکلے ایک ۱۹۶۴ء کا دوسرا ۱۹۷۷ء کا ۔۔۔۔۔ یہ ایک طرح سے خالصتاً نجی خط ہیں لیکن ان دونوں میں بھی ضمناً بابائے اردو کا حوالہ ضرور آیا ہے۔۔۔۔ اس لیے پیش نظر طویل تحریری سلسلہ سوال وجواب کے آخر میں حکیم صاحب کے ان دونوں خطوں کو بھی بطور ''ضمیمہ'' محفوظ کر دینا مجھے زیادہ بے محل دکھائی نہیں دیتا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
۲۶ مئی ۲۰۰۲ء

۱۵۸/جے
پی۔آئی۔بی کالونی کراچی
۲۶۔اکتوبر ۱۹۷۵ء

J|۱۵۸
P.I.B Colony
karachi۔۔۔۔۔۵

میاں معین! اللہ تم کو ہمیشہ خوش و خرم، خوش حال اور

صحت مندر کھے۔ شاید تم کو یاد نہیں کہ شبیر احمد مرحوم سلمہٗ کے بے وقت انتقال کے بعد میں دو سال تک خون کے شدید دباؤ کا مریض رہا' جس کا رجحان خاص طور سے دماغ کی طرف تھا۔ میرے معالج ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں نے جو میرے شاگرد بھی ہیں' مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں بھول کر کوئی ایسا کام نہ کروں جس کا اثر میرے دماغ پر پڑ سکے لیکن تم نے جو سوالات بھیجے تھے ان کے بارے میں مجھے گھنٹوں مسلسل سوچنا پڑا اور تب کہیں جا کر یہ صفحات مکمل ہوئے------غالباً کام نکالنے کا یہ گُر تم نے بابائے اردو مرحوم کی زندگی کے مطالعے سے حاصل کیا ہے۔ وہ بھی اسی طرح کام نکال لیا کرتے تھے۔

تمہارے ان سوالات نے مجھے یہ حوصلہ دیا ہے کہ میں بابائے اردو مرحوم کی زندگی کے حالات قلم بند کر سکوں۔ میرا ارادہ جلد ہی ہندوستان جانے کا ہے۔ اگر ویزہ مل گیا تو ایک دو ماہ کے اندر ہی تین ماہ کے لئے وہاں جاؤں گا اور واپس آ کر اگر خدا نے چاہا اور اس کی توفیق شامل حال ہو گی تو اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔

مستعین میاں سلمہٗ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہی مسودہ لے کر یونیورسٹی جا رہے ہیں۔ کل وہ رجسٹری کے ذریعے تمہیں بھیج دیں گے۔ اپنی بیوی' بچی اور بچے کو میری جانب سے دعا کہنا ------ تم کہو گے کہ آخر بے زبان بچے کو کیوں کر دعا پہنچائی جائے تو بھائی بچوں کو دعا کہنے کی آسان صورت یہ ہے کہ انہیں خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا جائے۔ یہی پیار ان کے حق میں دعا کا کام کرے گا۔

ارے میاں' ڈاکٹر افتخار احمد سلمہٗ سے ضرور ملنا اور ان سے میری

دعا کہنا اور یہ بھی کہہ دینا کہ میں بالکل اچھا اور معاشی اعتبار سے
مطمئن ہوں۔ لڑکے لائق اور فرماں بردار ہیں۔

دعا گو

اسرار احمد

○

نام: (حکیم) احمد اسرار

والد مرحوم کا نام: فیاض احمد صاحب

جائے ولادت: ضلع اور تحصیل الہ آباد' پرگنہ چایل کا چھوٹا سا گاؤں کوری جو شہر الہ آباد سے تیرہ میل مغرب میں دریائے گنگا کے داہنی کنارے پر' چایل کی سب سے بڑی بستی مہگاؤں سے دو میل جنوب میں واقع ہے۔ گاؤں کی آبادی سو گھروں پر مشتمل ہے۔

تاریخ ولادت: تعلیمی اسناد کے مطابق یکم مارچ ۱۹۰۸ء لیکن میرا اپنا خیال ہے' سال ولادت ۱۹۰۶ء ہے کیوں کہ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اعظم کریوی مرحوم سے نو سال چھوٹا ہوں جو والد صاحب مرحوم کی زمینداری کے حساب و کتاب کی کاپی کے ایک صفحے پر درج ہے۔ یوں بھی ماں باپ اور سرپرست بچوں کو اسکولوں میں داخل کراتے وقت عام طور پر صحیح عمر سے ایک دو سال کم لکھاتے ہیں۔

بابائے اردو سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟

غالباً اپریل ۱۹۳۵ء میں' ناگ پور (سی۔ پی' انڈیا) میں گاندھی جی کی صدارت میں ''آکھیل بھارتیہ ساہتیہ پریشد'' (آل انڈیا لٹریری کانفرنس) کا اجلاس ناگ پور میں سائنس کالج کے اس ہال میں ہوا جس کے دروازے کے اوپر دو ناگ بنے ہوئے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بھی اس کانفرنس میں خاص طور سے مدعو کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری بھی تھے جو ان دنوں بابائے اردو مرحوم ہی کے ساتھ بابائے اردو مرحوم کی قیام گاہ نادر منزل' سیف آباد' حیدر آباد دکن میں رہتے تھے۔ میں اس دوران ناگ پور میں مقیم تھا اور ''امید'' کے نام سے ایک اردو

ہفت روزہ اخبار نکالتا تھا۔

کانفرنس کے ہال میں بابائے اردو مرحوم سے میری ملاقات صاحب سلامت کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بابائے اردو مرحوم کے بارے میں جو روایتیں میرے کانوں تک پہنچی تھیں، ان کے زیر اثر میں کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو گیا تھا۔ کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری کے ساتھ ایک تانگے پر شاید اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کانفرنس کے کارکنوں سے ان کے قیام کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔

بابائے اردو سے ملاقات سے پہلے آپ کی مصروفیت؟

۱۹۳۰ء میں (رسمی) تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ناگ پور کے انجمن حامیِ اسلام کے ہائی اسکول میں عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسکول میں میرا منصب ''ہیڈ مولوی'' کا تھا کیوں کہ عربی فارسی اور اردو کے ایک اور مدرس بھی تھے جن کی تنخواہ اور میری تنخواہ اگر چہ برابر برابر تھی لیکن اسکول کے رجسٹر میں ان کا منصب ''سکینڈ مولوی'' کا تھا۔

ناگ پور کے انجمن حامیِ اسلام کی درس گاہ میں ۱۹۳۰ء میں میرا تقرر عربی کے استاد کی حیثیت سے ہوا تھا (لیکن) اسکول کی فضا مجھے کچھ راس نہ آئی اور ڈیڑھ سال ہی کی مختصر مدت میں، میں اس ملازمت سے بیزار ہو گیا اور مستعفی ہو گیا۔

معلّمی کے پیشے سے دستبرداری کے بعد آپ کے مشاغل کیا رہے؟

آخر کچھ تو کرنا ہی تھا۔۔۔۔۔اسکول کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پہلے کچھ دنوں مطب کیا اور بعد میں اردو کا چھاپہ خانہ قائم کیا اور ''امید'' کے نام سے اردو کا ایک ہفتہ روزہ نکالا۔

''مطب اور صحافت'' کی کچھ تفصیل بتائیے:

اپنے ایک دوست سلام الدین خاں صاحب سے جو ناگ پور کے محکمہ ڈاک سے وابستہ تھے کچھ روپے قرض لے کر شہر کے ایک مسلمان محلے کے قریب ایک مکان

کرائے پر لے کر مطب شروع کیا اور اس میں وہ برکت ہوئی کہ ایک سال کے اندر ہی میں نے اردو کا ایک پریس قائم کر لیا۔ یہ شہر کا واحد اردو چھاپہ خانہ تھا۔ چھاپہ خانہ میں نے شہر کے بالکل وسط میں محلّہ نال صاحب میں قائم کیا۔ یہ نیم پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے چھاپہ خانہ تھا اور اوپر میں خود رہتا تھا۔

جب چھاپہ خانے کا کام چل نکلا تو جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ''امید'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اردو اخبار نکالنے کا ڈول ڈالا۔ کچھ دنوں کے بعد اخبار کو ناگ پور میونسپل کمیٹی کی جانب سے اشتہارات ملنے لگے۔ اس ضمن میں مولانا ابوالحسن ناطق گلاٹھوی نے جو برائے نام گلاٹھوی تھے لیکن پیدا بھی ہوئے تھے ناگ پور ہی میں اور وہیں کی خاک میں آج بھی آرام فرما ہیں ---- میری خاصی مدد کی۔

مولانا مرحوم' مرزا داغ مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں تھے لیکن کئی سال سے ناگ پور میونسپلٹی کے رکن منتخب ہو رہے تھے۔ محلّہ نال صاحب میں میرے گھر کے قریب ہی ناگ پور میونسپلٹی کے ایک مسلمان رکن جناب محمد ابراہیم خان فنا رہتے تھے۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے ان سے بھی یاد اللہ ہو گئی۔ یہ ناگ پور میونسپلٹی کے بڑے جان دار ممبر تھے۔ ان کی دیانت اور انصاف پسندی کی وجہ سے میونسپلٹی کے ہندو اراکین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

ناگ پور کے میونسپل کمیٹی سے جب کبھی ''امید'' میں درج شدہ اشتہارات کے بلوں کے ادا ہونے میں دیر ہو جاتی تھی تو خان صاحب میری بڑی مدد کرتے تھے۔ غرض کہ چھاپہ خانے اور اخبار کی آمدنی سے ملازمت چھوڑنے کے بعد میرے دن آرام سے کٹنے لگے اور میں نے مقامی اور ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا جس کی وجہ سے بعد میں مجھے بڑی مشکلات سے بھی دو چار ہونا پڑا ---- یہاں تک کہ وہیں دو بار سرکاری مہمان خانے کی بھی سیر کی۔

اچھا' حکیم صاحب' اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں کچھ بتایئے:

موجودہ مصروفیت (۱۹۷۵ء): خانہ نشینی کے سوا کچھ نہیں ---- یہاں' (۱۹۴۷ء

کے بعد) کراچی پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ''نئی دنیا'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا جو کئی ماہ تک کامیابی سے چلا لیکن کچھ تو میری تلون مزاجی اور کچھ کارکنوں کی بے پروائی سے بند ہو کر رہ گیا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ''نقاش'' کے نام سے دوسرا ہفتہ وار اخبار نکالا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو ''نئی دنیا'' کا ہو چکا تھا۔

کچھ دنوں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے پندرہ روزہ ''قومی زبان'' کا بھی ایڈیٹر رہا لیکن یہ خدمت بالکل اعزازی تھی۔ تقریباً ایک سال تک روزنامہ ''انجام'' (دور ثانی) کراچی' کا بھی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا۔

کراچی میں اسلامیہ کالج' نیشنل کالج' نیشنل سٹی کالج اور بنی باغ کالج میں عربی' فارسی' اردو اور تاریخ اسلام کے لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا-----ایک سال تک نیشنل سٹی کالج کراچی کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی کام کیا------ کالجوں کے سرکاری تحویل میں آنے کے بعد تعلیم و تدریس کے شغل کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔

بابائے اردو سے آپ کی پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی لیکن آپ کا احساس ہے کہ یہ ملاقات صاحب سلامت کی حد سے آگے نہ بڑھی------ پھر بعد میں آپ ان سے بے حد قریب ہوئے اور وہ آپ پر حددرجہ اعتماد کرنے لگے۔ اس حوالے سے آپ تقسیم ہند سے قبل تک بابائے اردو سے اپنے مراسم اور تعلق کی نوعیت پر روشنی ڈالیے:

تقسیم ہند سے قبل بابائے اردو مرحوم سے میرے تعلق کا آغاز اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کے مقدس کام سے ہوا------ڈاکٹر امبید کار ہندوستان کے اچھوتوں کے مشہور لیڈر تھے۔ وہ ماہر قانون دان اور کامیاب بیرسٹر تھے------ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اور ان کے پیرو جلد ہی ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیں گے۔ اگر چہ ڈاکٹر امبید کار کا یہ اعلان جیسا کہ بعد کے حالات اور واقعات سے ثابت ہوا' خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ تھا لیکن تھا تو بہرحال ایک انقلابی اعلان۔ (اس اعلان سے) نہ صرف ہندوستان کے عیسائی مشنوں بلکہ یورپ اور امریکہ کے عیسائی تبلیغی

اداروں میں اچھی خاصی ہل چل پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے سکھ بھی اس صورت حال اور اس کے مفروضہ نتائج کے زیر اثر میدان میں کود پڑے۔

ناگ پور' اچھوتوں کی ایک شاخ میاروں بڑا مرکز تھا۔ میاروں کو دکن کے بعض علاقوں میں ڈھیڑ بھی کہتے تھے۔ ناگ پور کے میاروں کے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتی تھی۔ میرے چھاپے خانے میں بھی کچھ میار لڑکے اور نوجوان کام کرتے تھے۔ ناگ پور کے اچھوت خصوصاً میار ڈاکٹر امبیڈکار کی اس "مذہب چھوڑ" تحریک میں پیش پیش تھے۔ اس "مذہب چھوڑ" تحریک کو وہ مرہٹی زبان میں "دھر مانتر" کہتے تھے اور ناگ پور اس "دھرمانتر" تحریک کا اچھا خاصہ مرکز بن گیا تھا۔

یہ تحریک ابتدا میں تو دکن تک محدود تھی بعد میں شمالی ہندوستان تک پھیل گئی اور لکھنو اور آس پاس کے اچھوت لیڈروں نے لکھنو میں اسی مقصد کے پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے ایک آل انڈیا اچھوت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ مجھے بھی اپنے پریس کے مرہٹہ کارکنوں کے ذریعے اس تحریک سے اچھی خاصی دل چسپی پیدا ہو چلی تھی۔ اس لیے میں نے طے کیا کہ اس کانفرنس میں شرکت کی جائے۔

میں نے اس کا ذکر اپنے مخلص کرم فرما اور صاحب دل رئیس نواب محی الدین خاں صاحب مرحوم سے کیا' جو اس علاقے کے سب سے بڑے مسلمان زمیندار اور تعلقہ دار تھے۔ انہوں نے میری اسکیم سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا اور پھر باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ ناگ پور سے ایک لاری کے ذریعے ناگ پور اور ملحقہ علاقوں کے ان اچھوت لیڈروں کو لے کر جو اسلام اور اسلامی خیالات و نظریات سے کسی حد تک اتفاق اور ہمدردی رکھتے تھے' لکھنو کی کانفرنس میں ضرور شرکت کی جائے۔

نواب محی الدین خان صاحب مرحوم نے آنے جانے کے پٹرول کے مصارف اور شرکائے سفر کے قیام و طعام اور دیگر مصارف کا ذمہ لیا------اور ناگ پور ہی کے چند ان مسلمانوں نے جو لاریوں اور بسوں کے مالک تھے اور جن کی لاریاں اور بسیں

ناگ پور اور آس پاس کے شہروں اور قصبات تک آتی جاتی رہتی تھیں' ایک نئی بس' ڈرائیور اور کنڈکٹر کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ میں اور میرے مخلص کرم فرما اور دوست جناب محمد ابراہیم خان فنا تقریباً تیں پچیس اچھوت لیڈروں کو ساتھ لے کر بس کے ذریعے لکھنو روانہ ہو گئے۔

لکھنو کانفرنس کے سلسلے میں عیسائیوں اور سکھوں نے بڑی تیاریاں کی تھیں لیکن ان کی بدقسمتی کہ ان کے ساتھ خود اچھوت لیڈر نہ تھے جب کہ ہمارے ساتھ جنوبی ہند کے متعدد قابل ذکر اچھوت رہنما تھے جن میں ''بابا اشت پاون'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لکھنو کانفرنس میں مسلمانوں کا پلہ اپنی کم مائیگی کے باوجود بھاری رہا۔

اچھوت کانفرنس کے خاتمے کے بعد لکھنو کے مسلمان شہریوں نے ہمارے اچھوت وفد کے اعزاز میں متعدد تقریبات کا انتظام کیا------ان جلسوں میں جہاں ہمارے اچھوت ساتھیوں میں کچھ لوگ تقریریں کرتے تھے مجھے بھی بولنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ خاص طور سے چودھری خلیق الزماں مرحوم میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے شعیب قریشی مرحوم کے نام ایک تعارفی خط دیا۔ شعیب قریشی مرحوم ان دنوں بھوپال میں وزیر حضوری تھے۔ میں ان سے ملا۔ انہوں نے میری باتیں بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنیں اور بھوپال سے چلتے وقت مجھے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے نام ایک زوردار تعارفی خط دیا۔

سوئے اتفاق سے ناگ پور واپس آ کر میں چند ایسی کاروباری الجھنوں میں پھنس گیا کہ کئی مہینے تک ناگ پور سے نکلنے کا موقع نہ ملا۔ آخر جب حالات قدرے سدھر گئے تو میں شعیب صاحب کے خط کے ساتھ حیدرآباد روانہ ہو گیا------ لیکن راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ جناب عبدالحق صاحب' جنہیں لوگ' ملحد اور دہریہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے' وہ ''تبلیغ اسلام'' کے مقدس مشن میں کیا امداد کریں گے------ لیکن شعیب صاحب کا حکم تھا' اس لیے بہرحال میں حیدرآباد حاضر ہو گیا۔ شعیب صاحب کے تعارفی خط کے پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی کیوں کہ بابائے اردو مرحوم سے شعیب

صاحب کی ملاقات ہوگئی تھی اور انہوں نے سب کچھ بابائے اردو کو بتا دیا تھا۔

بابائے اردو مرحوم نے اس سلسلے میں مجھ سے تنہائی میں کئی بار گھنٹوں باتیں کیں۔ میں نے یہ طریقہ کار طے کیا تھا کہ اگر مسلمان براہ راست اس معاملے میں ہاتھ ڈالیں گے تو اونچی ذات کے ہندو ہوشیار ہو جائیں گے اور پھر ان کے سرمایہ دار اپنی دولت کے بل بوتے پر ہماری ساری کوششیں ناکام بنا دیں گے۔۔۔۔اس لیے جو کچھ کرنا ہے وہ ان اچھوت لیڈروں کی معرفت کیا جائے جو اسلام کی طرف مائل ہیں۔

ان اچھوت لیڈروں میں سب سے زیادہ پرجوش اور مخلص بابا اشت پاون تھے۔ یہ وردھا کے رہنے والے تھے۔ آتش بیان مقرر اور ہندو دھرم کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات سے بھی واقف تھے۔ بابا اشت پاون بظاہر اچھوت اور ہندو تھے لیکن وہ بطور خود اسلام قبول کر چکے تھے۔۔۔۔۔تو بابائے اردو کے مشورے سے طے پایا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ بابا اشت پاون کے توسط سے کیا جائے اور پھر ہمارا کارواں اسی راہ پر چل پڑا۔

بابائے اردو کا آپ کی اس مساعی میں جسے دراصل تبلیغ اسلام کی ایک مخلصانہ کوشش کہنا چاہیے' کیا کردار رہا؟ اور اس کے کیا اثرات اور نتائج مرتب ہوئے؟

بابائے اردو مرحوم نے اس مہم میں بھرپور اور جی کھول کر حصہ لیا اور ان سلسلے کے مصارف کا بڑا حصہ وہ برسوں اپنی تنخواہ سے اس طرح ادا کرتے رہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔۔۔۔۔اس خاموش تبلیغ سے بڑا فائدہ پہنچااور ناگ پور میں متعدد میار خاندان اسلام کی دولت سے سرفراز ہو گئے اور ناگ پور سے ملحق بعض دوسرے علاقوں کے اچھوت بھی بابا جی کے اثر سے اسلام سے آشنا ہو گئے۔ مثال کے طور پر تحصیل کو ہی کے ایک گاؤں دلتور کے سارے اچھوت (میار) حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے اگرچہ اس کی انہیں بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ہماری بدبختی کہ اس کام کی بھنک شمالی ہندوستان کی بعض پیشہ ور تبلیغی انجمنوں

اور بمبئی کے بعض موقع طلب مسلمان لیڈروں کے کانوں تک پہنچ گئی اور انہوں نے اپنے کارکن ناگ پور بھیجنے شروع کر دیئے اور جو کام آہستہ آہستہ خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا' اس میں دھوم دھام اور دکھاوے کا عنصر غالب آ گیا اور اس طرح بابائے اردو مرحوم کی نجی امداد اور اعانت سے اب تک جو کام ہو گیا تھا' آگے نہ بڑھ سکا----سرمایہ دار ہندوؤں کا کیا ذکر خود گاندھی جی مدافعت پر آمادہ ہو گئے اور ان کے اثر اور تلقین سے ہندو سرمایہ داروں نے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے۔

میں نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی تھی۔ میں اور میرے چند احباب باباشت پاون کے ذریعے اس مہم کو آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ تبلیغی کام ایسی راز داری اور خاموشی سے ہو رہا تھا کہ خود میرے ہم کاروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کام کے مصارف کہاں سے اور کیوں کر پورے ہو رہے ہیں۔

تو' (جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا) تقسیم ہند سے قبل بابائے اردو سے میرے تعلق کا آغاز اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کے مقدس کام سے ہوا-----اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' اس کام کا سارا مالی بار بابائے اردو مرحوم نے اٹھایا اور اس طرح اٹھایا کہ ان کے انتہائی قریبی دوستوں کو بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ تبلیغ اسلام کے اس مشن میں حضرت عبدالحق سر فہرست ہیں' وہی عبدالحق' جنہیں خود بعض مسلمان بے دین' ملحد اور دہریہ کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ میں تو اوپر بیان کیے ہوئے حالات کی روشنی میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عبدالحق:

تھا ولی پوشیدہ اور (کسی قدر) کافر کھلا!

اس تبلیغی سرگرمی میں ناکامی پر آپ کا اور بابائے اردو کا ردعمل کیا رہا؟ اس کے بارے میں اگر حافظہ ساتھ دیتا ہو تو کچھ بتایئے:

جب ہمارے اپنے لیڈروں اور مبلغوں کے ہاتھوں ہمارے کام کا خاموشی سے جاری رہنا مشکل ہو گیا تو میں نے انجام پر نظر رکھتے ہوئے' اس سے دست کش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور حیدرآباد جا کر بابائے اردو مرحوم سے جی کھول کر باتیں کیں اور آخر کار وہ

بھی مرے ہم خیال ہو گئے کہ اب اس کام کا جاری رکھنا تقریباً محال ہو گیا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس مشن میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں جو غیر معمولی کامیابیاں نصیب ہوئیں ان کی یاد اب بھی میرے لیے سرمایہ افتخار ہے ۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ بابائے اردو مرحوم کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ ان کی لغزشوں، کوتاہیوں، غلطیوں اور گناہوں سے درگزر کرے اور انہیں جوار رحمت میں جگہ دے کہ ناگ پور، دلتور، پارڈی اور آس پاس کے کئی سو اچھوت گھرانے صرف ایک ان کی اخلاقی اور مالی امداد کے سہارے اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے اور آج بھی وہ اور ان کی اولاد ناگ پور شہر اور آس پاس کے بعض دیگر علاقوں میں جرات واستقلال سے اسلام کے دامن سے وابستہ ہے۔

میرے ذہن میں اس سلسلے میں بڑی بڑی اسکیمیں تھیں جن میں سے سب سے بڑی اور اہم اسکیم یہ تھی کہ ناگ پور میں ایک تبلیغی کالج قائم کیا جائے جس کا سب سے پہلا زینہ یہ تھا کہ فی الحال کم سے کم سو اچھوت (میار) بچوں کی شمالی ہندوستان کے کسی دینی مدرسے میں زیر تعلیم و تربیت رکھا جائے اور بابا اشت پاون داس کی امداد و اعانت اور پیہم کوششوں سے سو معزز میاروں نے اپنے بچے ہمارے سپرد کر دیئے اور ہم نے انہیں ندوہ (لکھنو) کے مدرسے میں داخل کرا دیا ۔۔۔۔ لیکن افسوس کہ بعض بے صبر اور جلد باز کارکنوں اور استادوں کی سخت گیری اور سنگ دلی کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

جب میں نے یہ ساری باتیں بابائے اردو مرحوم کو بتائیں تو انہوں نے مجھے ایک انگریز انجینیر کا یہ مقولہ سنایا کہ:

"مشرق میں کام کرنا گناہ ہے۔۔۔۔"

"اور ہم دونوں یعنی میں نے بھی اور تم نے بھی یہ گناہ کیا ہے!"

اس تبلیغی مشن کی ناکامی کے بعد آپ کے اور بابائے اردو کے تعلقات اور روابط کس نوعیت کے رہے؟ مراسم ختم ہو گئے یا بڑھے؟

جب ہماری تبلیغی کوششیں ختم ہوگئیں تو نہ میں نے اپنے تعلقات بابائے اردو مرحوم سے قطع کیے اور نہ خود بابائے اردو مرحوم نے یہ گوارا کیا کہ وہ مجھ سے کنارہ کش ہو جائیں------چنانچہ اب میں نے ان کی تحریک "تحفظ زبان اردو" میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔

میں نے بابائے اردو مرحوم کے ساتھ ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ ناگ پور، جبل پور، احمد آباد، بمبئی، مدراس، کالی کٹ، گوالیار، کراچی وغیرہ میں اردو کے تحفظ و ترقی کے ضمن میں بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کیں------ تحریری اور تقریری مہمات میں ان کا ہاتھ بٹایا-----اور پورے دس سال تک تحفظ اور ترقی اردو کے مشن میں ان کا شریک اور رفیق رہا۔ اس دس سال کی مدت میں صرف دو برس بابائے اردو مرحوم کے بے حد اصرار پر میں نے انجمن ترقی اردو (ہند) سے پچھتر روپے ماہانہ کا معاوضہ قبول کیا۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی میں بابائے اردو کی مزاجی کیفیت کے بارے میں آپ کا تاثر؟

بابائے اردو مرحوم مجھ سے پہلے کراچی آ چکے تھے اور یہاں انہوں نے انجمن ترقی اردو کا مرکز اور دفتر قائم کیا۔ دلی میں انجمن ترقی اردو پر جو بیتی تھی، اس کا اثر بابائے اردو مرحوم پر بہت خراب پڑا۔ ان کی طبیعت میں افسردگی کے ساتھ چڑ چڑے پن نے جگہ پکڑ لی------ کام بہت بڑا اور سرمایہ کم-----نتیجہ یہ ہوا کہ بابائے اردو مرحوم ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے۔ ان کا عزم و حوصلہ اور قوت ارادی گرتے ہوؤں کے لیے زندگی اور امید کا پیام ہوتی تھی، اور کہاں اب یہ حال کہ وہ خود دل برداشتہ اور ناامید ہو کر رہ گئے تھے۔

کراچی میں بابائے اردو کے پرانے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی کوئی یاد؟ خود یہاں بابائے اردو سے آپ کے مراسم اور تعلق کی نوعیت کیا رہی؟

بابائے اردو کے پرانے رفیقوں میں شعیب قریشی مرحوم، عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم، سید تقی الدین مرحوم اور پیر سید حسام الدین راشدی کراچی میں تھے۔ انجمن ترقی

اردو کے لیے مکان اور دفتر کی فراہمی کے سلسلے میں پیر سیّد حسام الدین راشدی' حکیم محمد احسن اور پیر الٰہی بخش مرحوم نے بابائے اردو کی بڑی مدد کی۔

بابائے اردو کے دیرینہ رفیق کار سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم' بابائے اردو مرحوم کے ساتھ ہی انجمن کے دفتر میں موجود تھے۔۔۔۔ مگر افسوس کہ کراچی میں اورنگ آباد' حیدر آباد' اور دہلی کی فضا نہ پیدا ہو سکی۔۔۔۔اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لوگ اپنی آباد کاری میں لگے ہوئے تھے۔ معاش ہے تو مکان نہیں' مکان ہے تو معاش نہیں۔ غرض کہ ایک افراتفری کا عالم تھا۔

اس عالم میں جب میں کراچی پہنچا تو بابائے اردو مرحوم نے بہ کمال مہربانی مجھے انجمن کے دفتر میں قیام کی اجازت دے دی اور پندرہ روزہ ''قومی زبان'' کی ایڈیٹری بھی سپرد کر دی۔ یہ کام میں اعزازی طور پر کرتا تھا۔ اب تک میں کراچی میں تنہا تھا' لیکن جب میری بیوی بچے ہندوستان سے یہاں پہنچ گئے تو مجبوراً مجھے انجمن سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی اور پیر سیّد حسام الدین راشدی کی عنایت سے مجھے لاڑکانہ کے ایک گاؤں طیّب میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے اور میں دو تین سال تک وہیں رہا۔۔۔۔ کبھی کبھار آ کر بابائے اردو مرحوم سے مل لیا کرتا تھا۔

کراچی میں بابائے اردو کو اپنے بعض ساتھیوں سے شکایات پیدا ہوئیں۔ ان اختلافات کے بارے میں کچھ بتانا آپ پسند کریں گے؟

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر سر شیخ عبدالقادر مرحوم اور آنریری جنرل سیکرٹری بابائے اردو مرحوم تھے۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد بابائے اردو مرحوم انجمن کے صدر اور سید تقی الدین مرحوم سیکرٹری مقرر ہوئے۔ سید تقی الدین مرحوم بڑے باعمل انسان تھے۔ وہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ بابائے اردو مرحوم اور سید تقی الدین مرحوم کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے انجمن کے دفتر سے ملحقہ دو عمارتوں میں ''اردو کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔

اب انجمن میں زندگی پیدا ہو چلی تھی۔ ہر وقت چہل پہل رہتی تھی لیکن اس کا

ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کالج کے مصارف کے سلسلے میں خود انجمن ترقی اردو کا ہزاروں روپیہ صرف ہو گیا اور اس طرح انجمن کے تصنیفی و طباعتی کام معرض التوا میں پڑ گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بابائے اردو مرحوم اور سید تقی الدین مرحوم کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سید تقی الدین مرحوم انجمن کے سیکرٹری کے منصب سے مستعفی ہو گئے۔

بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو بھی غنیمت تھا' لیکن اس کے شاخسانے بڑھتے ہی گئے۔ اس وقت ''اردو کالج'' کے پرنسپل میجر سید آفتاب حسن تھے۔ ان سے بھی بابائے اردو مرحوم کی ان بن ہو گئی۔ چند لوگ بابائے اردو کے ساتھ اور کالج کے اساتذہ اور شہر کے بہت سے بااثر لوگ میجر سید آفتاب حسن کے ہم نوا ہو گئے۔ اس اختلاف نے بڑی گھناؤنی شکل اختیار کر لی۔ الزام' جوابی الزام اور اخباروں میں موافق مخالف بیان بازی تک نوبت پہنچی۔

اسی دوران بعض ناگزیر حالات کی بنا پر لاڑکانہ سے پھر واپس کراچی آ گیا' لیکن انجمن کے ناگفتہ بہہ حالات کے پیش نظر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں انجمن کے معاملات سے خود کو الگ تھلگ رکھوں' لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا' جب میں بابائے اردو مرحوم سے نہ ملوں۔ چنانچہ کراچی میں رہتے ہوئے بھی تقریباً دو سال تک میں بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا جس کا بابائے اردو مرحوم کو بجا طور پر ملال تھا۔

بابائے اردو سے ازسرنو آپ کا رابطہ پھر کب اور کن حالات میں ہوا؟

۱۹۵۶ء میں مجھے پتہ چلا کہ بابائے اردو مرحوم پیچش میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ایلوپیتھی' یونانی اور ہومیو پیتھک علاج کے بعد شکایت بدستور ہے۔ میں برسوں بابا اردو کے ساتھ رہ چکا تھا اور ان کا مزاج داں تھا۔ چھوٹی موٹی بیماریوں میں ان کا علاج بھی کیا کرتا تھا' چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔۔ بہت خوش ہوئے۔ علاج شروع کیا اور غذا میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ہفتہ عشرہ میں وہ صحت یاب ہو گئے۔ اب مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں چھوڑ کر نہ جاؤں۔ چنانچہ میں نے ان کے ساتھ رہنا شروع

گیا۔

اُن ایام میں کون کون اصحاب بابائے اردو سے قریب تھے؟ اور بابائے اردو کی' اردو کالج کے پرنسپل سے کشمکش کس درجے میں تھی؟

اس وقت بابائے اردو قوم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں جناب ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم' جناب حشمت حسین نجمی حال منیجنگ ڈائریکٹر' تھری اسٹار بیٹری' کراچی' جناب ابن انشاء' جناب شجاع احمد خاں زیبا حال پرنسپل' گورنمنٹ کالج ٹنڈو جام قابلِ ذکر ہیں۔ مشفق خواجہ ان دنوں انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھے' اس لیے وہ تو عام طور سے دن بھر ہی رہتے تھے۔

بابائے اردو مرحوم اور میجر آفتاب حسن صاحب پرنسپل اردو کالج کی کشمکش اب تک جاری تھی میں نے انتہائی کوشش کی کہ حالات ساز گار ہو جائیں اور بابائے اردو مرحوم اور میجر آفتاب حسن صاحب کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں' لیکن ساری کوششیں اکارت گئیں بلکہ کچھ الٹا ہی اثر ہوا اور بابائے اردو مرحوم کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ میں میجر آفتاب حسن صاحب کا بہی خواہ اور ہم خیال ہوں------ادھر میجر آفتاب حسن صاحب بھی میری طرف سے کبیدہ خاطر ہو گئے------یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ بابائے اردو مرحوم کا ساتھ نہ چھوڑا کیوں کہ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھے جہاں انہیں بہر حال دن رات کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔

اختلافات کی کوئی حدِ آخر بھی تو ہو گی؟

اختلافات یہاں تک بڑھے کہ بابائے اردو مرحوم جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر تھے انجمن کے اردو کالج کی مجلس منتظمہ کے بھی صدر تھے------اردو کالج کی مجلس منتظمہ کی صدارت سے سبکدوش کر دیے گئے۔ اس طرح انجمن ہی کا قائم کردہ کالج' اب انجمن کا رقیب بن کر سامنے آ گیا اور مخالفت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی اور بابائے اردو مرحوم اس حد تک بے دست و پا ہو گئے کہ ان کا وجود عدم برابر ہو کر رہ گیا۔

اختلافات کی اس دلدل سے بابائے اردو کے لیے کب اور کیونکر نکلنا ممکن ہو سکا؟

اس ناگفتہ عالم میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم جو مارشل لاء کے حاکم اعلیٰ تھے بابائے اردو کی دستگیری کو بڑھے اور انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ایک آرڈی نینس کے ذریعے اردو کالج اور انجمن ترقی اردو کی منتظمہ مجلسوں کو توڑ کر ایک نئی کمیٹی نامزد کر دی۔ اس آرڈینینس نے کم سے کم بابائے اردو مرحوم کے لیے وہی کام کیا جو پانی' دھان کے سوکھے ہوئے کھیتوں کے لیے کیا کرتا ہے۔

حکیم صاحب! ایوب خاں مرحوم کا آرڈینینس ۱۹۵۹ء میں آیا-----۱۹۶۱ء میں بابائے اردو کا انتقال ہو گیا-----ان آخری برسوں میں آپ برابر ان کے رفیق اور دمساز رہے ان برسوں میں ان کے عزائم کیا تھے اور عام صحت کیسی تھی؟

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے آرڈینینس کے بعد بابائے اردو مرحوم نے پھر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنا شروع کیا' لیکن اب وہ اٹھاسی سال کے ہو چکے تھے۔قوئ جواب دے گئے تھے اور قوت عمل تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی تھی------ کسی نہ کسی طرح دو ڈھائی سال تک ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہی لیکن ۱۹۶۱ء کے آغاز میں ان کی کمزوری' ناطاقتی اور افسردگی نے انتہائی بھیانک شکل اختیار کر لی۔

بظاہر وہ تندرست نظر آتے تھے' لیکن اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے تھے-----غالباً ۴۔مئی ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ ان کے بازوؤں پر پڑا تو مجھے یہ اندازہ کر کے انتہائی دہشت اور وحشت پیدا ہوئی کہ ان کے بازوؤں کا سارا گوشت تحلیل ہو کر رہ گیا ہے' صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔

اس صورت حال کو سنبھالنے میں آپ نے کیا کیا؟ ان کی تشویشناک علالت' اور بالآخر ان کے مرض الموت کی کچھ تفصیلات ضرور آپ کے ذہن میں ہوں گی؟

اسی دن میں نے (یعنی ۴۔ مئی ہی کو) جناح سینٹرل ہاسپٹل (کراچی) کے ایڈمنسٹریٹر کرنل رشید صاحب کو فون کیا کہ اسپیشل وارڈ میں بابائے اردو کے لیے ایک کمرہ مخصوص کردیا جائے۔ کرنل صاحب بابائے اردو مرحوم کے نیاز مندوں میں تھے۔ انہوں نے ۵۔ مئی ۱۹۶۱ء کو بابائے اردو مرحوم کو ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں داخل کر لیا اور پھر یہاں کامل دو ہفتے کی مسلسل دیکھ بھال اور تشخیص کے بعد یہ طے پایا کہ بابائے اردو مرحوم جگر کے سرطان میں مبتلا ہیں----سرطان کا علاج اور پھر اس عمر میں محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔

جب کراچی میں افاقہ نہ ہوا تو فیلڈ مارشل ایوب خاں مرحوم کی دعوت پر انہیں کراچی سے مری لے جایا گیا اور وہاں کے ملٹری کے کمبائنڈ ہسپتال میں داخل کر دیا۔ بابائے اردو مرحوم زیادہ عرصے تک مری اور کچھ دنوں پنڈی کے ملٹری کمبائنڈ ہسپتال میں رہے۔ آخر جب زندگی کی کوئی امید نہ رہ گئی تو پھر میں انہیں ریل کے ذریعے کراچی لے آیا۔ یہاں وہ نیوی کے ہسپتال میں داخل ہوئے اور ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

۵۔ مئی ۱۹۶۱ء سے ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء تک دن رات ان کے ساتھ رہا اور جہاں تک ہو سکا میں نے ان کی تیمار داری کی ----ان تفصیلات کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کراچی میں بابائے اردو مرحوم کی زندگی بڑے ناسازگار حالات میں گزری۔ انہیں غیروں سے نہیں اپنوں سے رنج پہنچا۔ خدا جزائے خیر دے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کو کہ آخری عمر میں وہ ان کے کام آئے ورنہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان کا حشر کیا ہوتا۔

اس طرح تقسیم ملک کے بعد کراچی میں بابائے اردو مرحوم سے میرے تعلق کی نوعیت ان کی صحت سے زیادہ' ان کی بیماری' علالت اور ان کی آخری گھڑیوں سے معلوم کی جا سکتی ہے----پھر بھی میرے اطمینان کی خاطر یہی بہت کچھ ہے کہ کراچی میں ان کی بیماری اور موت دونوں میں آخر وقت تک میں ان کا رفیق رہا ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

۳

بابائے اردو: ''کسی نے سچ کہا ہے 'خانہ مروّت تباہ'' ----ان
کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملے میں یہی ہوا۔ یہ شخص لکھنو
کے ایک ممتاز خاندان کا تھا۔ بارہا ان تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی
قابل اعتماد نہیں ہے کسی ذریعہ معاش کے باوجود بڑی شان سے
رہتا ہے۔ اسکی دیانت مشتبہ ہے----میں نے بھی اس شخص کو
دیکھا تھا وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے
جواب میں وہ کہتے تھے کہ شریف زادہ ہے۔ گھر سے خوش حال
ہے۔ وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اس سے جلتے
ہیں-----''

[چند ہم عصر: (سرسید احمد خان) ص ۳۴۱]

معین: مولوی عبدالحق کے پروردہ کسی نوجوان کا نام بتائیے؟ کن کن معاملات میں کون کون اصحاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کو یہ بتاتے تھے کہ وہ ''شریف زادہ'' قابل اعتماد نہیں؟

حکیم اسرار احمد: تقسیم ہند سے کچھ دنوں پہلے مولوی حامد علی صاحب ندوی مرحوم انجمن ترقی اردو (ہند) کے مینجر مقرر ہوئے۔ ان کے چھوٹے سالے کا نام سید عین الدین

رضوی تھا۔ یہ اپنے بہنوئی مولوی حامد علی صاحب ندوی مرحوم سے ملنے کے لیے دلی آتے رہتے تھے اور یہیں وہ بابائے اردو سے متعارف ہوئے لیکن دلی تک یہ تعارف محض رسمی اور سرسری رہا ------ کراچی میں ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء کے دوران سید عین الدین رضوی بابائے اردو مرحوم کی زندگی میں کچھ اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے بہت سے پرانے رفقائے کار کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ خصوصاً مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن پرنسپل اردو کالج (کراچی) کو بابائے اردو مرحوم کے طرز عمل اور رویے میں سرد مہری کا احساس پیدا ہوا ----- اور ان دونوں صاحبوں نے یہ خیال کیا کہ بابائے اردو مرحوم کے طرز عمل میں یہ تبدیلی سید عین الدین رضوی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے یہ دونوں بزرگ جب کبھی انہیں موقع ملتا بابائے اردو مرحوم کی سید عین الدین رضوی کے بارے میں اپنی صوابدید کے مطابق باخبر کرنے کی کوشش کرتے لیکن عام طور سے اس کا بابائے اردو پر الٹا اثر پڑتا اور وہ عین الدین رضوی سے بدگمان ہونے کے بجائے نسبتاً زیادہ مطمئن ہو جاتے۔ دوسری جانب خود میجر سید آفتاب حسن صاحب اور جناب سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی وقعت بابائے اردو مرحوم کی نگاہ میں گھٹتی جاتی اور اس کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

مولوی سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم انجمن اور بابائے اردو مرحوم سے بیزار ہو کر لاہور چلے گئے ------ اور میجر سید آفتاب حسن نے سید عین الدین کا اثر گھٹانے کی کوششیں شروع کر دیں ----- لیکن بابائے اردو مرحوم کی خوش گمانی عین الدین رضوی کے حق میں دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی گئی اور آخر میجر سید آفتاب حسن اور بابائے اردو مرحوم کے مابین اس ناگوار کشمکش کی بنیاد پڑی جس نے انجمن ترقی اردو اور اردو کالج (کراچی) کی بنیادیں ہلا دیں۔

O

بابائے اردو: ''وہ دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آ
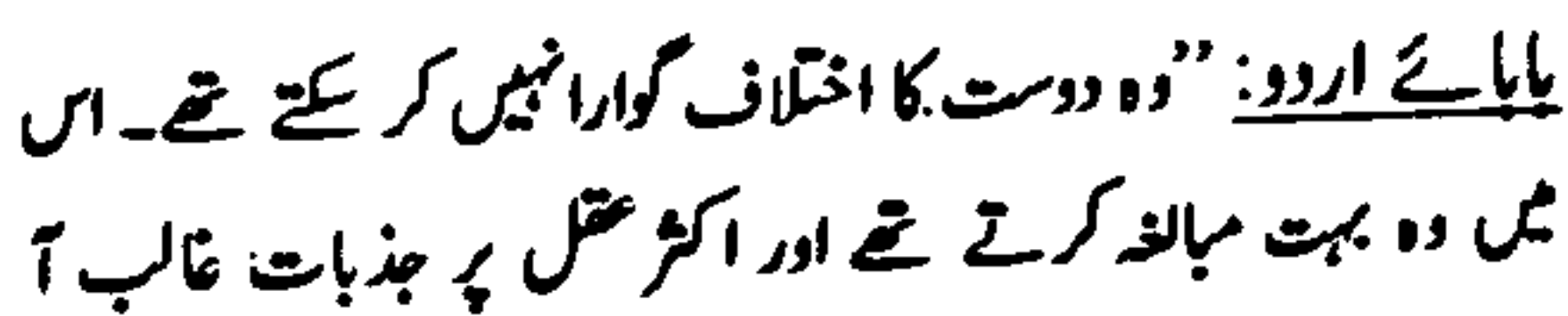
جاتے تھے۔۔۔۔۔؛"

[چند ہم عصر: (سر سید احمد خاں)' ص ۳۴۰]

معین: دوست کا اختلاف گوارا نہ کر سکنے اور اس ضمن میں "اکثر" عقل پر جذبات کے غالب آ جانے کی کوئی مثال یا مثالیں' آپ کے ذہن میں تازہ ہوں تو ' ارشاد فرمایئے:

حکیم اسرار احمد: میجر سید آفتاب حسن سابق پرنسپل اردو کالج (کراچی) کے بزرگوں سے بابائے اردو مرحوم کے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے اور اس قدیمی رشتے کی بنا پر بابائے اردو مرحوم میجر سید آفتاب حسن کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے اور جب میجر صاحب پہلے پہل کاکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اردو کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کراچی آئے تو کالج کے اساتذہ اور طلباء نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تو بابائے اردو مرحوم نے بھی اس میں میجر صاحب کی انسانی' تعلیمی اور تدریسی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے انہیں "آب دار تراشیدہ ہیرے" سے تشبیہ دی۔

(لیکن) جب ان کے تعلقات' سید عین الدین رضوی کی وجہ سے میجر صاحب سے کشیدہ ہو گئے تو بابائے اردو مرحوم اکثر ان کی خامیاں' کوتاہیاں اور فروگزاشتیں شمار کراتے ہوئے حد سے گزر جاتے تھے اور جذبات کی شدت میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہنے سے نہ چوکتے تھے جو ان کے شایان شان ہوتی تھیں اور نہ خود میجر صاحب سے ان کے ارتکاب کی توقع کی جا سکتی تھی۔۔۔۔۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہو گی:

انجمن کا دفتر اور اردو کالج جس عمارت میں واقع ہے' وہ ایک ہندو رفاہی ادارے کی تعمیر کردہ تھی۔ جب اس ادارے کے کارکن اور عہدہ دار وغیرہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان منتقل ہو گئے تو انہوں نے بہت سی ناکارہ' فرسودہ اور پرانی چیزوں کے ساتھ ایک تباہ' شدہ موٹر کا ڈھانچہ بھی چھوڑا تھا۔۔۔۔۔اور یہ پرانا ڈھانچہ جس میں زنگ خوردہ لوہے کے سوا کچھ نہ تھا' عمارت ہی کے احاطے کی زمین میں گڑا ہوا تھا۔

جب عمارت کی صفائی ہوئی تو اساتذہ میں سے کسی کی نگاہ اس تباہ شدہ اور زنگ خوردہ ڈھانچے پر بھی پڑ گئی۔۔۔۔۔اتفاق سے میجر صاحب نے ان دنوں اپنے مکان

بہار کالونی میں کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں------نہ جانے انہیں کس نے مشورہ دیا کہ وہ اس تباہ شدہ اور زنگ خوردہ ڈھانچے کو اٹھوا کر اپنے گھر لے جائیں اور اس کو ٹھیک ٹھاک کر کے اور مرمت کرا کے' مرغی کا ڈربہ بنوا لیں۔ شامت اعمال سے میجر صاحب نے یہ بات مان لی اور اس منحوس ڈھانچے کو گاڑی پر لدوا کر اپنے گھر لے گئے۔

جب میجر صاحب سے اختلافات بڑھے تو بابائے اردو مرحوم نے اس ڈھانچے کے بارے میں' وہ وہ شگوفے کھلائے کہ توبہ ہی بھلی----یوں تو عام طور سے بابائے اردو مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن کے مابین اس ''مہا بھارت'' کے دوران بہت کم لوگ بابائے اردو مرحوم سے ملنے جلنے کے لیے آئے تھے' لیکن اتفاق سے اگر کوئی بھولا بسرا اور بھٹکا اجنبی آ نکلتا تو بابائے اردو مرحوم' میجر آفتاب کی ''کارگزاریوں'' کی داستان سناتے ہوئے یہ ضرور فرماتے کہ:

> ''صاحب! حد ہو گئی کہ یہ پرنسپل (میجر سید آفتاب حسن) کالج کی ایک موٹر اڑا کر اپنے گھر لے بھاگا ہے اور یہ موٹر اب تک اس کے تصرف میں ہے------''

ناواقف لوگ بابائے اردو مرحوم کی زبان سے میجر صاحب کے اس ''سرقہ بالجبر'' کی داستان سن کر انگشت بدنداں رہ جاتے-----نئے لوگوں کو کیا معلوم کہ بابائے اردو مرحوم جس ''عجیب و غریب شے'' کو موٹر کا نام عطا فرما رہے ہیں' وہ ایک زنگ خوردہ اور ناکارہ لوہے کے ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں!

○

> <u>بابائے اردو</u>: ''مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے اور ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شایانِ شان نہ ہوتی تھیں''

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی) ص ۱۰۶]

<u>معین</u>: اس رائے کی تائید میں آپ کوئی واقعہ بتانا پسند کریں گے؟

حکیم اسرار احمد: اس کے بارے میں پہلے ہی بابائے اردو مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن صاحب کی کشمکش کے سلسلے میں بعض ٹھوس مثالیں پیش کی جا چکی ہیں، وہی باتیں اس ذیل میں کافی ہیں۔

O

بابائے اردو: ''اگر کبھی ان کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑے جابر اور مستبد ہوتے''

[چند ہم عصر: (مولانا محمد علی جوہر)، ص ۱۵۲]

معین: حکیم صاحب! اس قول کی شہادت میں آپ کیا کہیں گے؟ بابائے اردو کے رویوں پر یہ قول صادق آتا ہو، اس ذیل میں کوئی واقعہ یا تفصیل بتانا آپ پسند کریں گے؟

حکیم اسرار احمد: حسن اتفاق سے بابائے اردو مرحوم کی پوری زندگی قوت و اقتدار کا مظہر تھی۔ جب تک وہ حیدر آباد (دکن) میں رہے، ان کا طوطی بولتا رہا اور دہلی میں تو ان کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار پر تھا------ اور ان کے استبداد و اقتدار کا نشانہ عام طور سے وہ لوگ بنتے جو انجمن کے دفتر کے سربراہ ہوتے تھے اور جنہیں انجمن کے منیجر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے جناب صدیق صاحب مرحوم، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے برادر بزرگ جناب مظفر حسین شمیم، مولوی رشید احمد ایم اے جو آج کل غالباً پنڈی میں ہیں، جناب سید صلاح الدین جمالی جو فی الحال کراچی میں ہیں------ یہ سب حضرات مختلف اوقات میں انجمن کی منیجری پر فائز رہے اور ان میں سے بعض بعض کو بابائے اردو مرحوم کے غیظ و غضب کا اس طرح نشانہ بننا پڑتا تھا کہ فلک کانپ جاتا تھا اور زمین لرز اٹھتی تھی۔

مولوی رشید احمد ایم اے انجمن کے ان محنتی منیجروں میں تھے کہ خود بابائے اردو مرحوم انہیں ان کی لگاتار مشقت و محنت کی بنا پر ''بیل'' کہا کرتے تھے------ وہ انجمن کے منیجر بھی تھے، اکاؤنٹنٹ بھی تھے، پروف ریڈر بھی تھے، طباعت و اشاعت کے مہتمم بھی

تھے اور انجمن کے "افسر مہمانداری" بھی تھے لیکن جب کبھی بابائے اردو مرحوم کو ان کی کسی کوتاہی پر غصہ آتا جو عام طور سے "بے جا" ہوتا تھا تو جو کچھ منہ میں آ جاتا کہہ گزرتے تھے۔ اور انجمن کے دفتر میں گھنٹوں زلزلے کا سماں رہتا۔

وہ نجی ملازموں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور انہیں مناسب معاوضہ بھی دیا کرتے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ بھی وہ اکثر سلوک کرتے رہتے تھے لیکن (کبھی کبھار) ان کے غیظ و غضب سے انہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی۔ ان کے پاس ایک بنگالی لڑکا امان نامی ملازم تھا۔ مہینے میں ایک آدھا بار اس بچارے کی وہ گت بنتی کہ خدا کی پناہ۔ کچیاں اور لکڑیاں ٹوٹ جاتیں لیکن وہ بھی اس بلا کا سخت جان تھا کہ بابائے اردو مرحوم کی بے محابا مار پیٹ کے بعد ویسا ہی چاق و چوبند نظر آتا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ انجمن کے ملازم اور کارکن اس آزمائش اور امتحان میں نہ پڑتے۔

○

بابائے اردو: "دوست بھی ان کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے------"

[چند ہم عصر: (مولانا محمد علی جوہر)' ص ۱۵۳]

معین: بچنے والے دوستوں کے کچھ نام بتایئے اور اپنے مشاہدے کے حوالے سے بچنے کے اسباب کی کچھ تفصیل بھی:

حکیم اسرار احمد: مولوی سید ہاشمی فریدی آبادی مرحوم' بڑی حد تک بابائے اردو مرحوم کے تربیت یافتہ تھے اور نو عمری ہی سے ہر کام میں ان کے شریک اور ساتھی تھے' لیکن میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا' وہ بابائے اردو مرحوم کے قریب اور ان سے بے تکلف ہونے سے بچتے تھے' صرف کام سے کام رکھتے تھے اور بس!

کراچی میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم' انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد اور بابائے اردو مرحوم کے خاص دوستوں اور جاں نثاروں میں تھے۔ وہ ذی علم اور صاحب تصانیف تھے۔ بابائے اردو مرحوم ان کا بڑا خیال رکھتے اور کبھی کبھی جب موڈ میں

ہوتے تو انہیں ''جاگیردار صاحب'' کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن یہ اختر میاں مرحوم جو شاید بابائے اردو مرحوم کے مزاج داں بن گئے تھے ان سے زیادہ ربط و ضبط قائم کرنے سے ہمیشہ بچتے تھے اور کیوں نہ بچتے۔ انہیں اپنی عزت و آبرو عزیز تھی۔

رہے بچنے کے اسباب تو ان کا حاصل صرف یہ کہ بابائے اردو مرحوم نفسیاتی طور پر اس درجہ اشتعال پذیر طبیعت کے مالک تھے اگر مولوی نذیر احمد کی زبان میں ''بھک سے اڑ جانے والے مادے'' سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بابائے اردو مرحوم خود اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے اور انجمن کے کارکنوں سے یہی امید رکھتے تھے۔ ان کی ''سیماب وشی'' بھی ان کے رفیقوں کو ان سے زیادہ قریب ہونے سے روکتی تھی۔

O

بابائے اردو: ''آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا------''

[چند ہم عصر: (مولوی محمد عزیز مرزا)' ص ۶۴ - ۶۵]

معین: اس حوالے سے کچھ مثالیں؟

حکیم اسرار احمد: میں نے حیدر آباد دکن اور دہلی میں اس کی متعدد مثالیں دیکھی ہیں۔ ہندی اردو قضیے کے دوران' جو لوگ بابائے اردو کے قریب ہو گئے تھے' ان میں بنگلور' ریاست میسور کے حکیم امامی اور ایک نوجوان علی شبر حاتمی تھے۔ حکیم امامی بابائے اردو مرحوم سے جتنی زیادہ محبت کرتے تھے اس سے زیادہ اس کی نمائش کرتے تھے۔ علی شبر بقول بابائے اردو مرحوم ایک صالح نوجوان تھے اور یہ بیچارے آنکھ بند کر کے بابائے اردو مرحوم کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہہ دیا کرتے تھے------ ظاہر ہے کہ عقیدت مندوں کے اس جذبہ رفاقت و مودت کا نتیجہ خوشامد پسندی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

کراچی میں بھی بابائے اردو مرحوم اور میجر سید آفتاب حسن کی کشمکش کے دوران کچھ یہی کام ان کے چند جاں نثار کیا کرتے تھے جن میں بابائے اردو مرحوم کے

معتمد خاص ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم' جناب حشمت حسین نجمی ڈائریکٹر تھری اسٹار بیٹری سیل کمپنی لمیٹڈ' جناب ابن انشا اور جناب شجاع احمد خاں زیبا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم' بابائے اردو مرحوم سے بڑی محبت رکھتے تھے اور بھول کر کسی معاملے میں ان سے اختلاف رائے کی جرات نہ کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے ہم خیال رفیقوں اور دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ بھائی ہم سب مولوی صاحب کے جاں نثاروں اور کفش برداروں میں ہیں' ہمارا مسلک محبت اور وفا ہے۔ اسکے سوا ہم کچھ اور نہیں جانتے۔ پھر وہ جوش میں آ کر فارسی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

من و تو ہردو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

نجمی صاحب بھی جو خاصان بابائے اردو مرحوم میں تھے' کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ میں نے انہیں بابائے اردو مرحوم سے اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ:

"مولوی صاحب! ہم تو صرف آپ کے نام لیوا ہیں۔ ہماری نہ اپنی کوئی رائے ہے اور نہ اپنا کوئی خیال ------ جو آپ چاہتے ہیں وہی ہم بھی چاہتے ہیں اور جو آپ آئندہ بھی چاہیں گے وہی ہم بھی چاہیں گے-----"

ظاہر ہے کہ یہ بات وہ غایت محبت کے جذبے میں کیا کرتے تھے لیکن انسان میں کمزوریاں بھی تو ہیں۔ اس قسم کی باتوں سے بابائے اردو مرحوم میں یقیناً "خوشامد پسندی" کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔

نجمی صاحب یارانِ باصفا (ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم' جناب ابن انشا اور جناب شجاع احمد خاں زیبا وغیرہ) کے جھرمٹ میں اکثر مولوی صاحب مرحوم سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ماقصۂ سکندرودارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

○

بابائے اردو: ''لڑ جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔۔۔۔۔''

[چند ہم عصر: (سر سید راس مسعود)، ص ۲۱۰]

معین: لڑ جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے کام نکال لینے کی الگ الگ کچھ مثالیں، آپ کے حافظے میں مستحضر ہوں تو کچھ ایسے واقعات بیان فرمایئے:

حکیم اسرار: بابائے اردو مرحوم برسوں حیدر آباد دکن میں رہے۔ سر اکبر حیدری مرحوم سے ان کے گہرے مراسم اور تعلقات تھے۔ متعدد بار ان کی زندگی میں ایسے موڑ آئے کہ انہوں نے سر اکبر حیدری مرحوم سے لڑ جھگڑ کر اپنا کام نکال لیا۔

اس ضمن میں مجھے خاص طور سے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ بابائے اردو مرحوم کے حکیم محمد اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم سے بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ دونوں بزرگ جامعہ ملیہ دہلی کے ارباب حل و عقد میں تھے۔ ایک بار جامعہ ملیہ، دہلی کی مالی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس کے بند ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ یہ دونوں بزرگ دہلی سے اورنگ آباد بابائے اردو کے پاس آئے اور جامعہ ملیہ کی صورت حال ان کے گوش گزار کی۔

جامعہ ملیہ دہلی ایک قوم پرست ادارہ تھا اور ریاست حیدر آباد برطانوی حکومت کی وفادار تھی۔ کام بڑا مشکل تھا لیکن بابائے اردو مرحوم، حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کو بے نیل و مرام واپس بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ جب حکیم صاحب مرحوم اور ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے مشن کے سلسلے میں اورنگ آباد پہنچے تو بابائے اردو مرحوم سخت بخار میں مبتلا تھے اور انہیں ملیریا نے دبوچ رکھا تھا۔ ملیریا اور پھر دکن کا ملیریا۔۔۔۔۔ بلا کا شدید اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن بابائے اردو مرحوم اسی حال میں کمبل لپیٹے ہوئے اورنگ آباد سے حیدر آباد پہنچے اور سر اکبری حیدری مرحوم سے ملے۔

سر اکبر حیدری مرحوم بابائے اردو مرحوم کو بخار میں مبتلا دیکھ کر گھبرا گئے اور

انہوں نے بابائے اردو مرحوم سے بخار کی حالت میں اورنگ آباد سے حیدر آباد تک سفر کرنے کی ضرورت معلوم کرنی چاہی----بابائے اردو مرحوم نے جامع ملیہ دہلی کی سقیم مالی حالت اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے اورنگ آباد آنے کا بیان کیا۔

سر اکبر حیدری مرحوم بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ جامعہ ملیہ کا ادارہ حکومت ہند کے خلاف سرگرم عمل رہتا ہے اور ریاست حیدر آباد برطانوی حکومت کی دست نگر ہے۔ اس لیے کسی قسم کی امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا----لیکن بابائے اردو مرحوم کہاں سپر ڈالنے والے تھے۔ وہ اسی بخار کی حالت میں گھنٹوں سر اکبر حیدری مرحوم سے برسر پیکار رہے۔ آخر بیگم حیدری مرحوم کو دخل دینا پڑا اور سر اکبر حیدری مرحوم بابائے اردو کے لڑکے جھگڑنے کی تاب نہ لا سکے۔ بادل ناخواستہ انہوں نے پچاس ہزار کی امدادی رقم منظور کی۔

اسی طرح جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) میں شعبہ اردو کے تقرر کے سلسلے میں انہیں یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے بڑی تاریخی جنگ کرنا پڑی۔ بابائے اردو نے اس اسامی کے لیے پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی مرحوم کا نام پیش کیا تھا اور پروفیسر وحید الدین سلیم کے پاس کوئی بڑی ڈگری تو کجا معمولی سند بھی نہ تھی' لیکن بابائے اردو مرحوم یکا و تنہا برابر جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے سربراہوں نے سپر ڈال دی اور جناب وحیدالدین سلیم مرحوم جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کے صدر مقرر ہو گئے۔

اس تقرر کے سلسلے میں جب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے یہ عذر پیش کرنے کی جرات کی کہ جناب وحید الدین سلیم کے پاس وہ ڈگریاں نہیں' جو اس منصب کے لیے یونیورسٹی کے آئین کی رو سے ضروری اور لازمی ہیں تو بابائے اردو مرحوم نے فرمایا کہ اس یونیورسٹی کے سارے اساتذہ کی ڈگریاں زمین پر بچھا دی جائیں اور وحید الدین سلیم ان پر اپنا پاؤں رکھ دیں تو شاید پھر یہ ڈگریاں مستند اور معتبر خیال کی جا سکیں۔

کچھ اسی قسم کے خیالات ان کے حافظ محمود شیرانی مرحوم سابق پروفیسر اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بارے میں بھی تھے۔ شیرانی مرحوم کے پاس بھی کوئی قابل ذکر ڈگری نہ تھی لیکن بابائے اردو مرحوم نے بار بار مجھ سے فرمایا کہ اس وقت پورے ملک میں تحقیق و تنقید کا حق صرف شیرانی ادا کرتے ہیں اور وہی ادا کر سکتے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے محقق اور نقاد ان کے سامنے بونوں کی سی حیثیت نہیں رکھتے-----ایک بار جب ان سے کسی نے کہا کہ ''کیا آپ بھی انہیں بونوں کی صفت میں شامل ہیں'' تو بابائے اردو مرحوم نے برجستہ جواب دیا کہ ''میں تو ان کی خاک پا بننے کا بھی اہل اور مستحق نہیں۔'' صاحبان علم کی شان یہی ہوتی ہے۔

وہ حیدر آباد میں لوگوں کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں خوشامد اور چاپلوسی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ریاست میں ''ملازمتوں کے دلال'' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ وہ صاحب غرض لوگوں کا کام نکالنے کے سلسلے میں وزیروں، امیروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اہل کاروں سے بھی التجا کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

O

بابائے اردو: ''وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے-------''

[چند ہم عصر: (سر سید راس مسعود)، ص ۲۰۱]

معین: اس حوالے سے کوئی یاد؟ مثال؟

حکیم اسرار: دوستوں سے بہلا پھسلا کر کام نکال لینے کے سلسلے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کا تعلق خود مجھ سے ہے------انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کے مارشل لاء کے زیر انتظام آنے کے بعد مارشل لاء کی مقرر کردہ کمیٹی نے سید عین الدین رضوی پر ایک فرد جرم عائد کر دی بابائے اردو مرحوم سید عین الدین رضوی کے بڑے ہمدرد تھے۔ بابائے اردو مرحوم چاہتے تھے کہ اس فرد جرم کا مناسب اور معقول جواب دیا جائے لیکن قباحت

یہ تھی کہ ان کے عقیدت مندوں میں کوئی اس کام پر آمادہ نہ ہو سکا۔۔۔۔آخر بابائے اردو مرحوم کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی اور انہوں نے بڑی لجاجت سے مجھ سے کہا:

> ''حکیم صاحب! اب تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔ سید عین الدین رضوی پر میری ہی وجہ سے یہ آفت آ پڑی ہے۔۔۔۔۔اب اکی نہیں، میری عزت تمہارے ہاتھ ہے''

میں بابائے اردو مرحوم کے اس مایوسانہ طرز کلام کی تاب نہ لا سکا۔۔۔۔۔۔اور پھر میں نے اپنے ایک کرم فرما وکیل کے ذریعے فرد جرم کا شافی جواب لکھوا کر اور ٹائپ کرا کے بابائے اردو کو نذر کیا۔۔۔۔۔۔بہت خوش ہوئے اور اس طرح میری تعریف و توصیف کی جیسے کوئی غرض مند صاحبِ معاملہ کسی حاکم مجاز کی کرتا ہے۔

O

> بابائے اردو: ''ان کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے، جب ان کے خیراندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیاوی اعتبار سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن انہوں نے وہی کیا جو ان کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرات سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔۔۔۔۔۔''
>
> [چند ہم عصر: (سرسید احمد خاں)، ص ۳۳۷]

معین: اس قول کی تائید میں کچھ واقعاتی شہادتیں؟

حکیم اسرار احمد: اس ضمن میں صرف ایک ہی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ بابائے اردو مرحوم جب عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد پروفیسر عنایت اللہ مرحوم کی وفات کے بعد، عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ناظم مقرر ہوئے تو اسی اثناء میں ریاست جے پور کے ایک صاحب حیدر آباد تشریف لائے اور انہوں نے فارسی میں میر عثمان علی خاں مرحوم کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، کسی طرح انہیں میر عثمان علی خاں مرحوم کی بارگاہ

میں رسائی ہوگئی اور انہوں نے شاہ عالی جاہ کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا۔ میر عثمان علی خاں مرحوم قصیدہ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔۔۔۔۔۔اور انہوں نے معمولی کاغذ کے ایک چھوٹے پرزے پر بابائے اردو مرحوم کے نام ایک فرمان لکھا کہ "حامل ہذا" کو دارالترجمہ میں کسی مناسب اسامی پر مقرر کر دیا جائے۔

حیدر آباد (دکن) کا دستور تھا کہ امراء، اہل کار، خواص اور عوام، سب شاہی فرمان کا شایان شان احترام کرتے تھے اور "باادب باملاحظہ اور ہوشیار" ہو کر تسلیمیں بجا لاتے تھے۔ بابائے اردو مرحوم نے اس دستور کی پابندی نہ کی اور فرمان جے پوری بزرگ سے لے لیا۔۔۔۔۔ جب انہیں ضروری کاموں سے فرصت ہوئی تو انہوں نے شاعر گرامی کو دفتر میں طلب کر کے یہ پوچھا کہ وہ عربی، انگریزی، فارسی یا یورپ کی کسی دوسری زبان سے واقف ہیں تو انہوں نے صرف فارسی جاننے کی حامی بھری۔

بابائے اردو مرحوم نے انہیں کسی فارسی کتاب سے ایک پارہ، اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ ترجمہ کرنے کو تو انہوں نے کر دیا، لیکن وہ اتنا غلط سلط تھا کہ بابائے اردو مرحوم نے شاہی فرمان ہی کے ایک گوشے میں لکھ دیا کہ درخواست گزار کسی اسامی کا اہل نہیں۔ جے پوری شاعر، شاہی فرمان لے کر بڑی امیدوں کے ساتھ آئے تھے لیکن جب بابائے اردو مرحوم نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا تو وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھے اور شاہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

میر عثمان علی خاں، شاعر کی زبان سے اپنے فرمان کی توہین کی روداد سن کر آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بابائے اردو مرحوم کو ریاست حیدر آباد سے خارج کرنے کا فرمان صادر کر دیا۔ بابائے اردو مرحوم نے انتہائی عجلت میں اپنا ذاتی سامان اور کتابیں سکندر آباد اسٹیشن پر بھجوا دیں۔ جب حیدر آباد کے امراء وزراء اور ریاست کے بہی خواہوں کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ دوڑے دوڑے بابائے اردو مرحوم کے پاس آئے۔

ان سب نے اور خاص طور سے نواب فخر یار جنگ مرحوم نے جو اس وقت مالیات کے وزیر تھے، بابائے اردو مرحوم کو طرح طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے

فیصلے پر نظر ثانی کرلیں اور شاعر کو دارالترجمہ میں جگہ دے دیں۔ جب ساری دلیلیں اور اپلیں بے کار گئیں تو آخر میں نواب فخر یار جنگ مرحوم نے زچ ہوکر بابائے اردو مرحوم سے کہا:

''مولوی صاحب! اس ریاست میں سینکڑوں گدھے پرورش پا رہے ہیں۔ ایک گدھا آپ بھی اپنے محکمے میں رکھ لیجئے------''

مولوی صاحب نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ:

''قبلہ نواب صاحب! اس گدھے کو آپ اپنے طویلے میں باندھ لیجئے۔ شاہ کے فرمان کی تعمیل بھی ہو جائے گی اور شاید میری جلاوطنی کا حکم بھی واپس لے لیا جائے------''

غرض کہ دو تین روز تک ایوان حکومت میں ہنگامہ برپا رہا۔ جب بابائے اردو مرحوم راہ رست پر نہ آئے تو پھر وزیروں' امیروں' درباریوں اور بااثر شہریوں نے اجتماعی طور سے شاہ عالی جاہ سے اپیل کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے خارج الرّیاست کرنے کا فرمان واپس لے لیا جائے۔ آخر میر عثمان علی خاں مرحوم نے ان کی گزارش قبول کر لی۔ شاعر کو نقد انعام سے نوازا گیا' اور بابائے اردو مرحوم کو ریاست سے خارج کرنے کا فرمان منسوخ کر دیا---بابائے اردو کی کامیاب زندگی میں ان کے اس کردار کا بھی گہرا اثر پڑا ہے۔

O

بابائے اردو: ''جن لوگوں نے ان سے برائی کی' انہوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انہوں نے دشمنوں کو نوازا------''
[چند ہم عصر: (مولوی محمد عزیز مرزا)'ص ۲۴]

معین: حکیم صاحب! اس حوالے سے کچھ مثالیں' آپ کے حافظے میں محفوظ ہوں گی؟

حکیم اسرار احمد: اس کی متعدد مثالیں میرے حافظے میں موجود ہیں لیکن طوالت کے

خوف سے انہیں نظر انداز کرتا ہوں اور صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔
اس سے ان کے کردار کی اس خصوصیت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا۔

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ادبی اجتماع میں بابائے اردو مرحوم نے
علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء اساتذہ اور کارفرماؤں کو اردو کے بارے میں ان کی بے حسی
اور بے تعلقی پر ہمدردانہ ملامت کی تھی۔ بابائے اردو مرحوم علی گڑھ کے نامور فرزندوں میں
تھے اور سرسید مرحوم اور ان کے رفقا نے علی گڑھ سے اردو کی ترقی اور تحفظ کا جو نعرہ بلند کیا
تھا وہ ان کے پیش نظر تھا' اسی بنا پر انہوں نے ایک مخلص بزرگ کی طرح علی گڑھ والوں
کی سرزنش کی کہ انہیں اپنا فرض پہچاننا چاہیے۔

بابائے اردو مرحوم کی اس سرزنش کو علی گڑھ کے بعض بااثر اساتذہ نے خاص
طور پر اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ان کے رفقائے کار اور جامعہ
ملیہ دہلی کے بعض با اثر لوگوں نے اتنی سی بات پر بابائے اردو مرحوم کے خلاف اچھا خاصہ
محاذ بنا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اختلاف نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ ملنا جلنا تو دور
رہا' صاحب سلامت تک بند ہو گئی۔ اگرچہ کچھ دنوں پہلے تک پروفیسر رشید احمد صدیقی
بابائے اردو مرحوم کے چند ممتاز عقیدت مندوں میں تھے۔

اسی اثناء میں لکھنو یونیورسٹی میں اردو ریڈر کی اسامی خالی ہوئی۔ درخواست
گزاروں میں لکھنو یونیورسٹی کے پروفیسر سید احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور بھی
تھے اس اسامی کے انتخاب میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ آخر لکھنو یونیورسٹی کے
ارباب حل و عقد نے بابائے اردو کو حکم مقرر کیا کہ وہ جس امیدوار کو بھی منتخب کریں گے'
یونیورسٹی اسے قبول کرے گی۔

میں ان دنوں لکھنو میں مقیم تھا اور میرے تعلقات پروفیسر سید احتشام حسین
سے مخلصانہ اور برادرانہ تھے۔ مرحوم بابائے اردو اکثر معاملات میں میری رائے کو وقعت
دیتے تھے اس لیے مجھے بجا طور پر توقع تھی کہ پروفیسر احتشام حسین کے بارے میں
بابائے اردو مرحوم میری سفارش منظور کر لیں گے۔

بابائے اردو مرحوم انتخاب کے سلسلے میں دو تین بار لکھنو تشریف لائے اور میرے پاس ہی ٹھہرے۔ میں نے بڑی صفائی سے اپنا مدعا پیش کیا۔ سب کچھ سننے کے بعد بابائے اردو مرحوم نے فرمایا کہ:

> "حکیم صاحب! آپ کے دوست پروفیسر احتشام حسین یقیناً بڑے صاحب علم اور اِس اسامی کے لیے ہر طرح موزوں ہیں لیکن اس کے لیے جو وقار متانت اور غور وفکر چاہیے' وہ پروفیسر آل احمد سرور میں نسبتاً زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک تعلیم و تدریس کے فن (اور) معیار کا تعلق ہے وہ بھی پروفیسر آل احمد سرور کے حق میں ہے۔ بے شک پروفیسر آل احمد سرور (کا تعلق) میرے مخالفوں سے ہے' لیکن علمی معاملوں میں ذاتی مخالفت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی-----"

اور پھر جیسا کہ انہوں نے کہا تھا' اپنا فیصلہ پروفیسر آل احمد سرور کے حق میں دیا۔ اگرچہ بابائے اردو مرحوم کے اس فیصلے سے ایک طرح میری سبکی ہوئی لیکن آخر میں' مَیں مطمئن ہو گیا کہ اہل علم کی شان یہی ہونی چاہیے کہ وہ قومی' علمی اور ادبی مسائل و معاملات میں ذاتیات سے بالاتر ہو کر فیصلے کیا کریں۔

○

<u>بابائے اردو:</u> "(مولانا) مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہو گا۔ ان دونوں میں عظمت وشان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے"

[چند ہم عصر: (مولانا محمد علی جوہر)' ص ۱۵۲]

<u>معین:</u> اس قول کی تائید میں کوئی سند؟ یا مثالیں؟

<u>حکیم اسرار احمد:</u> بابائے اردو کی پوری زندگی مذکورہ بالا عبارت کا مکمل مظہر تھی۔ وہ متضاد

اوصاف کا مجموعہ تھے۔ ان کے کردار کا حاصل ان کی انتہا پسندی تھی۔ ان کی تحریریں بے شک اعتدال پسندی کی آئینہ دار ہیں لیکن جہاں تک ان کے عمل کا تعلق ہے اس میں دور دور تک اس رجحان کا پتہ نہیں ملتا۔

قاضی عبدالغفار مرحوم اردو کے صاحب طرز ادیب و انشا پرداز تھے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سفارش پر مولوی صاحب نے قاضی صاحب مرحوم کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور جب قاضی صاحب مرحوم حیدر آباد پہنچ گئے تو مولوی صاحب مرحوم نے ان کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ خود بھی ایک خطیر رقم دی اور مخلص دوستوں سے بھی روپیہ اکٹھا کیا اور پھر یہ ساری رقم قاضی صاحب مرحوم کو دے دی اور اس رقم سے انہوں نے حیدر آباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ کہاں تو حیدر آباد پہنچنے کے ابتدائی دنوں میں قاضی صاحب مرحوم سے مولوی صاحب مرحوم کا یہ ہمدردانہ اور شریفانہ برتاؤ ---- اور کہاں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مولوی صاحب مرحوم ان کا نام سننے کے بھی روادار نہ ہوتے۔

اسی طرح سابق لطیفی پریس دہلی کے مالک خان صاحب عبداللطیف خاں صاحب مرحوم پر جب وہ مائلِ کرم ہوئے تو انہوں نے اورنگ آباد دکن کا انجمن کا شاندار پریس، انہیں اس شرط پر حوالے کر دیا کہ اس کی قیمت وہ آہستہ آہستہ انجمن کی کتابوں کی طباعت کی اجرت کے ذریعے قسط وار ادا کر دیں ---- لیکن جب وہ خان صاحب مرحوم سے ناراض ہوئے تو انجمن کے دفتر دریا گنج نمبر ۱ دہلی میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔

اسی طرح پٹنہ، عظیم آباد (بہار، انڈیا) کے قاضی عبدالودود سے بابائے اردو مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے لیکن ایک موقع پر جب قاضی صاحب نے بابائے اردو مرحوم کے خلاف بہار میں ایک محاذ قائم کرنے کی کوشش کی تو بابائے اردو مرحوم نے اپنے بعض عقیدت مندوں کے ذریعے خود قاضی صاحب کے شہر پٹنہ میں ان کی امیدوں کا قلعہ مسمار کر کے رکھ دیا۔

مرزا اسماعیل مرحوم سابق صدر اعظم حیدرآباد دکن نے انجمن کی سالانہ امداد اسی بہانے رکوا دی کہ بابائے اردو مرحوم نے حساب کتاب کا گوشوارہ حسب قاعدہ پیش نہ کیا تھا۔۔۔۔۔بابائے اردو مرحوم نے ان کے خلاف ایسا زبردست محاذ بنایا کہ مرزا صاحب مرحوم سارے ہندوستان میں رسوا ہو کر رہ گئے۔ انجمن کی ریاستی امداد بحال ہو گئی اور مرزا اسماعیل مرحوم حیدر آباد کی صدارت عظمیٰ کی مسند سے الگ ہو گئے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے بھی انجمن ترقی اردو ہند کی رقابت میں "آل انڈیا اردو کانگرس" کے نام سے ایک کل ہند انجمن قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ ریاست حیدر آباد کے بااثر لوگوں اور ریاست کے بڑے حاکموں نے جی کھول کر ان کی امداد کی جامعہ ملیہ دہلی کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور ان کے احباب نے بھی زور مرحوم کا ساتھ دیا لیکن بابائے اردو مرحوم نے کچھ ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ حیدر آباد میں ایک اجلاس کے بعد پھر آل انڈیا اردو کانگرس کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات سے محو ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔وہ بالکل آتش فشاں پہاڑ اور گلیشیر تھے کہ جس نے بھی ان سے ٹکرانے کی کوشش کی بکھر کر رہ گیا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

○

بابائے اردو: "وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔۔۔۔۔" [چند ہم عصر: (مولوی چراغ علی)، ص ۴۰۔۴۱]

معین: حکیم صاحب! اس ضمن میں کوئی دل چسپ یاد یا واقعہ؟

حکیم اسرار احمد: یہ بابائے اردو مرحوم کی ایسی خصوصیت ہے کہ پورے ملک میں مثل کے طور پر مشہور تھی۔ ایک بار دہلی میں پروفیسر حسن ریاض مرحوم آٹھ بجے شب کے بعد

ان سے ملنے دریا گنج نمبر ۱ میں تشریف لائے۔ وہ اس وقت مسلم لیگ کے روزنامہ ''منشور'' کے ایڈیٹر تھے اور زبان کے مسئلے میں بابائے اردو مرحوم سے کچھ وضاحتیں اور باتیں معلوم کرنے کے لیے آئے تھے لیکن بابائے اردو مرحوم نے ان سے ایسا سلوک کیا کہ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ:

''یہ شخص تو سخت کافر ہے------''

○

بابائے اردو: ''بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی------ مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوص دل سے تھی-----''

[چند ہم عصر: (پروفیسر ری ہٹ سک)' ص ۳۷۴]

معین: کن خاندانوں سے راہ و رسم تھی-----اور مراسم کی نوعیت کیا تھی؟

حکیم اسرار: بابائے اردو مرحوم کو جن دو تین، خاندانوں سے راہ و رسم تھی' ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم سابق صدر شعبہ عربی' فارسی الہ آباد یونیورسٹی اور حیدر آباد (دکن) کے نواب منظور جنگ بہادر کا گھرانہ سرفہرست ہے۔ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے بیٹوں' میاں مسلم اور مسٹر زہیر صدیقی سے بالکل اپنے بیٹوں جیسی محبت رکھتے تھے۔

نواب منظور جنگ بہادر کے خاندان سے بھی ان کی دیرینہ محبت اور مودت تھی۔ مرض الموت میں بھی وہ بار بار نواب منظور جنگ کی صاحب زادی منیر بانو کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ انہیں کئی بار جناح ہسپتال میں بلوایا اور بڑی شفقت و محبت سے بات چیت کی۔

علی شمر حاتمی اور ان کی بیوی بچوں کا بھی انہیں بڑا خیال رہتا تھا۔ علی شمر حاتمی بعض ناگزیر حالات کے ہاتھوں پاکستان چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے گئے تھے ان کی عدم موجودگی میں بابائے اردو مرحوم ان کی بیوی بچوں کی مقدور بھر خبر گیری کرتے رہتے تھے------علاج کی غرض سے مری جانے سے پہلے انہوں نے علی شمر حاتمی کی بیوی کو غالباً ڈھائی سو روپے ماہانہ کے حساب سے چھ ماہ کے لیے پیشگی چیک

کاٹ دیئے تھے یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان پیشگی چیکوں سے صرف دو ماہ فائدہ اٹھا سکیں۔

ان کے ساتھ مری جانے والوں میں صرف میں تھا۔ روانہ ہونے سے دو دن پہلے انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے کا چیک دیا کہ میں اپنی بیوی کو دے دوں------بہرحال وہ جن لوگوں سے لگاؤ رکھتے تھے' ہمیشہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ جن خاندانوں سے انہیں غیر معمولی انس تھا ان میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کا خاندان بھی تھا----بابائے اردو مرحوم نے اپنی زندگی کے چند آخری سالوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اس خاندان کی فلاح و بہبود کو اپنا اخلاقی اور انسانی (فرض) سمجھا اور بعض موقعوں پر سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی دل کھول کر مدد کی۔

○

بابائے اردو: ''یو۔پی کے مہاجروں کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے۔ کیوں کہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں''

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی)' ص ۱۰۵]

''وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُبِ جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے۔ اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں------''

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی)' ص ۱۰۲۔۱۰۳]

معین: حُبِ جاہ و مال اور روپیہ کمانے کو برا سمجھنا اور پھر ساتھ ہی تجارت کرنے کی تلقین کرنا متضاد بات تو نہیں؟

حکیم اسرار احمد: ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ وہ تجارت کرنے کو برا نہیں سمجھتے تھے' بلکہ روپیہ بٹورنے کے انہماک کو غیر مناسب خیال کرتے تھے-----وہ چاہتے

تھے کہ یو۔ پی کے مہاجر، تجارت کی طرف توجہ کریں-----اس لیے کہ آئندہ نوکریوں کے امکانات تقریباً ختم ہو جائیں گے۔ لیکن تجارت کرنے کی تلقین کے ساتھ ہی وہ مہاجروں کو متنبہ بھی کرتے جاتے ہیں کہ تجارت کا مقصد آبرو مندانہ زندگی کے وسائل تلاش کرنا ہیں، نہ کہ روپیہ بٹورنے کی ہوس میں پڑ کر اعتدال کو خیر باد کہہ دینا۔

بابائے اردو: ''شیعہ سُنّی کے جھگڑے کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے۔(وہ اکثر اپنے رفیق کار حکیم اسرار احمد کریوی سے) ایک جرمن عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں (کرائیں) لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا-----''

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی)، ص ۹۶]

معین: حکیم صاحب! اس جرمن عالم اور اس کی کتاب کا نام اگر یاد ہو تو بتایئے----- کیا یہ کتاب انجمن کے کتب خانے میں موجود/محفوظ ہے؟

حکیم اسرار احمد: بابائے اردو مرحوم نے بار بار مجھ سے اس جرمن کتاب کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی خدمت انہوں نے ایک ایسے اردوداں کے سپرد کر دی تھی جو جرمن زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے----- لیکن ان صاحب نے پھر اس کتاب کی رسید تک نہ دی----- ظاہر ہے کہ جرمن کتاب کا نام نہ مولوی صاحب مرحوم کو یاد رہا تھا، نہ میں اس سے واقف ہو سکا۔ انجمن کے کتب خانے (خاص و عام) میں بھی اس کتاب کا نام و نشان نہیں۔

○

بابائے اردو: ''مرحوم ہندوستان کے مروّجہ پردے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدّد زوجات کے حامی ہیں-----''

[چند ہم عصر: (مولوی سید علی بلگرامی)' ص ۱۰۱]

معین: اس کی کچھ توجیح / توضیح یا تفصیل؟

حکیم اسرار احمد: بابائے اردو مرحوم اعلانیہ کہا کرتے تھے کہ پردہ عورت کے پورے جسم کو ڈھکنے اور چھپانے کا نام نہیں ----- بلکہ پردے کی کچھ حدیں ہیں ----- مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ مثلاً مرد کے پردے میں جسم کے وہ اعضاء شامل ہیں' نماز میں جن کے چھپانے کا حکم ہے۔ اسی طرح عورت کے پردے کی حد بھی ہے کہ اس کی دونوں ہتھیلیاں' قدم اور چہرہ پردے کی حد سے آزاد ہیں۔

وہ تعدّد زوجات کے سخت خلاف تھے اور جب انہوں نے سنا کہ شمالی ہندوستان کے ایک بڑے عالمِ دین اور مذہبی پیشوا نے پہلی بیوی کی موجودگی میں ایک نکاح اور کر لیا تو انہیں بہت رنج ہوا ----- اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ کاش! یہ بزرگ تعدد زوجات کے سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت کو سامنے رکھتے۔

O

بابائے اردو: آخر زمانے میں ان کے بعض بے تکلف دوست انہیں "ایک شاندار انسانی کھنڈر" کہا کرتے تھے ----- "

[چند ہم عصر (سید محمود)' ص ۱۰]

معین: حکیم صاحب! یہ کون بے تکلف دوست تھے؟ کچھ نام بتایئے:

حکیم اسرار احمد: ان بے تکلف دوستوں میں سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم اور ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم قابل ذکر ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں سے بھی میں نے یہی جملہ سنا تھا' لیکن افسوس کہ ان کے نام (اب) کوشش کے باوجود یاد نہیں آ رہے۔

[تحریری سوال جواب

اکتوبر ۱۹۷۵ء]

حوالے اور حواشی :

۱۔ مشفق خواجہ صاحب کے ایک خط کے مطابق تاریخ وفات: ۲۔جنوری ۱۹۹۱ء

۲۔ بابائے اُردو کے بارے میں حکیم اسرار احمد کریوی کی بعض نگارشات کے لیے دیکھیے:

(i) بابائے اُردو طالب علموں کے لیے ایک مثالی نمونہ' نورس' عبدالحق نمبر جولائی ۱۹۶۰ء' ص ۷۹۔۸۱

(ii) بابائے اُردو کا خط بنام حکیم اسرار احمد' نورس' ایضاً ص ۱۶۶۔۱۶۷

(iii) اُردو کا معمارِ اعظم' سہ ماہی مجلس' حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۶۰ء' جنوری ۱۹۶۱ء' ص ۵۸۔۶۸

(iv) جنگ نامہ اُردو' بابائے اُردو اور اعدائے اُردو :

(ا) روزنامہ انجام' کراچی ۲۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء' ص ۱۰

(ب) ایضاً' ۴۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء' ص ۲

(ج) ایضاً' ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء' ص ۶

(د) ایضاً' ۶۔ نومبر ۱۹۶۳ء' ص ۳

(v) جنگ نامہ اُردو' قومی زبان' اگست ۱۹۶۴ء' ص ۶۱۔۷۹

۳۔ حکیم صاحب کے داماد شبیر احمد صدیقی' ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوا۔

۴۔ برادر عزیز میجر مستعین الرحمٰن موجودہ معروفیت: مدیر منتظم ہفت روزہ' ہلال' راولپنڈی

۵۔ حکیم صاحب کے شاگرد' معروف محقق اور یونیورسٹی پروفیسر افتخار احمد صدیقی (ولادت: یکم اپریل ۱۹۲۰ء وفات: ۱۷۔جون ۲۰۰۰)۔

۶۔ حکیم صاحب ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ناگپور میں استاد اور طبیب کی حیثیت سے مقیم رہے۔ دیکھیے:

مقدمہ ''انتخاب کلام سعید'' (ڈاکٹر انیس خورشید کے دادا منشی محمد سعید کاملوی کے مطبوعہ غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب) مطبوعہ الفور پبلشرز کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۲۔

۷۔ فروری ۱۹۹۷ء میں برادرم متین الرحمٰن مرتضٰی کے توسط حکیم صاحب کے صاحب زادے زہیر اکرم ندیم نے بتایا کہ حکیم صاحب ۱۹۴۸ء میں الہ آباد سے تنہا کراچی آئے ۱۹۵۰ء میں اہل خانہ بھی کراچی آ گئے۔ طیب گاؤں نوڈیرو کے قریب ہے جہاں حکیم صاحب ۱۹۵۳ء تک رہے پھر بابائے اردو کی خواہش پر وہ کراچی آ گئے اور ''انجمن'' کے پریس سے وابستہ ہوئے جو آرام باغ جامع کلاتھ مارکیٹ کے عقب میں واقع تھا۔

---❖---

ضمیمہ: حکیم اسرار احمد کریوی کے دو خط

(۱)

یاد آتا ہے کہ حکیم اسرار احمد کریوی مرحوم نے یہ خط غالبًا
اے ڈی اظہر (وفات ۲۴۔ فروری ۱۹۷۴ء) کے نام لکھ کر مرے
سپرد کیا تھا لیکن اسے پہنچانے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ بہاول
نگر کالج میں بطور لیکچرار میرا تقرر نامہ کراچی پہنچا' اس کے بعد ہی
میں نے بہاول نگر کے لیے رختِ سفر باندھا۔ [معین الرحمٰن]

نیشنل کالج' ناظم آباد (کراچی)۔ ۱۱۔ اگست ۱۹۶۴ء

مکرمی و محترمی' تسلیم

کئی بار آپ کو خط لکھنے کی کوشش کی اور ایک دو بار جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کراچی تشریف لائے ہیں' آپ سے ملنے کی کوشش بھی کی' لیکن افسوس کہ دونوں باتیں نہ ہو سکیں۔

حامل مکتوب معین الرحمٰن سلمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ آج کل یہ کراچی کے ترقی اردو بورڈ میں کام کر رہے ہیں لیکن اب کراچی کے ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر چاہتے ہیں کہ بہاول نگر میں جہاں ان کے والدین فی الحال مقیم ہیں' رہنے کی سبیل پیدا کریں۔

ان کی خوش قسمتی سے بہاول نگر کے کالج میں اردو کے ایک استاد کی جگہ کئی مہینے سے خالی ہے کیوں کہ کوئی شخص خوشی سے اس بنجر مقام پر رہنے بسنے کے لیے آمادہ نہیں لیکن یہی بہاول نگر میاں معین الرحمٰن کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے کیوں کہ اب یہ ان کا وطن ہے۔ اسی سلسلے میں یہ لاہور پہنچ رہے ہیں۔ محکمہ تعلیمات کے سیکرٹری صاحب اور ڈائریکٹر صاحب بڑی آسانی سے مشکل کشائی کر سکتے ہیں۔

معین الرحمٰن صاحب سچے طالب علم ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم (بابائے اردو مولوی عبدالحق) بھی ان کی محنت اور ذہانت کے مداح تھے اور انہوں نے مرحوم کے بارے میں بعض بڑے اچھے مضامین لکھے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ ان کے بارے میں مستقل کتاب مرتب کریں۔ ایسے صالح اور علم کے پیاسے نوجوان ان دنوں عنقا ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ ان کی ہر ممکن امداد و اعانت فرمائیں گے۔

آپ کا خادم

(حکیم) اسرار احمد کریوی

(۲)

حکیم اسرار احمد کریوی نے کراچی آ جانے کے بعد اپنے سابق وطن الہ آباد کے پہلے سفر سے متعلق اس نجی خط میں بابائے اردو سے متعلق میری ایک کتاب کی فرمائش کی ہے جسے وہ اپنے ساتھ بھارت لے جانا چاہتے تھے۔ [معین الرحمٰن]

مکان نمبر ۱۰۸۲

پیر کالونی، کراچی۔۵

۱۷۔ مئی ۱۹۷۷ء

عزیز محترم معین اور مبین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ان چند سطروں کی شانِ نزول یہ ہے کہ میں یعنی ''حکیم اسرار احمد کریوی''

یہاں (کراچی) سے ۲۳۔ مئی ۱۹۷۷ء بروز پیر عوامی ایکسپریس سے پونے دس بجے صبح ساڑھے تین ساتھیوں کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ گاڑی دوسرے دن ۲۴۔ مئی ۱۹۷۷ء منگل کی صبح سات آٹھ بجے لاہور پہنچتی ہے۔ فی الحال لاہور ٹھہرنا نہیں' بلکہ اسی روز ڈیڑھ بجے دوپہر کو ان شاء اللہ امرت سر کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور پھر اسی دن شام کو چھ بجے ایک گاڑی سے جس کا نام نانا ایکسپریس ہے' الہ آباد سوار ہو جائیں گے۔

میرے ساتھ میری بیوی زہیر۲ کی بیوی اس کا ایک چھوٹا بچہ۳ ایک بوڑھی خاتون جن کے خاوند کا یہاں دو تین سال قبل انتقال ہوگیا تھا اور اب وہ میرے داماد انیس میاں۴ کے ساتھ رہتی ہیں' اور اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے کے لیے الہ آباد جا رہی ہیں ------ ہم لوگ پہلے پہل سابق وطن کا رخ کر رہے ہیں۔ یہاں کے بہت سے اعزا واقربا نے اپنے وہاں کے عزیزوں کے لیے مختلف ساز و سامان سے ہمیں لاد دیا ہے' انکار کی گنجائش نہ تھی۔ یوں تو ہمارا اپنا ہی سامان کم نہ تھا دوسرے عزیزوں کے تفویض کردہ سامان سے سونے پر سہاگے کی مثل صادق آ گئی!

تم لوگ بہت دن سے لاہور میں رہتے ہو پھر ماشاء اللہ معین میاں شعبۂ تعلیم سے متعلق ہیں' یقیناً ان کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کا حلقہ وسیع ہو گا۔ بہرحال اسٹیشن پر تم دونوں بھائیوں کا پہنچنا لازمی ہے اور اس اعتبار و یقین کے ساتھ کہ کسٹم والوں کے ہاتھوں ہمیں خواہ مخواہ کی پریشانیاں نہ اٹھانی پڑیں۔

میں یہ خط پوسٹ بکس کی معرفت بھیج رہا ہوں۔ اللہ کرے تمہیں مل جائے اور یہ بھی دعا ہے کہ مقررہ تاریخ کو وہاں کرفیو وغیرہ کا جھنجھٹ نہ رہے ------ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ مجھے معین میاں سلمہ کے اس مجموعے کی خاص طور پر ضرورت ہے جس میں ان کا وہ مضمون شائع ہوا ہے جو خود بابائے اردو مرحوم کے جملوں سے مرتب کیا گیا ہے ۵۔ میرے پاس یہ کتاب تھی لیکن جلدی میں تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ اللہ کرے تمہیں یہ خط وقت پر مل جائے۔ واپسی میں انشاء اللہ میں تمہارے پاس دو تین روز

ضرور ٹھہروں گا ـــــ معین میاں کی بیوی اور بچے کو بہت بہت دعائیں اور بے شمار پیار۔
دعا گو

اسرار احمد

حوالے اور حواشی :

۱۔ برادر عزیز: سید مبین الرحمٰن، حال مقیم اسلام آباد۔

۲۔ حکیم صاحب کے نامور صاحب زادے زہیر اکرم ندیم، کراچی سے صوبائی اسمبلی کے ممبر رہے۔ باون برس کی عمر میں ۴۔ جون ۱۹۹۸ء کو کراچی میں دہشت گردوں کی گولی کا نشانہ بنے اور شہادت پائی۔

۳۔ "چھوٹا بچہ" سے مراد، حکیم صاحب کے پوتے، یعنی زہیر اکرم ندیم کے بیٹے عمیر اکرم، جو فروری ۱۹۹۷ء میں بحریہ کالج، کراچی سے ایم بی۔اے کر رہے تھے۔

۴۔ انیس احمد صاحب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ فروری ۱۹۹۷ء میں وہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے صاحبزادے، ڈاکٹر سلیم اعظم کے قائم کردہ، اعظم میموریل ہسپتال، کراچی سے منسلک تھے۔

۵۔ "ذکر عبدالحق" طبع اول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء

عزیز معین میاں، دُعائیں

آج مختصر خط ملا۔ ماموں سے معلوم ہُوا تھا کہ گاڑی میں رش بہت زیادہ تھا۔ تم نے نہیں لکھا کہ بہاول نگر پہنچنے تک کیا حال رہا؟

.... بابا کے پاس صبح سات بجے سے ایک ڈیڑھ بجے کے درمیان رہتا ہوں۔ اُن کی صحت تدریجاً بحال ہو رہی ہے۔ میری خدمات میں اخبارات، رسائل اور اُن کی نجی ڈاک پڑھ کر سُنانا اور خطوط املا کرانا بطور خاص شامل ہیں۔ پچھلے دنوں اُنہوں نے ایک خط فیلڈ مارشل (محمد ایوب خاں) صاحب کو بھی تحریر کرایا تھا۔

.... اور کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ یہ خط مئی میں تحریر کیا تھا لیکن پوسٹ کرنے کی نوبت جون (۱۹۶۱ء) میں آ رہی ہے۔ ان چند دنوں میں کوئی خاص بات مزید قابلِ ذکر نہیں............

فقط، دُعا گو

متین الرحمٰن مُرتضٰی

موصولہ بہاول نگر:

۸۔ جون، ۱۹۶۱ء

تبرکاتِ حق (بابائے اُردو کی نادر تحریریں):

۱۲۔ قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین، ۱۸۹۶ء	۲۳۵
۱۳۔ غلامی، ۱۸۹۶ء	۲۳۹
۱۴۔ سرسیّد احمد خاں کی والدہ، ۱۹۱۲ء	۲۴۷
۱۵۔ گشتی کتب خانہ، مارچ ۱۹۴۵ء	۲۶۳
۱۶۔ میرا کتب خانہ، جون ۱۹۴۶ء	۲۷۳
۱۷۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' ــــ بابائے اُردو کی قلمی تحریر	۲۸۳
۱۸۔ اُردو زبان و ادب کے سات سو سال	۳۰۱۔۳۵۶

...... کتاب میں شامل بابائے اُردو کی بعض غیر مُرتب نگارشات کی بازیافت میرے لئے سرمایۂ فخر ہے۔ مولوی عبدالحق کے آثار کی جمع آوری کی یہ کوشش اور کاوش یقین ہے کہ پسندیدہ ٹھہرے گی۔

—— ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین

از:
مولوی عبدالحق

تحریر: ۱۸۹۶ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) کی زیرِ نظر تحریر ان کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ ''قسطنطنیہ میں عورتوں کا ایک میگزین'' کے عنوان سے یہ رسالہ ''معلم نسواں'' جلد ۱۰ نمبر ۳ (سال ۱۸۹۶ء) میں پہلی بار چھپی۔ جب سر سید احمد خاں زندہ تھے اور مولوی عبدالحق ان کے مدرسہ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ رسالہ ''معلم نسواں'' کے قدیم و ناپید شمارے سے مولوی عبدالحق کی قیمتی تحریر کا عکس، مجھے جناب عبدالصمد خاں (اردو۔ ریسرچ، سینٹر، حیدر آباد دکن) نے فراہم کیا۔ ان کے دلی شکر یے کے ساتھ یہ نایاب قدیم تحریر ذیل میں محفوظ کی جا رہی ہے۔ اس مختصر مگر نادر تحریر سے مولوی عبدالحق کی روشن خیالی اور روشن ضمیری اور طبقہ نسواں کے بارے میں ان کی فکر مندی پر روشنی پڑتی ہے۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

''ہم نہایت خوشی کے ساتھ اس خبر کو درج کرتے ہیں کہ قسطنطنیہ میں ایک رسالہ صرف عورتوں کے لیے جاری ہوا ہے اس کا ایڈیٹر ایک ایسا شخص ہے جسے لڑکپن سے عورتوں کی حالت سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس بات کا عزم بالجزم کر لیا تھا کہ جو کچھ ہو میں عورتوں کی بہبودی اور فلاح اور ان کی موجودہ حالت کی ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کروں گا۔

اس باہمت شخص کا نام عبدالغنی حمید بے ہے۔ پہلے طرابلس میں ایک طالب علم

تھا۔ اس کے ہاں مضمون نگار عورتوں کا ایک اسٹاف ہے جس میں سے ایک عورت نے نظم میں ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جس سے اس کے خیالات کی متانت اور خوبی معلوم ہوتی ہے۔ اس رسالے کی اشاعت قریب ساڑھے تین ہزار کے ہے اور ہفتے میں دو بار نکلتا ہے۔ قسطنطنیہ اور سمرنا میں کم از کم پندرہ ایسی عورتیں ہیں جو اس میں لکھتی ہیں۔ یہ میگزین ترکی زبان میں لکھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کے ایسے بھاگ کہاں تھے کہ یہاں کی عورتیں اپنی بہنوں کی اصلاح کے لیے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھیں بلکہ اگر کوئی شخص صرف بہ تقاضائے انسانی ہمدردی، اس قسم کی کوشش کرتا ہے۔ تو اسے انگشت نما کرتے ہیں اور خبطی اور مجنوں بتاتے ہیں ۔ وہ لوگ جو انسانی ہمدردی اور قومی اصلاح کا دعویٰ کرتے ہیں انھیں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ عورتیں بھی ہماری طرح انسان ہیں اور وہ بھی مردوں کی طرح اصلاح کی محتاج ہیں ۔

جس طرح جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت اچھی بھلی ہے۔ ان میں بڑے بڑے رئیس اور امیر، بڑے بڑے عالم فاضل، فقیہہ محدث موجود ہیں اور عموماً لوگ کھاتے پیتے اور خوش حال نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بے ہودہ اور بے معنی واویلا کیسی ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب اور وہ روز بہ روز پستی اور جہالت کی طرف بڑھتے جاتے ہیں لیکن قوم (کے) ہمدرد اور ریفارمر ان کی جہالت پر ہنستے ہیں اور ان کا ہنسنا بجا ہے لیکن ہم ان عقل مندوں کی عقل مندی پر ہنستے ہیں جو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے ہاں کی عورتیں نہایت قابل، باعصمت اور امور خانہ داری میں بہت ہوشیار ہیں اور اس لیے اصلاح کی محتاج نہیں۔ جہاں یہ حالت ہے وہاں جو کچھ نہ ہو سو کم ہے۔ اگر چندے بھی غفلت رہی تو ایک روز آنے والا ہے جب سر پر ہاتھ دھر کے روئیں گے اور پھر کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی، فقط راقم۔ عبدالحق۔

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

مورخہ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۴۳ء

مکرم بندہ جناب :-

انجمن اشاعتِ اُردو ناگپور کی دعوت پر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کی تیسری آل انڈیا اُردو کانفرنس کا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو ناگپور میں منعقد ہوگا۔ اس کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ خاص انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر ایسا بڑا اجتماع ہوگا کہ اس سے قبل کسی کانفرنس میں نہیں ہوا۔ مختلف علاقوں کے نمایندوں، متعدد یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور ملک کے نامور اہلِ علم اور ادیبوں کی شرکت کی توقع ہے :

اِس اجلاس میں اُردو زبان و ادب کی اشاعت و ترقی کے متعلق بہت اہم تجاویز پیش ہونے والی ہیں۔ آپ جیسے پختہ خیال اور تجربے کار حامیانِ اُردو کے مشورے ان معاملات میں نہایت کارآمد اور کانفرنس کی کامیابی کا موجب ہوں گے۔ اِس لیے میری درخواست ہے کہ آپ اس کانفرنس میں شرکت فرما کر ہمیں اپنے مشورے اور تجربے سے مستفید فرمائیں :

عبدالحق

سکریٹری انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند)، دہلی

مولانا علم الدین سالک کے نام بابائے اردو کا ایک مراسلہ

بشکریہ ڈاکٹر سید معراج نیر

غُلامی

از:

مولوی عبدالحق

تحریر: ۱۸۹۶ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق، اپنی نہاد، اپنی افتاد اور اپنی
تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اپنے زمانے سے کہیں زیادہ روشن
خیال، تجدد پسند، آزادی کے دلدادہ اور ترقیِ نسواں اور حقوقِ نسواں
کے ایک بڑے علمبردار اور مبلغ تھے۔

۱۸۹۶ء کے ماہنامہ رسالہ ''معلم نسواں'' (مدیر محب
حسین) حیدر آباد دکن (جلد۱۰، نمبر۲، صفحہ ۳۱۔۳۶) میں ''غلامی''
کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا زیرِ نظر پرتاثیر مضمون ''نادرات''
میں سے ہے۔

یہ مضمون مولوی عبدالحق نے پچیس چھبیس برس کی عمر میں
لکھا ـــــ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی
تازگی اور دردمندی اپنی جگہ قائم اور سلامت ہے۔ مجھے مولوی
عبدالحق کی روشن ضمیری کی یہ قیمتی یادگار، حیدر آباد دکن کے اپنے
کرم فرما عبدالصمد خاں (حیدر آباد دکن) کے بے مثال ذخیرۂ کتب
و رسائل ''اردو ریسرچ سینٹر'' سے میسر آئی جس کے لیے میں ان کا
بہ دل ممنون ہوں۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

''ـــــ ایک زمانہ تھا جب کہ غلامی کا عام رواج تھا۔ یعنی انسان انسان کی
جان و مال کا ایسا ہی مالک تھا جیسے اور بے جان چیزوں کا ـــ بلکہ اسے اپنے مکان کی

آرائش یا دوسری ضرورت کی معمولی چیزیں زیادہ عزیز ہوتی تھیں بہ نسبت انسانوں کے' جو اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کی صورت پر بنائے گئے ہیں۔ غلاموں کی تجارت نہایت سود مند اور بہت بڑی تجارت سمجھی جاتی تھی۔

بعض یورپین قومیں جو اس قسم کی تجارت کرتی تھیں نہایت بے رحمی کے ساتھ انہیں پکڑ پکڑ کر لے جاتی تھیں ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی تھی اور جب نکل کر بھاگتے تو پکڑے جاتے تھے۔ جہازوں میں وہ اس طرح بھر بھر کر لے جاتے تھے جیسے کوئی لکڑی کے لٹھوں یا سوداگری کی اور چیزوں کو بھرتا ہے۔ جہاز میں لادنے کی کیفیت سنیے کہ پہلے تو ایک بیضوی دائرہ کی شکل میں سب کو ڈالتے چلے جاتے تھے اور جو جگہ بیچ میں یا کونوں میں رہ جاتی تھی جس میں نہ تو وہ پوری طرح بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں تو جس ہیئت سے وہ جگہ پر کی جاتی تھی' حقیقت میں اس سے عجب بے رحمی معلوم ہوتی تھی۔

کوئی آدھا بیٹھا آدھا لیٹا ہے۔ کوئی لیٹا ہے مگر ٹانگیں شکم میں ہیں ایک اونکڑو بیٹھا ہے تو دن رات اسی حالت میں ہے۔ دوسرا ہے کہ اس کی مشکیں باندھ کر ایک ذرا سی جگہ میں ٹھونس دیا ہے۔ غرض جہاز میں ذرا سی جگہ بھی خالی ہوتی تھی تو وہ بے رحم لوگ موڑ توڑ کر کسی نہ کسی غلام کو ضرور ڈال دیتے تھے گویا وہ بے جان چیزیں ہیں جو تکلیف یا درد کو محسوس ہی نہیں کر سکتیں اور اس پر طرّہ یہ کہ جب رستے میں معلوم ہوا کہ جہاز خاص مقدار وزن سے زیادہ بھاری ہو گیا ہے تو وہ جہاز میں سے غلاموں کو اٹھا اٹھا دریا میں پھینک دیتے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں سودا بن گیا' غلاموں کو فروخت کر دیا۔ لیکن یہ خریدار کی مرضی پر تھا کہ وہ جون سے غلام کو چاہے خریدے اور یہ اکثر واقع ہوتا تھا کہ ایک نے ماں اور دوسرے نے بچہ خرید لیا۔ بچہ ہے کہ الگ بلک رہا ہے اور ماں جدا زار و قطار رو رہی ہے اور پھر ان سے محنت اس قدر سخت لی جاتی تھی کہ الاماں! اگر ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کی جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

صبح سے شام اور شام سے صبح تک کوئی ایسا وقت نہ تھا کہ ان سے سخت سے سخت محنت اور مشقت نہ لی جاتی ہو اور جب ذرا بھی کام ان کی مرضی کے خلاف ہوا یا

یوں ہی جب جی چاہا بلا وجہ مارے کوڑوں کے کھال اڑا دیتے تھے اور اگر چاہتے تو جان سے مار ڈالتے۔ کیوں کہ غلام کے مار ڈالنے کا اختیار ان کے آقا کو حاصل تھا۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جنہوں نے اس بے انتہا ظلم و ستم کی بنیاد اکھاڑی اور آفرین اور صد آفرین ہے ان کی ہمتوں پر کہ انہوں نے اس کی مخالفت میں جان توڑ توڑ کر کوشش کی اور دنیا کے دامن پر سے اس بدنما داغ کو مٹا دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی دنیا سے بالکل اُٹھ گئی ہے؟ اور خصوصاً ہمارے ملک سے جو ایک ایسی قوم کی زیر حکومت ہے جو غلامی کی سخت دشمن ہے اور جس نے نہایت جواں مردی کے ساتھ اس کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کی؟ اگر ہم میں ذرا بھی انصاف باقی ہے تو ہم اس کے جواب میں ''نہیں'' کہنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس قدر غلطی پر ہیں۔ بے شک ہمیں وہ غلامی نظر نہیں آئے گی جو قانون کے احاطے میں آ سکتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ خوف ناک اس سے زیادہ مضر اور تباہ کرنے والی غلامی ہم میں اس وقت موجود ہے۔ ہم نہ کہیں لیکن ایک دنیا کہہ رہی ہے اور جنہیں خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ صاف دیکھ رہے ہیں اور یہ نہ صرف ہمارے آس پاس اور ہمارے گھروں میں ہے بلکہ ہمارے دلوں' ہمارے خود شوق اور ہماری نیتوں تک میں سرائت کر گئی ہے۔ اس کا بیج اس سرزمین میں بویا گیا ہے جہاں قانون کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کے فرمانروا رسم و رواج ہیں اور ہم ان کے غلام بلکہ پجاری ہیں۔

منجملہ ان رسوم کے جو ہمارے ہاں رائج ہیں اور جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں' سب سے زیادہ مکروہ و مضر وہ رسمیں ہیں جو بنی نوع انسان کے دوسرے جز یعنی نسواں کے متعلق ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان تمام بے ہودہ رسموں کا نچوڑ ان قابل رحم عورتوں پر آ پڑتا ہے۔ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کی زندگی اس بری حالت میں گزرتی ہے کہ گویا وہ انسان نہیں' اگرچہ انسانوں کے گھر میں پیدا کی گئی ہیں۔ اول تو لڑکی کا پیدا ہی ہونا والدین کو شاق گزرتا ہے اور گو لوگوں کے کہنے سننے اور ادھر ادھر کی باتوں

سے وہ اپنے دل کو نہ سمجھا لیں' لیکن سچ یہ ہے کہ ان کو ان کے عزیز و اقارب اور دوستوں کو ہرگز وہ خوشی نہیں ہوتی جو لڑکے کے پیدا ہونے سے ہوتی ہے۔ پھر چار طرف سے مبارک باد اور خوشی کے نعرے بلند ہوتے ہیں' شادیانے بجتے ہیں' جلسے ہوتے' ہیں ناچ و رنگ ہوتا ہے ضیافتیں ہوتی ہیں غرض یہ کہ ایک عجب شان و شوکت اور مسرت کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے پیدا ہوتے ہی سب کے دل پژمردہ ہو جاتے ہیں۔

اس شوق میں کہ کسی طرح لڑکا پیدا ہو قسم قسم کے ٹونے اور تعویذ گنڈے کئے جاتے ہیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی ہیں' منتیں منگوائی جاتی ہیں اور کوسوں کا سفر کر کے فقیروں کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض اوقات اس بے ہودہ خواہش میں ایسے خوفناک واقعات پیش آتے ہیں کہ جس سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں یا ہمیشہ کے لئے ننگ و ناموس پر دھبا آ جاتا ہے۔ جس خاندان میں صرف لڑکیاں ہوں اور لڑکا نہ ہو وہاں وہ اور بھی ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ گویا یہ ان بے چاریوں کا قصور ہے کہ اب تک لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ لڑکے کی پرورش اور تربیت جس نازو نعم اور محبت اور دردسری سے کی جاتی ہے' لڑکی کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بڑا ہوا تو اس کی تعلیم کے انتظام کئے جاتے ہیں۔ استاد نوکر رکھے جاتے ہیں یا مدرسہ میں بھیجا جاتا ہے غرض جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔ گویا علم مردوں ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس لئے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور اگر کسی نے کچھ خیال بھی کیا تو نہایت لا ابالی کے ساتھ اور دو ایک اردو کی کتابیں پڑھا دیں اور یہ ان کی تعلیم کی معراج ہے۔ ذرا بڑی ہوئیں اور انہوں نے گھروں میں بند کرنا شروع کیا اور پھر اس قید خانے سے عمر بھر ان کا چھٹکارا نہیں ہو سکتا جب تک کہ قیدِ ہستی سے نہ چھوٹ جائیں۔

جب سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ شادی کے متعلق تمام رسوم اور تدابیر والدین کرتے ہیں بے چاری لڑکیوں سے پوچھتے تک نہیں' انہیں خبر تک نہیں کرتے گویا ان کی شادی نہیں بلکہ کسی اور کی ہے۔ والدین کی جہاں مرضی ہوئی شادی کر دی اور بے چاری لڑکی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔

لڑکا تو پھر بھی کچھ کہہ سکتا ہے مگر لڑکی زبان سے حرف تک نہیں نکال سکتی۔ کیونکہ یہ خلافِ شرافت ہے۔ اس وحشیانہ رسم سے سوسائٹی پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے اور اکثر میاں بیوی کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ کیا یہ غلامی نہیں ہے؟ عمر بھر ایک تنگ چار دیواری کے اندر مقید علوم و فنون سے بے بہرہ' دنیا کے حالات اور قدرت کے عجائبات سے نا آشنا بری رسوم کی پابند------زندگی ہے ہمارے ہاں کسی نسواں کی جو جانوروں اور حیوانوں کی زندگی سے بھی بدتر ہے اور پھر اس پر دعویٰ ہے' تہذیب اور شرافت کا۔ اگر وہ لوگ جنہیں ہم غیر مہذب' وحشی اور جنگلی کہتے ہیں' ہماری یہ حالت دیکھیں تو ہم پر ضرور ہنسیں اور طعن کریں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ایک حد تک سچ بھی ہے۔

جب ان لوگوں نے جو بنی نوعِ آدم کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں غلامی کو دنیا سے مٹا دینے کا بیڑا اٹھایا تو پہلے پہل ان کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مخالف' وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں غلاموں کی تجارت یا ان کے محنت و مشقت سے فائدہ عظیم ہوتا تھا۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ ان سے بھی بڑھ کر مخالف وہ تھے' جو دین کے پیشوا یعنی پادری کہلاتے ہیں۔ وہ انجیل اور توریت لے لے کر اٹھے اور جا بجا وعظ کی کہ غلامی انجیل کے عین مطابق ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ دراصل کلامِ الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں اور در پردہ مذہبِ مقدس کی جڑ کھوکھلی کرنا چاہتے ہیں۔

انسان کی خواہشات اور جذبات جو پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ جو افعال' ان سے پہلے صادر ہوتے تھے' وہی اب بھی ہوتے ہیں' اور جہاں کہیں وہی حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ہمارے حرکات اور ہمارے افعال وہی روش اختیار کرتے ہیں جو ہم دوسرے مقامات اور دوسری زبانوں میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اگر ہم یہ باتیں اپنے ملک میں ہوتی دیکھیں تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا جو روش اس زمانے میں حامیانِ غلامی اور پادریوں نے اختیار کی تھی آج وہی رنگ ہم اپنی سوسائٹی کا دیکھتے ہیں۔

ان کے سامنے جب کوئی مفید اصلاح پیش کی گئی تو انہوں نے ہمیشہ شور و غل

مچایا اور مذہب کی آڑ میں حملے کئے۔ جس میں عوام الناس' سب ان کے حامی اور طرف دار ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کی بات ہے کہ جب انگریزی تعلیم کے لئے مسلمانوں سے کہا گیا تو سب نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوائے مخالفت کی کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ قرآن و حدیث سے استدلال کیا اور ثابت کر دیا کہ انگریزی پڑھنا خلافِ شریعت اور کفر ہے۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہی بزرگ جو انگریزی کے سخت مخالف تھے اور اس کا پڑھنا کفر سمجھتے تھے' آج ان ہی کی اولاد ہے کہ انگریزی تعلیم پا رہی ہے اور کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ پوچھنا تو در کنار کسی کو خیال تک بھی نہیں آتا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ شروع شروع میں جہالت اور نفسانیت کا طوفان زور شور سے بلند ہوتا ہے اور تاریکی سی پھیل جاتی ہے اور تھوڑے عرصے تک کچھ سجھائی نہیں دیتا لیکن رفتہ رفتہ وہ طوفان کم ہونا شروع ہوتا ہے' مطلع صاف ہو جاتا ہے اور پھر خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ اصلیت اور حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح آج کل جو ترقی و اصلاحِ نسواں کا مسئلہ درپیش ہے' تو اس کے ہر چہار طرف سے بڑے زوروں کے ساتھ مخالفت ہو رہی ہے اور قرآن و احادیث اٹھا اٹھا کر بڑے زور سے ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ خلاف احکامِ الٰہی و شریعتِ نبوی ہے اور علاوہ اس کے ناقصِ عزت و حرمت و شرافت ہے۔

وہ طوفان جس کا ابھی میں نے ذکر کیا بلند ہو رہا ہے اور ابھی اور ہو گا۔ لیکن جب یہ طوفان تھم جائے گا تو زمانہ جھوٹ اور سچ کا خود بخود فیصلہ کر دے گا لیکن اتنا ہم ضرور کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب مسیحی نہیں جس نے جہاں غلامی کی اجازت دی ہے وہاں عورتوں کو بھی ذلیل حالت میں رکھا ہے لیکن اسلام نے جیسے دنیا میں غلامی کے کم کرنے کی تعلیم دی ہے' عورتوں کے حقوق اور آزادی کی بھی ویسی ہی حمایت کی ہے۔ اس لئے ان کی مخالفت بجا تھی مگر ہماری مخالفت بالکل بے جا ہے۔ اگر مسلمانوں میں عزت اور حمیّت باقی ہے تو وہ خدا کے لئے اپنے برے کردار اور بے ہودہ رسوم سے اپنے پاک مذہب کا نام بدنام نہ کریں------"

(عبدالحق)

---❖---

سر سید احمد خاں کی والدہ

نایاب تحریر: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

سر سیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے، اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد (۱۷۴۷ء-۱۸۲۸ء) کی مختصر سوانح "سیرۃ فریدیہ" میں بتایا ہے کہ خواجہ فرید الدین احمد کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بطریقِ تجارت دلّی میں آئے تھے۔ اخیر کو انہوں نے دلّی ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا۔

خواجہ فرید الدین احمد خاں کو بادشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے عہد میں عہدۂ وزارت اور نواب دبیر الدولہ امین الملک خان بہادر مصلح جنگ کا خطاب ملا — اُن کی نمایاں سماجی حیثیت اور خطۂ کشمیر سے تعلق اور نسبت کی بناء پر کشمیریات کے ممتاز عالم محمد الدین فوق (ولادت ۱۸۷۷ء، وفات ۱۹۴۵ء)، ایڈیٹر "کشمیر میگزین"، لاہور نے "حالاتِ نواب دبیر الدولہ" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔

۵۴ صفحات پر مشتمل محمد الدین فوق کی مختصر کتاب "حالاتِ نواب دبیر الدولہ" جنوری ۱۹۱۲ء مطابق محرم الحرام ۱۳۳۰ ہجری میں ہندوستان اسٹیم پریس، لاہور سے شائع ہوئی — اس کتاب کے آخر میں "عزیز النساء بیگم" کے زیرِ عنوان (ص ۴۳ تا ۵۳)، سر سیّد احمد خاں کی والدہ محترمہ کے افکار اور احوال کو بھی جزوِ کتاب بنایا گیا ہے۔ یہ حصۂ کتاب بوجوہ ایک اہمیتِ خاص کا حامل ہے۔

سر سیّد کی تربیت میں اُن کی والدہ محترمہ کا بے حد دخل اور اثر رہا — سر سیّد کی عمر چالیس برس کی تھی جب نومبر ۱۸۵۷ء میں اُن کی والدہ کا انتقال ہوا — انتقال کے چالیس برس بعد، خود کوئی اَسّی برس کی عمر کو پہنچ کر بھی وہ والدہ کے اثر اور سحر سے نکلے نہیں تھے۔ ۶ر فروری ۱۸۹۷ء کے اپنے ایک خط بنام نیاز محمد خاں میں وہ لکھتے ہیں:

"میری دانست میں...... والدہ صاحبہ کا حق جمع اُمور پر مقدم ہے۔ ان کا

اتباع اور اطاعت لازم ہے۔ ان کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا چاہیے۔ یہ بات تمام اخلاقوں اور عبادتوں اور کانشنس کے جذبوں سے افضل ہے —"

(مکتوباتِ سر سید، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۴۵۵)

عزت اور اثر کے اس حوالے سے، سر سیّد کی والدہ کے حالات اور اُن کی تعلیمات کا تذکرہ بہت اہم ہے — یہ ذکرِ عزیز، اس لیے اور بھی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے کہ فوق کی متذکرہ کتاب کے آخر میں شامل سر سیّد کی والدہ کے حالات، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) کو سر سیّد کی محبت اور قربت حاصل رہی۔ اُن کی والدہ کے بارے میں بابائے اُردو کی یہ نایاب نگارش اُن کی نوجوانی کی یادگار ہے اور ان کے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں۔ امید ہے کہ سر سیّد احمد خاں کی صد سالہ برسی کے موقع پر بابائے اردو کی اس نادر تحریر کو جو جائے خود پون صدی سے زیادہ قدیم ہے، قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

حالات نواب دبیر الدولہ

بسم

عزیز النسا بیگم

بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار اُستادوں سے بہتر ہے (سید)

سر سید احمد خان بہادر کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمانوں میں اعلےٰ تعلیم کی اشاعت کیجائے لیکن اس کے علاوہ اُن میں دو تین اور باتیں نہایت ممتاز طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اُنکے پولیٹکل خیالات اس بارہ میں اُنکی بڑی کوشش یہ تھی۔ کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو ایک قسم کی منافرت پیدا ہو گئی تھی اُسے مٹایا جائے اور ان میں عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ دوسرے انگریزی سلطنت کی

خیر خواہی اور وفاداری۔ اور اس حکومت کی خوبیاں لوگوں کے دلوں پر نقش کی جائیں۔ دوسری ممتاز بات جو ان میں پائی جاتی تھی۔ اور جسکی وجہ سے تمام ملک میں ایک تھلکہ مچ گیا۔ اور لوگوں نے بڑے زور شور سے مخالفت کی وہ ان کے مذہبی خیالات تھے۔ اگرچہ ان خیالات کے کیسے ہی مخالف کیوں نہ ہوں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ملک پر ان کا بہت کچھ اثر پڑا اور ہیبت اسلام اور توہمات باطلہ جھوٹی یا سچی قصے کہانیوں میں لوگ فرق کرنے لگے۔ عام طور پر تحقیق کا خیال پیدا ہو گیا۔ تیسری بات جو فی الحقیقت نہایت قابل تعریف و تحسین ہے وہ ان کے پاکیزہ اخلاق ہیں۔ میں یہاں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ ان تینوں باتوں میں اپنی ماں کے سچے شاگرد تھے۔ اور اس بارہ میں ان کی زندگی پر زیادہ وہ بلکہ بالکل ان کی والدہ کا اثر پڑا تھا[۲]

۱۸۸۲ء میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے ایک ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ سر سید احمد خاں بہادر اور سید محمود بھی اس کے ممبر تھے۔ سید احمد خاں سے جب تعلیم نسواں کی نسبت سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے اپنے شہادت میں یہ بھی بیان فرمایا۔ کہ "خود میں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے پائی۔ اور نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیئے جواب تک بعینہ مجھے یاد ہیں"[۳]

عزیز النساء بیگم (والدہ سید احمد خاں) خواجہ فریدالدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں[۴]۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن نہایت اعلیٰ منتظم۔ ذہین۔ رحمدل۔ با اخلاق اور قدرتی طور پر نہایت عالی دماغ واقع ہوئی تھیں۔ جن کی قابلیت اور خوبی کا اثر نہ صرف سر سید احمد خاں بہادر پر بلکہ قریب قریب تمام خاندان پر پڑا۔ سر سید احمد خاں اپنی ابتدائی تعلیم کا جو انہوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ اس طرح ذکر کرتے ہیں۔ میں نے خود گلستان

کے سبق ان سے پڑھے ہیں - اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق انکو سنائے ہیں۔ جن کو خوب یاد رہتے - کہ جب میں انکو سبق سُناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھکر دیکھتا تو وہ سُوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں - اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہونگی مگر اُن سُوت کی لڑیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی ؎۵

ایک دفعہ کا ذکر ہے - کہ ایسے شخص نے سر سید احمد خاں بہادر سے بدی کی - جس سے انہوں نے کبھی بہت بڑا سلوک کیا تھا - اتفاق سے وہ تمام ثبوت جس سے اُسکو پوری سزا عدالت سے ملسکتی تھی - اُن کے ہاتھ آ گئے - اور سر سید انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے - اُن کی والدہ نے جب یہ سُنا تو کہا اگر تم اسکو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں - اور اگر تمکو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے - کہ اُس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک اعمال کی سزا دینے والا ہے چھوڑ کر دنیا کے ضعیف اور ناتواں حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو - سر سید کہتے ہیں کہ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اُس وقت سے میرے دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا - اگرچہ اُس شخص نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کیوں نہ کی ہو - بلکہ میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی میرا اُس سے بدلہ لے ؎۶

سر سید نے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے - وہ یہ ہے - کہ جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی - میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پُرانا تھا - کسی بات پر تھپڑ مارا - جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی - اور تھوڑی دیر بعد میں گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اسکو گھر سے نکال دو - جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے - یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا - چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا - اُسی وقت ایک دوسری ماما

میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا نکلی - اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لیگئی - میری خالہ نے کہا کہ دیکھو تمہاری والدہ تم سے کسقدر ناراض ہیں - اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھیگا اس سے بھی خفا ہونگی - مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں - اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھے چھپا دیا - تین دن تک میں اس کوٹھے میں چھپا رہا - میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں سے کہتی تھیں کہ "دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں" تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں - انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کردونگی - وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا - میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے - جب تقصیر معاف ہوئی جس ماں کی یہ تعلیم ہو اس کا بچہ کیسا کچھ با اخلاق نہ ہوگا -

۵

سرسید اپنے ایک دوست سے ہمیشہ ملنے جایا کرتے تھے - لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے - اور انہوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا - مگر سرسید بدستور ملتے رہے - لیکن ایک مدت بعد انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا - جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے سبب دریافت کیا - سرسید صاحب نے جو بات تھی کہدی تب انہوں نے کہا "کہ نہایت افسوس ہے - کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو - جب دوستی ہے - تو اسے پورا کرنا چاہیے - یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوستی کا برابر برتاؤ کرنا اسکا فرض ہے - تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے کیوں ذمہ دار ہوتے ہو - تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے - اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں -

وہ غریب اور مسکین عورتوں کی ہمیشہ خبرگیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ ان ہی کے رہنے سہنے اور علاج کے لئے وقف کر رکھا تھا - ان میں سے ایک غریب لاوارث بڑھیا زمین تھی - جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی - اتفاق سے وہ

اور زمین ایک ہی زمانہ میں بیمار ہوگئیں۔ جو دوا حکیم اُن کے لئے تجویز کرتا تھا۔ وہی دوا زمین کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہوگئی اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون تجویز کی جو سید صاحب تیار کرا کر لائے۔ چونکہ انہیں یقین تھا کہ زمین کو یہ قیمتی معجون کوئی تیار کر کے نہیں دیگا۔ وہ خفیہ خفیہ زمین کو کھاتی رہیں۔ اور خود چکھی تک نہیں۔ اس سے زمین کی صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور ساتھ ہی ان کی صحت بھی اچھی ہوگئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا کہ اس معجون نے تو آپ کو بہت فائدہ کیا تو انہوں نے ہنسکر جواب دیا کیا تمہارے نزدیک خدا بغیر دوا کے صحت نہیں دیتا۔ سید صاحب کو یہ سُنکر تعجب ہوا اور پھر سارا قصہ معلوم ہوا۔

ایک امر اُن سے حقیقت میں نہایت استقلال کا ظہور میں آیا۔ وہ یہ ہے کہ اُن کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال عین جوانی میں ہوگیا۔ اسوقت انکی عمر کوئی ۲۷ سال کی ہوگی۔ جیسا کچھ انہیں رنج ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ گریہ وزاری میں مصروف تھے۔ اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے تھے۔ اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ "خدا کی مرضی" لیکن بڑا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا۔ کہ اتفاق سے اُن ہی دنوں میں غریب کے عزیزوں کی ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامان شادی سب ہوچکا تھا۔ تاریخ بھی مقرر ہوچکی تھی۔ جب یہ موت واقع ہوئی۔ اس لئے حسب دستور اُن لوگوں نے اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ مگر سید احمد خاں کی والدہ اس انتقال کے تیسرے روز اُن کے گھر گئیں اور کہا کہ تمہاری شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم کرنا منع ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوچکا۔ تم شادی ہرگز ملتوی نہ کرو۔ اور جب میں تمہیں اجازت دیتی ہوں تو پھر تمہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس روشن خیال عورت کا یہ کام نہایت حیرت انگیز اور قابل تحسین ہے۔ درحقیقت ملک کی ترقی اور بہبودی کیلئے ایسی ماؤں کی بے انتہا ضرورت ہے۔

بعض امور جن میں سر سید احمد خاں کو میں نے خاص طور پر ممتاز سمجھا ہے

وہ اُن کے مذہبی خیالات ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کہاں تک صحیح اور کس حد تک غلط ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بارہ میں مذہبی تحقیقات اور شک کی ایک نئی تحریک لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی۔ میرا خیال ہے۔ کہ سرسید کے کیریکٹر کے اس پہلو پر بھی اُنکی والدہ کا بہت اثر پڑا۔ اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ توہمات اور تعصبات (جن کے سید صاحب سخت دشمن تھے) کی بیخ و بنیاد ان کی والدہ نے ابتدا ہی میں اُنکے دل سے اکھاڑ دی تھی۔

وہ کبھی کسی مقصد کے لئے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں۔ اور نہ انہیں فال واستخارا یا گنڈے تعویذ پر ذرا اعتقاد تھا۔ تاریخوں اور دنوں کی سعادت یا نحوست کی وہ ذرا برابر پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ انہیں خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ اور اس قسم کے امور کو خلاف شان اسلامی سمجھتی تھیں۔ اُن کا یہ اعتقاد تھا۔ کہ ہر بات کے لئے صرف خدا سے دعا کیجائے۔ پھر وہ جو چاہیگا کریگا۔ چنانچہ ایک واقعہ جس کا سید صاحب نے ذکر کیا ہے۔ اُن کے اس اعتقاد کی شہادت دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "میرے ننہال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے۔ (سید صاحب کے ننہال کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی) اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اُس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے۔ جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اور اُس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اُس کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا۔ بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اسکو امتناع ہوتا تھا۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی اُن کی ننہال والوں نے وہ گنڈہ پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈہ کے سبب سے انڈا یا مرغی کھانا ممنوع سمجھنا کہ اگر کھائینگے تو کوئی آفت آئیگی، خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف

بہت سے وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ اُن کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل اُن کو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے بڑے تھے اور انڈا پسند کرتے تھے۔ وہ بے تامل اُن کو چوا کر کھلا دیتی تھیں ۱۴ لہ

سید صاحب کہتے ہیں کہ "اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں۔ اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو نہیں پاتا۔ بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھکر بخشنے کا یا فاتحہ دیکر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سید احمد خاں پر مذہبی خیالات میں اُن کی والدہ کا کہاں تک اثر ہوگا۔

تیسرا امر جس میں میں نے سید احمد خاں کو خاص طور پر ممتاز خیال کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت انگریزی کے نہائیت وفادار اور خیر خواہ تھے۔ اور سب سے پہلا یہ شخص تھا جس نے نہائیت جانفشانی کے ساتھ اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں باہمی عمدہ خیالات اور عمدہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ اور اس میں اُسے بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ پچاس سال پہلے اور آجکل کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمان انگریزی سلطنت کے بدخواہ اور انگریزوں کی قوم کے جانی دشمن اور مخالف خیال کئے جاتے تھے۔ اور آج وہی مسلمان ہیں کہ برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ اور اُن کی وفادار رعایا کہلائے جاتے ہیں۔ اس وقت مسلمان کی صورت دیکھکر انگریز کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ ہماری سلطنت کا سب سے بڑا بدخواہ اور ہماری قوم کے خون کا پیاسا یہی شخص ہے۔ اور یہی شخص ہے جس کے بے رحم ہاتھ نے ہمارے معصوم بچوں اور بے کس بی بیوں کا بے دریغ خون بہایا ہے۔ لیکن آج مسلمانوں سے اس کا برتاؤ نہائیت

قابل تعریف ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعریف میں بڑے بڑے آرٹیکل لکھتا ہے۔ اور انہیں اپنی سلطنت کے قیام کے لئے بڑی تقویت خیال کرتا ہے۔ یہ حیرت انگیز تغیر صرف سید احمد خاں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جسے اعلےٰ درجہ کی کامیابی سمجھنا چاہئے اور زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ یہ سب کچھ بلا کسی غیر کی مدد کے صرف ایک شخص کی سرگرمی اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن انگریزی سلطنت کی خیر خواہی کا خیال سید احمد خاں کو غدر کے بعد پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ شروع ہی سے یہ خیال اُن کے دل میں

تھا۔ پھر اس خیال کی پیدا کرنے والی انکی والدہ تھیں۔ شاید پڑھکر ناظرین کو تعجب ہو۔ لیکن فی الحقیقت بات یہی ہے۔ جسے میں مختصر طور پر یہاں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں نے جب وزارت سے استعفا دیدیا۔ تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ۳۰ ہزار روپیہ سفر خرچ کے لئے پیش کیا۔ اور لاہور بلایا۔ اُن کے سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اُسے منظور فرمالیں۔ اور خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی۔ لیکن اُن کی بڑی بیٹی یعنی سید احمد خاں بہادر کی والدہ نے کہا۔ کہ "آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اسقدر کہ آپ اپنا بقیہ زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر کر سکتے ہیں۔ خود لاہور جانا۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات ہاتھ میں لینا۔ اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیا اتفاقات ہوں۔ اور کیسے ملکی انقلاب درپیش آئیں۔ اور کس قسم کے تکالیف کا سامنا ہو میں آپ کا انگریزی عملداری کو چھوڑ کر وہاں چلا جانا۔ پسند نہیں کرتی۔ دوسرے آپکا زمانہ ضعیفی ہے۔ اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں رہیں"۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس کا اسقدر اثر ہو۔ کہ اُنہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ اور سفر خرچ واپس بھیجدیا۔ سید

صاحب کی والدہ کے اس مشورے سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ کہ وہ انگریزی عملداری کی کسقدر قدر کرتی تھیں۔ اور اُسے کسقدر محفوظ خیال کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وزارت کو یہاں کے قیام کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھا۔ غدر کے زمانہ میں ایکدفعہ پھر اُن کا خیال انگریزی سلطنت کی نسبت ظاہر ہوا۔ اور حیرت ہے۔ کہ ہندوستانی عورت کو انگریزوں پر اسقدر بھروسہ تھا۔ جب دلی میں غدر ہوا تو اُس وقت سید صاحب بجنور میں صدر امین تھے۔ اور باقی انکے خاندان کے سب لوگ دلی میں تھے۔ اُن کی والدہ لوگوں سے کہتی تھیں کہ نہ انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجاینگے۔ تم سب خاموش اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہو۔ جو لوگ فساد میں شریک نہ ہونگے انگریز اُن کو کچھ نہیں کہینگے۔ ان کو اس بات کا پورا یقین تھا۔ کہ انگریزوں کی سلطنت جانے والی نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ فساد میں شریک نہیں۔ ان کو انگریز تکلیف نہیں دینگے۔ جب دلی کے فتح ہونے کا وقت قریب آیا۔ تو سب زن و مرد شہر سے بھاگ بھاگ کر باہر جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ مگر اُنھوں نے (سید صاحب کی والدہ نے) اور اُنکی ایک بہن نے جو نابینا تھیں۔ اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستائینگے۔ اپنے گھر سے قدم باہر نہ رکھا۔ لیکن افسوس اُن کا یہ خیال غلط نکلا۔ اُس تیرہ و تاریک زمانہ میں دوست دشمن میں تمیز کرنی نہایت مشکل تھی۔ اور کوئی کسی کا پرساں حال نہ تھا۔ چنانچہ جب دلی فتح ہوئی۔ تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ سید کی والدہ معہ اپنی بہن کے اُس کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ جس میں لاوارث بڑھیا زیبن رہا کرتی تھی۔ اور آٹھ دس روز بہت تکلیف سے بسر کیئے۔ سید صاحب اس مصیبت کی کہانی کو یوں بیان کرتے ہیں :-

" اس عرصہ میں میں میرٹھ آگیا تھا۔ میرٹھ سے دلی پہنچا۔ اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ

ملکہ اُسی پر بسر تھی - دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا - اور پانی کی نہائیت تکلیف تھی - میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی - اُنہوں نے دروازہ کھولا - پہلا لفظ جو اُنکی زبان سے نکلا یہ تھا - کہ "میں ! تم یہاں کیوں آگئے - یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں - تم چلے جاؤ ہم پر جو گذریگی گذریگی" - میں نے کہا کہ یہ آپ خاطر جمع رکھئے - مجھے کوئی نہیں مار سکیگا - میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے ملکر آیا ہوں" - انکی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا - کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے - میں پانی کی تلاش کو نکلا - پانی اس طرف کہیں نہیں ملا - کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی - جس سے پانی نکالا جا سکے - ناچار پھر قلعہ میں گیا - اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لیکر چلا - جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا - سڑک پر بیٹھی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے - اور کسیقدر بدحواس ہے - معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی - تھوڑی دُور چلکر بیٹھ گئی - اور پھر اُٹھا نہ گیا - مجھکو معلوم تھا - کہ وہ بھی پیاسی ہے - دو دن سے پانی نہیں ملا - میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا - اور کہا پانی پی لے - اُس نے کپ کپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی صراحی میں ڈالا - اور کچھ گرا دیا - اور گھر کی طرف اشارہ کیا - اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا - کہ "بیگم صاحب پیاسی ہیں - اُن کے لئے پانی لیجاؤنگی" - اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی" - میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے - میں لے آیا ہوں - تو پانی پی لے" - پھر آبخورہ میں پانی دیا - اُس نے پیا اور لیٹ گئی - میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا - اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا - اُنہوں نے خدا کا شکر کیا - اب میں گھر سے نکلا - کہ سواری کا بندوبست کر کے انکو لیکر قلعہ لیجاؤں - جب اُس مقام پر پہنچا - جہاں بڑھیا زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے - سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے - لیکن کہیں

سواری نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے۔ مجھ کو دیدی جائے۔ میں وہ شکرم لیکر گھر پر آیا۔ اور اپنی والدہ اور عالم کو اس میں بیٹھا کر میرٹھ لے آیا۔

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگئی اور صفرہ کی نہایت شدت ہوگئی۔ جو دوا یا غذا دیجاتی تھی وہ قے میں نکل جاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہوجاتی اور کبھی شدت ہوجاتی۔ آخر کار اسی مرض میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مگر اُن کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر ان کی بیٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بہوئیں جو مختلف مقامات میں چلی گئیں تھیں۔ سب اُنکے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ اور انہوں نے سب کو صحیح و سالم اور خیر و عافیت سے دیکھکر نہایت خوشی کی تھی۔

انہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھکو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے۔ دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ ان کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے۔ اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں۔ لیکن اگر میں زندہ رہتی تو انکی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اُس قدر نمازوں کا حساب کرنکے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دیدینا۔

جب کہ دوسرے دن انہوں نے قضا کی تو میں نے اُن کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔" اُن کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ کہتی تھیں کہ "مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں۔ اُس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے۔ مگر بندے اُس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔" انہوں نے سید صاحب کو ایک دفعہ نصیحت کی کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو۔ اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہوگا۔ تو تم دلیل کبھی سواری پر جایا کرو۔ اور کبھی پیادہ پا۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اسکو نباہ سکو۔" اُن کی یہ

نصیحت کس قدر پُر حکمت ہے۔ اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو۔
اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ
نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اسکی نیکی
کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا ۲۲

اس مختصر مضمون کے پڑھنے سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سر سید کی والدہ
کیسی عالی خیال۔ دانشمند اور نیک طینت بی بی تھیں۔ اور سید صاحب کی لائف
پر ان کی والدہ کا کیا اثر پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اُس اثر کو کامل طور پر بیان کر کے
بتانا۔ میرے خیال میں نہ صرف مشکل ہی ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اور اگر خود سر سید بھی
چاہتے۔ تو اُسے کامل طور پر نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ پر مختلف
اوقات میں مختلف طور کے اثر ایسے نامعلوم طور پر پڑتے رہتے ہیں۔ کہ انکی اصلیت
اور وجہ کا بتانا یعنی یہ معلوم کرنا کہ یہ کہاں سے آئے۔ اور کیونکر آئے۔ نہایت پُر دقت
امر ہے۔ اور خصوصاً اوائل عمر میں جب کہ اس قسم کی تحقیق اور تمیز کی طرف بالکل توجہ
نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس سے بہت
زیادہ بلکہ بے انتہا زیادہ اثر سید صاحب کی لائف پر اُن کی والدہ کا پڑا۔ کیا کچھ کم
حیرت کی بات ہے۔ کہ ہمارے زمانہ کا بڑا ریفارمر اور لیڈر عالی دماغ مصنف
اعلےٰ درجہ کا پولیٹیشن۔ ایک سچا روشن خیال۔ بڑا مخلص قوم اور ملک اور سلطنت کا
ہمدرد اور بہی خواہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی ماں کا سچا شاگرد تھا۔ (اور کیسی
ماں جسکو کشمیر کی خاک پاک سے نسبت تھی۔ جو ذکاوت و ذہانت اور روشن خیالی
کا مخزن ہے)

وہ لوگ جو تعلیم نسواں کے مخالف ہیں وہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو اُنہیں معلوم
ہوگا۔ کہ اُن کے بہت سے خیالات بہت سے عادات بہت سے توہمات اور
تعصبات بہت سے جھوٹ موٹ کے ڈر اور جھوٹ موٹ کی امیدیں جو اُن کے
دلوں میں پتھر کی لکیر ہو گئی ہیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں سے اخذ کی ہیں۔ اب اگرچہ

وہ ان میں سے بہت سے خیالات کو غلط اور فضول تصور کرتے ہیں لیکن افسوس
دل سے نہیں مٹا سکتے یہ سبق انہوں نے اپنی ماؤں کے گھٹنوں پر بیٹھکر سیکھے ہیں
اس وقت جب کہ ان میں برُے بھلے کی مطلق تمیز نہ تھی۔ اور ان کے ننھے ننھے دلوں
نے ایسی ایسی باتوں کو اخذ کرلیا جن میں دیکھکر آج وہ پچھتاتے ہیں جو لوگ کہ ملک کی
ترقی کے خواہاں ہیں انہیں! بلکہ جو لوگ صرف اپنی اولاد اور خاندان کی بہبودی
چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم نسواں کی طرف توجہ کریں کیونکہ جب تک ہمارے ہاں کی عورتیں لکھی پڑھی اور قابل نہ ہونگی ہماری اولاد کے
دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور جب آج ہمیں انکی عصمت اور غربت
پر ناز ہے۔ ایک روز ان کی لیاقت اور عالی دماغی پر بھی فخر حاصل ہوگا۔
(مولوی عبدالحق صاحب بی اے حیدرآباد دکن)

حواشی اور حوالے :

۱۔ سرسیّد احمد خاں نے یہ بات اپنی تالیف "سیرۃ فریدیہ" (زمانۂ تحریر اگست ۱۸۹۳ء) میں اپنی والدہ کی تعلیمات و تربیت کے، اپنی ذات پر اثرات کے ضمن میں کہی ہے، دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۶ء، ص ۴۷۔
"سیرۃ فریدیہ" ہی میں ایک دوسرے موقع پر سرسید احمد خاں نے لکھا ہے کہ "میری والدہ عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانشور اور دور اندیش، فرشتہ صفت بی بی تھیں — "(ایضاً ص ۵۳)۔ "اگر لوگ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ...... ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اُس نے تربیت کی ہو، کیا اثر پڑتا ہے۔"(ص ۵۳، ۵۴)

۲۔ بابائے اردو نے اپنی معروف کتاب "چند ہم عصر" میں سرسید احمد خاں کا شخصی خاکہ لکھتے ہوئے، سرسید کے مزاج اور ان کی نہاد میں والدہ کے اثرات کی نشاندہی کی ہے: "...... سرسید کے گھر کے سارے انتظام اور اولاد کی تربیت کا بار ان کی والدہ پر تھا۔ یہ سرسید کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور ان میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ سرسید کی زندگی پر ان کا بڑا اثر تھا — " (چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۴۶)

"سر سید احمد خاں نے اخلاق کے بہت سے سبق اپنی والدہ سے سیکھے اور عمر بھر ان پر عمل کیا—"

(چند ہم عصر، ایضاً، ص ۳۴۴)

"گھر میں سر سید کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی...... اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے ان کے دل میں بٹھا دیئے تھے، وہ عمر بھر نہ بھولے اور ان پر عامل رہے—"

(چند ہم عصر، ص ۳۲۱)

۳۔ حالی نے "حیاتِ جاوید" میں اس شہادت کے حوالے سے لکھا ہے کہ "سر سید نے ایجوکیشن کمیشن میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے، اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں—"

(حیاتِ جاوید، نیشنل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۰۸-۶۰۹)

۴۔ سر سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء بیگم، خواجہ فرید الدین احمد کی بڑی بیٹی تھیں۔ دوسری بیٹی کا نام فاطمہ بیگم اور تیسری بیٹی فخر النساء بیگم تھیں۔"

(سیرۃ فریدیہ، ص ۴۵)

عزیز النساء بیگم کے دو بھائی تھے: خواجہ وحید الدین احمد اور خواجہ زین العابدین خاں (سیرۃ فریدیہ، ص ۴۹)۔ خواجہ فرید الدین احمد کی ایک ہی بیوی تھیں اور ان سے پانچ اولادیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں، تین تین برس کے فاصلے سے غالباً ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء کے پیدا ہو چکی تھیں—"

(سر سید احمد خاں، سیرۃ فریدیہ، ص ۸)

۵۔ دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۴۵

۶ و ۷۔ سیرۃ فریدیہ، ص ۷۴ اور ص ۴۶۔۴۷

۸۔ "سیرۃ فریدیہ" (ص ۵۱) کے مطابق سر سید احمد خاں کے ان "دوست" کا نام حکیم غلام نجف خاں تھا۔ حکیم غلام نجف خاں کے حالات میں دیکھئے دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمن، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۱-۱۹۳۔ نیز رجوع کیجئے آثار الصنادید (سید احمد خاں)، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، اردو اکادمی، دلی ۱۹۹۰ء، ص ۵۰۔۵۱

۹۔ دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۴۷

۱۰۔ سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر، شیخ الشیوخ حضرت مولانا شاہ غلام علی سے بیعت تھے۔ وہ "سید الاخبار" کے مالک اور مدیر رہے۔ ۱۸۴۵ء میں بعمر ۲۷، ۲۸ برس انتقال ہوا اور قبرستان خواجہ باقی باللہ دہلی میں تدفین عمل میں آئی۔

(حالی، حیاتِ جاوید، ایضاً، ص ۴۵)

۱۱۔ دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۲-۵۳

۱۲۔ دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۴۹

۱۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (ولادت ۱۷۴۶ء، وفات ۱۸۲۴ء) کے حالات میں دیکھئے: آثار الصنادید،

سر سید احمد خاں، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، ایضاً ص ۵۵-۵۷، نیز ص ۲۶۵-۲۶۶

۱۴۔ سید حامد کا انتقال جنوری ۱۸۹۴ء میں ہوا (مکتوب سر سید بنام نیاز محمد خاں مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۸۹۴ء) حالی نے لکھا ہے کہ سر سید احمد خاں پر "سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ نہایت سخت ہوا تھا۔ پندرہ بیس روز تک ان کی حالت نہایت نازک رہی ——" (حیاتِ جاوید، ص ۷۳۱)

۱۵۔ سر سید احمد کے چھوٹے بیٹے سید محمود (ولادت ۲۴ر مئی ۱۸۵۰ء، وفات ۸ر مئی ۱۹۰۳ء) کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں دیکھئے: بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی کتاب —— چند ہم عصر، ایضاً، ص ۱-۱۲

۱۶۔ رجوع کیجئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۰

۱۷ و ۱۸۔ سیرۃ فریدیہ، ص ۵۲ اور ص ۳۱ (علی الترتیب)۔

۱۹ و ۲۰۔ دیکھئے: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۴ اور ص ۵۴ تا ۵۶

۲۱۔ تاریخِ وفات: یکم ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ / مطابق نومبر ۱۸۵۷ء، بحوالہ: سیرۃ فریدیہ، ص ۵۷

۲۲۔ سیرۃ فریدیہ، ص ۴۹

۲۳ و ۲۴۔ سیرۃ فریدیہ، ص ۵۱ اور ص ۵۴

۲۵۔ تعلیم نسواں کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اس نقطۂ نظر کی تائید، اُن کی ایک قدیم تر تحریر (مطبوعہ رسالہ "معلم نسواں" جلد ۱۰، نمبر ۳، سال ۱۸۹۶ء) سے بھی ہوتی ہے۔ تب سر سید، حیات تھے اور مولوی عبدالحق اُن کے مدرسۂ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ دیکھئے: راوی، گورنمنٹ کالج، لاہور، اگست ۱۹۹۷ء، ص ۱۱۸۔

○

"سادگی و پُرکاری کمالِ صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ سر سید کی تحریر اس لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پُراثر، اور پُرخلوص تھی ——"

—— بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

گشتی کُتب خانہ

از:
مولوی عبدالحق

تحریر: مارچ ۱۹۴۵ء

"کشتی کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے تیسرے سالانہ جلسے
میں بابائے اردو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر خود اپنے قلم
سے لکھ کر ۹۔ مارچ ۱۹۴۵ء بمقام ساگر ٹاکیز اکسیلسیر تھیٹر (میں)
پڑھی اور میں نے قبلہ سے بہ غرضِ حفاظت چھین لی۔۔۔۔۔۔"

عمر یافعی
۵۴ ۵/۹ ف

اس نادر تقریر کا قلمی مسودہ' جو خود بابائے اردو کے سوادِ تحریر میں ہے
عبدالصمد صاحب (اردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد دکن) کے کتب
خانے میں پھٹے ہوئے اوراق کی شکل میں موجود
ہے۔۔۔۔۔ جناب مصلح الدین سعدی ؒ نے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو
مسودے کے بیس شکستہ ٹکڑوں کو جوڑ کر بڑی محنت اور عرق ریزی
سے اس تقریر کو محفوظ کیا اور اس کی ایک صاف اور مصدقہ نقل اپنے
لاہور کے ایک پھیرے میں مجھے فراہم کی۔ ان کے شکریے کے
ساتھ اسے ذیل میں محفوظ کرتا ہوں۔

[سید معین الرحمٰن]

"۔۔۔۔۔ حال (۱۹۴۴۔۴۵ء) ہی میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو ابھی
لندن سے واپس آئے ہیں۔ وہ کئی سال سے وہاں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ نہایت مہذب
اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ ایک مدت سے لندن میں ہوں۔ آج

کل اردو کتاب وہاں ملتی نہیں اس لیے میں اپنی زبان و ادب سے بیگانہ سا ہو گیا ہوں۔ مجھے (کتابوں کی) ایک ایسی فہرست بنا دیجئے جن کا مطالعہ میرے لیے مفید ہو۔ اس میں جدید کتابیں بھی ہوں۔

میں نے کہا کتابوں ہی کی فہرست میں بنا دوں گا لیکن ''ہماری کتابیں'' بھی پڑھا کیجئے۔ وہ سمجھے میرا منشاء مری اپنی انجمن ترقی اردو کی کتابوں سے ہے۔ میں نے کہا نہیں ''ہماری کتابیں'' ایک ماہانہ رسالہ ہے جو سید علی شبر حاتمی صاحب حیدر آباد سے شائع کرتے ہیں۔ اس میں اردو کی نئی کتابوں کا خاص طور پر ذکر ہوتا ہے۔ یہ گشتی کتب خانہ انجمن ترقی اردو کا ہونہار بچہ ہے۔

کتب خانہ اب ہماری زندگی کے لوازم میں سے ہو گیا ہے۔ علمی معلومات اور تحقیقات کے لیے اس کا ہونا ناگزیر ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے شبہ علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن وہاں زیادہ تر طالب علموں کا مقصد امتحان پاس کرنا اور استادوں کا امتحان پاس کرانا ہوتا ہے۔ اس میں ان کا قصور نہیں نظام تعلیم ہی ایسا ہے۔

یہ نہ بھی ہو تو بھی بی اے کے طالب علم کے نصاب میں اُس کے فن کی صرف چند کتابیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی فن کی چند کتابیں پڑھ کر کوئی شخص عالم نہیں ہو سکتا۔ علم کی پیاس بجھانے کے لیے اسے کتب خانوں میں آنا پڑتا ہے۔

اگر آپ ایسے باکمال اشخاص کی فہرست بنائیں جنھوں نے علم و ادب میں کارہائے نمایاں کیے ہوں اور ان کے حالات کی تحقیق کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی وہ علمی تحقیقاتیں جن پر دنیا فخر کرتی ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں (تکمیل) نہیں پائیں بلکہ انہوں نے کتب خانوں میں بیٹھ کر شب و روز محنت اور دماغ سوزی سے انجام دی ہیں ــــــ کتب خانوں کا احسان کچھ کم نہیں ہے۔

کتاب خانے میں ہر قسم کی کتابیں رکھنی پڑتی ہیں۔ ہر فن اور علم کی مستند اور اعلیٰ پائے کی کتابوں کا رکھنا لازم ہے لیکن بُری بھی' ہر طرح کی کتابیں رکھنا ضروری ہے۔ کیوں کہ لوگ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں ــــــ ایک کتاب جسے میں بُری سمجھتا ہوں'

دوسرا اسے اچھی خیال کرتا ہے کیوں کہ یہ لوگ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں ------ یا' ایک کتاب میں شوق سے پڑھتا ہوں' دوسرے کی نظر میں بالکل بیکار ہے۔ بعض اوقات بُری کتاب کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ڈھونڈے سے ملتی نہیں۔

مجھے اُردو لُغات کی ترتیب میں بعض ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی جو بہت ناپاک خیال کی جاتی ہیں اور بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں۔ ان میں بعض ایسے الفاظ اور محاورے کی نظیریں ملیں جو دوسری کتابوں میں نہیں تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ کھوٹا پیسا اور برا بیٹا وقت پر کام آ جاتا ہے۔ یہی حال ایسی کتابوں کا بھی ہے۔ اس وجہ سے بعض لوگ عام طور پر کتابوں سے خصوصاً جدید کتابوں سے بدگمان ہیں۔

ایک ۵ مدرسے کے طالب علموں نے کسی ناراضی کی وجہ سے ہڑتال کر دی۔ مدرسے کے ناظم صاحب نے اردو کتب خانہ مقفل کر دیا اور فرمایا کہ اردو کتابیں پڑھنے سے لڑکوں میں باغیانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں اب تک یہ نہ معلوم تھا کہ اور شاید کبھی نہ ہو کہ اردو کتابیں پڑھنے سے اتنے باغیانہ خیالات پیدا نہیں ہوتے جتنے ادارے کے منتظموں کے برتاؤ اور رویے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کتابیں بے چاری مفت میں بدنام ہیں۔

کتابوں کی چوری بھی ہوتی ہے۔ یہ فنِ شریف اس قدر عام اور مقبول ہوا کہ نیک دل کتاب چوروں نے اس کے لیے ایک مسئلہ گھڑ لیا کہ کتاب کی چوری' چوری نہیں ہوتی۔ کوئی ۶ اس کے دل سے پوچھے جس کی کتابیں چوری کی جاتی ہیں۔

سُنا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ مرض عام ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا کتب خانہ ہو جہاں سے کوئی کتاب چوری نہ کی گئی ہو ------ یا کتابوں میں سے کچھ ورق یا تصویریں غائب نہ کر لی گئی ہوں۔ اس وجہ سے بعض کتب خانوں کے ناظم نگرانی میں بہت سختی اور کتابیں دینے میں بہت خست کرتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ کتب خانہ آصفیہ جب کہ وہ اس مکان میں تھا جہاں آج کل (۱۹۴۵ء میں) نظامت (صدر) پٹہ خانہ کا دفتر ہے۔ مولوی علی حیدر طباطبائی مرحوم

اس کے مہتمم تھے۔ وہ بیچ ہال میں بیٹھے رہتے تھے اور اردگرد دیوار سے لگی ہوئی الماریاں ہوتی تھیں۔ جب کوئی ان سے کتاب مانگنے آتا' انہیں بہت گراں گزرتا۔ تھوڑی دیر تو خاموش رہتے کہ شاید یہ بلاٹل جائے لیکن جب دیکھتے کہ یہ ٹالے سے نہیں ٹلتا تو وہ کمر بند سنبھالتے ہوئے اٹھتے' کیوں کہ الماریوں کی کنجیاں ان کے کمر بند سے بندھی ہوئی لٹکتی رہتی تھیں۔

کمر بند ہاتھ میں لے کر وہ الماری کا قفل کھولتے اور کتاب نکال کر حوالے کر دیتے جب تک وہ کتاب پڑھتا رہتا یہ تیز نظروں سے دیکھتے رہتے۔

نگرانی ضرور ہونی چاہیے مگر نہ ایسی کہ وہ ناظرین (قارئین) کی تکلیف کا موجب ہو۔ کتب خانوں میں ناظموں اور کارکنوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہم درد ہوں اور ناظرین کو ہر قسم کی سہولت پہنچا دیں۔ بعض ناظم جو خود بھی قابل ہوتے ہیں نہ صرف ناظرین کو کتابوں کی تلاش میں مدد دیتے ہیں بلکہ ایسی کتابوں اور رسالوں کا پتہ بھی بتا دیتے ہیں جن کے مطالعے سے ناظرین (قارئین) کو اپنے موضوع کی تحقیق میں مدد ملتی ہے۔

آج کل کتاب خانوں میں مختلف قسم کے رسالے اور اخبار بھی رکھے جاتے ہیں۔ ان سے روزہ مرہ کے واقعات اور حالات حاضرہ سے واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ایک بار نواب عماد الملک مرحوم کتب خانہ آصفیہ کے معائنے کے لئے آئے۔ یہی اس کے بانی اور سرپرست اور صدر تھے۔ اس وقت کتب خانے میں ایک ایرانی بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ہو لیے اور شکایت کرنے لگے کہ اس کتب خانے میں صرف دو چار اخبار آتے ہیں۔ اب زیادہ تعداد میں مختلف قسم کے اخباروں کو منگوانے کا انتظام ہونا چاہئے نواب صاحب نے فرمایا ''آغا' این کتب خانہ است' طوطی خانہ نیست'' نواب صاحب کا خیال تھا کہ اخبار زیادہ تعداد میں ہوں گے تو لوگ کتابیں نہیں پڑھیں گے ------اور اسے وہ ناپسند کرتے تھے۔

پہلے ایسا ہو تو ہو لیکن اب کتب خانوں میں رسالوں اور اخباروں کا ہونا بہت

ضروری ہے۔ ان میں بعض اوقات بڑی کام کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسے نئے مضامین اور تحقیقاتیں ہوتی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتی اس لیے ان کی جلدیں محفوظ رکھنی پڑتی ہیں۔

کتب خانوں کے ہوتے ہوئے بھی اکثر اصحاب ان سے استفادہ نہیں کر سکتے کچھ تو اپنی کاہلی کی وجہ سے اور کچھ مصروفیت کی وجہ سے۔ گشتی کتب خانہ ایسے صاحبوں کے لیے بڑی سہولت اور برکت کا باعث ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے لوگوں کو کتابیں پہنچ جاتی ہیں اور وہ اپنی فرصت کے وقت ان کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ ایسے کتب خانوں کو چلانے کے لیے بڑی تنظیم اور مستعدی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو شکایت کا موقع نہ ملے------اور کتابیں وقت پر ملتی رہیں۔

سید علی شبر (حاتمی) صاحب (نے) گشتی کتب خانہ قائم کر کے بہت ہی قابل قدر کام کیا ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک بہت بڑے مقصد کو پورا کیا ہے۔ کتب خانے کے لیے دو تین باتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ عمارت ناقص اور بوسیدہ نہ ہو ورنہ کتابوں کے خراب ہونے اور ان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ روشنی اور ہوا کا کافی انتظام ہو۔ کارکن ہمدرد ہوں اور اپنے شوق سے کام کریں۔ یہ سب باتیں گشتی کتب خانے کو میسر ہیں اور اس کے ناظرین کے روز افزوں اضافے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے------ ممکن ہے کہ اگر اس کی اپنی عمارت بن جائے تو اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور بہت ممکن ہے یہ کتب خانہ ایک دن تعلیمی اور تہذیبی مرکز بن جائے۔

ایسے کتب خانوں کے لیے سرکاری امداد کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ کتابوں کے ذخیرے میں معقول اضافہ ہو سکے اور کارکنوں کو ایسی تنخواہ دی جا سکے کہ وہ اپنے کام کو زیادہ شوق اور مستعدی سے انجام دے سکیں۔ سرکاری امداد سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کتب خانے کے کام میں زیادہ توسیع ہو سکے گی یعنی ایسے مقامات پر اس کی شاخیں قائم کی جا سکیں گی جہاں ان کی شدید ضرورت ہو------اور جہاں کتابوں کے میسر ہونے کا کوئی انتظام یا موقع نہیں ہے۔ بغیر ایسی امداد کے کتب خانے کو بہتر حالت میں رکھنا اور ترقی دینا ممکن نہیں۔

جنگ کے بعد حالات میں بہت تغیر و تبدل ہونے والے ہیں۔ تعلیم کی توسیع کی بہت سی تجویزیں پیش ہو رہی ہیں اور ہوں گی۔ ان تجویزوں میں کتب خانوں کے قیام اور توسیع کا مسئلہ بھی بحث میں آئے گا ------ کیوں کہ مدارس اور کالجوں کے بعد کتب خانے، علم کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں بلکہ بعض اعتبار سے ان سے بھی برتر ہیں۔ امید ہے کہ اس وقت یہ گشتی کتب خانہ اپنے حق سے محروم نہ رہے گا اور اسے معقول امداد دی جائے گی۔

سید علی شبر حاتمی صاحب کتابیں بیچتے ہیں، کتابیں چھاپتے ہیں، کتابیں لکھواتے ہیں، کتابیں تقسیم کرتے ہیں کتابوں کی فہرستیں مرتب کرتے اور شب و روز کتابوں کی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری آپ کی سب کی کتابوں کے اشتہار دیتے ہیں، گویا سراپا کتاب ہیں ------ جب وہ مجھ سے ملتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی کتاب چلی آ رہی ہے اور میں ے ہذاالکتاب لاریب فیہ کا ورد کرنے لگتا ہوں ------ لیکن ایک بات میں مجھے اب تک شبہ ہے کہ وہ خود بھی کتابیں پڑھتے ہیں یا نہیں!؟ مولوی تصدق حسین مرحوم کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم تھے۔ بڑے نیک دل اور صاحبِ علم بزرگ تھے۔ وہ بھی اسی طرح کتابوں کا ذکر کرتے، فہرستیں لکھواتے، کتابوں کی ترتیب دینے میں مصروف رہتے لیکن کتابیں پڑھتے انہیں بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانوں کے ناظموں کا حال ان کلالوں کا سا ہے جو سب کو پلاتے ہیں اور خود نہیں پیتے! خیر وہ خود پئیں یا نہ پئیں لیکن دوسروں کی پیاس بجھانا بھی خود ایک نیک کام ہے۔

شبر صاحب بہت نیک سیرت ہمدرد مستعد اور صالح نوجوان ہیں۔ ہر وقت مصروف رہتے ہیں اور اپنے کام سے انتہا درجہ شوق ہے۔ انہیں کارکن بھی ایسے ہی اچھے ملے ہیں۔ گشتی کتب خانہ قائم کر کے انہوں نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہم سب کو ان کی اعانت کرنی چاہئے اور قدر کرنی چاہیے اور ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہونا چاہیے ------ شکریہ۔

[۹۔ مارچ ۱۹۴۵]

حوالے اور حواشی

۱۔ ابو محمد الیافعی، ولادت حیدر آباد دکن ۲۳ جون ۱۸۹۴ء وفات: حیدر آباد دکن ۲۳۔
اگست ۱۹۶۱ء بابائے اردو کے دیرینہ رفیق ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۱ء تک بابائے اردو اور
عمر یافعی کے مابین قریبی مراسم رہے۔ ان کے حالات میں دیکھیے، مضمون از:
سخاوت مرزا، مطبوعہ قومی زبان، کراچی اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۸......۲۴۔
نیز دیکھیے: قومی زبان، اگست، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۵۔۱۲۹

۲۔ "اقبال اکیڈمی حیدر آباد دکن کے رسالے "اقبال ریویو" کے ایڈیٹر مصلح الدین
سعدی بڑے اقبال پرست اور پختہ کار ادیب ہیں....." ڈاکٹر گیان چند، ہماری
زبان دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۵۔

۳۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے بقول "یہاں کاغذ پھٹ گیا ہے، یہ لفظ ربط عبارت
سے پڑھا گیا..........." (معین الرحمٰن)

۴۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے مشاہدے کے مطابق "یہ جملہ سیدھے جانب
حاشیے پر بعد میں لکھا گیا ہے۔" (معین الرحمٰن)

۵۔ مصلح الدین سعدی صاحب کے مشاہدے کے مطابق "یہ تحریر حاشیے پر بائیں
جانب درج ہے........." (معین الرحمٰن)

۶۔ "یہ جملے حاشیے پر درج ہیں" (مصلح الدین سعدی)

۷۔ "یہ فقرہ حاشیے پر سیدھی جانب درج ہے" (سعدی) ۔

"حیدر آباد میں گشتی کتب خانہ ہرگز انجمن کا نہ تھا۔ اس کے مالک بلا
شرکت غیرے شبر حاتمی صاحب تھے اور ان کا یہ کمال تھا کہ اسے
یہاں (کراچی) لے آئے اور انجمن کی نذر کر دیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا
احسان ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس نے میری اور
خصوصاً انجمن کی بڑی خدمت کی ہے اور اس احسان کو تسلیم نہ کرنا بڑی
ناشکری ہوگی۔"
| بابائے اردو، بنام محمد امین زبیری، ۳۔جنوری ۱۹۵۳ء، قومی زبان
، کراچی اگست ۱۹۶۶ء ص ۱۱۷ |

انجمن ترقی اُردو پاکستان

اسپتال روڈ۔ کراچی ۱

مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۵۳ء

نمبر ______

عزیزم سلمہٗ ۔ آپ کا خط پہنچا جس نے ایک ایسی یاد تازہ
کردی جو میرے لیے بہت مسرت کی ہے۔ آپ کے والد صاحب شیخ کرم داد صاحب
گوجرانوالہ مشن کے ہائی اسکول میں معلّم تھے اور میں طالب علم
تھا۔ وہ میرے حال پر بڑے مہربان تھے اور بہت شفقت فرماتے تھے۔
کچھ دنوں بعد میں علی گڑھ چلا آیا اور ایم۔ اے۔ او کالج
[illegible] کئی سال بعد جب علی گڑھ کالج میں
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو آپ کے والد بھی
اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر اُن سے
ملاقات ہوئی اور وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ تعلیم سے
فراغت کے بعد میں حیدرآباد دکن چلا گیا۔ بہت عرصے کے بعد
جب میں صوبۂ اورنگ آباد کا صدر مہتمم تعلیمات تھا آپ کے والد کا
خط آیا۔ (انھوں نے شاید اخباروں میں میرا نام پڑھا ہوگا) اور مجھ
سے دریافت کیا کہ کیا تم وہی عبدالحق ہو جو کچھ دنوں [illegible]

بشکریہ ڈاکٹر سید معراج نیّر

میرا کُتب خانہ

مولوی عبدالحق

"میرا کتب خانہ" کے موضوع پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی درج ذیل تقریر آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے "آواز" دہلی (جلد ۱۱ نمبر ۱۳ شمارہ ۲۲۔ جون ۱۹۴۶ میں شائع ہوئی رسالہ "آواز" کے اس شمارے کا تراشہ میرے ذاتی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے-----"

[ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن]

کتاب مونس تنہائی ہے۔شفیق دوست اور معلم بھی۔میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر کتابیں نہ ہوتیں، یا کوئی ایسی آفت نازل ہوجائے کہ تمام کتابیں معدوم ہو جائیں تو دنیا کا کیا حال ہو۔ظاہر ہے کہ ہماری دماغی اور روحانی دولت تو تلف ہو ہی جائے گی لیکن زندگی کا لطف بھی جاتا رہے گا۔

ہر شہر میں سرکاری غیر سرکاری بڑے چھوٹے کتب خانے ہوتے ہیں لیکن اس سے آدمی کی اپنی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔اس لئے اکثر اشخاص، غریب سے غریب بھی یہاں تک کہ بعض مودھو بھی اپنے نجی کتاب خانے رکھتے ہیں۔یہ ان کے شوق اور پسند کا گنجینہ ہے۔پسند کو انسان کی زندگی میں بڑا دخل ہے۔پسند ایک قدرتی فعل ہے۔ ایک زندہ شخص اس لئے زندہ ہے کہ وہ پسند یا ناپسند کر سکتا ہے۔

پہلے ہمارے پڑھے لکھے گھرانوں میں کتابیں لازمی طور سے ہوتی تھیں اور جو صاحبِ علم اور کتابوں کے شائق ہوتے، ان کے کتب خانے تو بڑے مشہور اور قابلِ قدر

ہوتے تھے۔ ہمارے ملک میں مطبع کے اجراء کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا۔اس لئے ان نجی کتاب خانوں میں قلمی کتابیں ہی ہوتی تھیں۔ان کے لئے کاتب رکھے جاتے تھے۔اکثر شوقین اور خصوصاً جو صاحب استطاعت نہ ہوتے وہ اپنے شوق کی کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر اپنے کتاب خانوں میں رکھتے۔ان کو ان کتابوں سے اور کتابوں کی بدولت علم سے محبت ہوجاتی تھی۔

میں جب علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھاتو میں نے آزاد بلگرامی کی کسی کتاب میں درویش شاہ مسافر(اورنگ آباد دکن) کے کتاب خانے کی تعریف پڑھی۔

انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ایسا وسیع اور اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہے کہ چھ مہینے میں صرف ایک حصے کی سیر کر پایا۔یہ پڑھ کر مجھے اس کتب خانے کے دیکھنے کا شوق دامن گیرہوا۔اس وقت اورنگ آباد تک ریل نہ تھی۔احمد نگر سے تانگے میں جانا پڑتا تھا۔وہاں گیا تو سخت افسوس اور مایوسی ہوئی۔تین چار الماریاں رکھی تھیں۔ان میں کچھ تو قلمی کتابیں تھیں اور باقی مطبوعہ۔نادر کتاب کوئی بھی نہ تھی۔عمارت کے نیچے ندی بہتی ہے۔ہر سال برسات میں جب ندی چڑھاؤ پر ہوتی تو ان کتابوں کے بہت سے صندوق جو دیمک اور کیڑوں کی نذر ہو چکی تھیں' بہا دیئے جاتے ہیں تاکہ بے ادبی نہ ہو۔ایسے سینکڑوں کتاب خانے جو ہماری دولت علم کے بے بہا خزانے تھے ہماری جہالت اور غفلت اور اس ملک کی ناموافق آب وہوا کی بدولت تباہ و برباد ہوگئے۔

مجھے کتابوں کا ابتدا سے شوق رہا۔طالب علمی میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ ادب'فلسفہ'تاریخ وغیرہ کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں اور جمع بھی کیں لیکن جب اردو زبان کی طرف خاص توجہ ہوئی اور پھر انجمن ترقی اردو کا بار مجھ پر پڑاتو میں نے اردو کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرنی شروع کیں۔ان میں زیادہ تر قدیم اردو کی قلمی کتابیں ہیں کوئی اڑھائی تین ہزار ہوں گی۔نویں صدی ہجری سے لے کر بعد تک کی۔ یہ ہماری زبان کے اتار چڑھاؤ اور ارتقاء کا آئینہ ہیں۔یہ کتابیں میں نے کیونکر حاصل کیں'ایک طویل داستان ہے اور بہت دلچسپ۔اکثر قیمتاً خریدیں۔بعض احباب نے نذر کیں

اور چند ایسی بھی ہیں نقل کروائیں یا فوٹو سٹاٹ (photo stat) کے ذریعے سے حاصل کیں۔ چونکہ ابتداءً اردو کا ادب دکن اور گجرات میں پھولا پھلا۔اس لیے ان علاقوں کی خاک چھانی۔ جب میرے شوق کا حال معلوم ہوا تو حیدر آباد میں بعض احباب پرانی کتابیں تلاش کر کے لاتے اور میرے ہاتھ بیچ جاتے۔اس میں میں بہت بدنام ہوں۔لوگوں کو شکایت تھی کہ میں نے زیادہ قیمتیں دے دے کر نرخ بڑھا دیا ہے۔اصل یہ ہے کہ نادر اور قلمی کتاب کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔یہ خریدنے والے کے شوق اور بیچنے والے کی ضرورت پر ہوتی ہے۔ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر اس وقت ہاتھ سے نکل گئی تو پھر شاید ہاتھ نہ آئے۔بعض اوقات ایسا ہوا بھی جس کا پچھتاوا مجھے اب تک ہے۔

ابتدائی اردو کی نشوونما میں صوفیا کا بڑا حصہ ہے۔ تھے تو وہ فقیر لیکن ان کا اثر اور اقتدار بادشاہوں سے بھی بڑھ کر تھا۔اس لئے کہ وہ مرجع خلائق تھے اور امیر غریب، عام خاص، جاہل و عامی، بلا امتیاز قوم و ملت ان کے ہاں حاضر ہوتے اور کسب فیض کرتے۔اپنے عقائد و اصول کی تلقین کے لئے جہاں انہوں نے اور ڈھنگ اختیار کئے تھے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی عام زبان سیکھیں اور اپنا پیغام عوام تک پہنچائیں اور وہ زبان جو ہر جگہ ان کے کام آئی۔اس وقت اردو کی قدیم صورت تھی۔اس میں انہوں نے زبانی ہی تلقین نہیں کی بلکہ بہت سی کتابیں اور رسالے بھی لکھے جو تقریباً سب نظم میں ہیں۔ کیونکہ نظم بالطبع زیادہ مرغوب ہوتی ہے اور لوگ اسے آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان بزرگوں کے اکثر جانشین علم و معرفت سے بے بہرہ ہیں اور اپنے اسلاف کا سرمایہ برباد کر چکے ہیں پھر بھی تلاش کرنے سے اس کی کھرچن میں بہت سے انمول جواہر ملے۔

حیدر آباد دکن کے تو اکثر مقامات کا دورہ کیا لیکن اس کے علاوہ گجرات، میسور، بیجاپور وغیرہ علاقوں میں بھی بار بار گیا اور محنت کا پھل پایا۔یوں تو میرے کتب خانے میں انگریزی، فارسی، عربی کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں بعض مثلاً تذکرۃ الخواتین وغیرہ ایسی ہیں جو ہندوستان کے کسی کتب خانے میں نہیں، لیکن یہ بیان بہت طویل ہو جائے گا

اس لئے میں صرف قدیم اردو کی ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نایاب ہیں اور جن میں سے اکثر دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں پائی جاتیں ۔

سب سے اول میں صوفیا کے کلام کا ذکر کرتا ہوں ۔اس ضمن میں میں نے ان قدیم ملفوظات کو بھی جمع کیا جن میں حالات کے ساتھ ان کے بعض اقوال بھی درج ہیں مثلاً ان کتابوں میں شیخ فرید الدین شکر گنج (ولادت ۵۶۱ھ) شیخ حیدر الدین ناگوری (ولادت ۵۹۰ھ) شیخ بوعلی قلندر (وفات ۷۲۴ھ) شیخ سراج الدین عثمان (ولادت ۷۵۸ھ) شیخ شرف الدین یحییٰ (ولادت ۶۶۲ھ) شیخ برھان الدین غریب (وفات ۷۳۸ھ) حضرت گیسودراز بندہ نواز (وفات ۸۲۵ھ) حضرت قطب عالم (ولادت ۷۹۰ھ) اور ان کے فرزند شاہ عالم۔ سید محمد جونپوری (ولادت ۸۴۷ھ) وغیرہ بزرگوں کے اقوال قدیم اردو زبان میں پائے جاتے ہیں ۔

ان میں سے ان چند ایسے ملفوظات کا ذکر کرتا ہوں جو میرے کتب خانے میں ہیں :

جمعات شاہیہ:۔اس میں حضرت شاہ عالم کے اقوال بہ کثرت پائے جاتے ہیں ۔زیادہ تر نظم میں اور ان کے والد شاہ قطب عالم کے بھی اقوال درج ہیں ۔شیخ عبدالقدوس گنگوہی (ولادت ۸۶۰ھ) کی ایک تصنیف رشد نامہ اتفاق سے مجھے مل گئی ۔اس میں ان کے بعض اقوال نظم میں ہیں ۔یہ اس وقت کی زباں ہے جب کہ اردو جنم لے رہی تھی۔ایک شعر ریختے کے نام سے بھی درج ہے ۔ایک کتاب مقصود المراد ہے جس میں حضور سید شاہ ہاشم کے بہت سے اقوال قدیم اردو زبان میں ہیں ۔ان کے علاوہ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری (وفات ۹۷۰ھ) کے بھی بعض اقوال درج ہیں ۔مثلاً سید ہاشم کا ایک قول نظم میں ہے:

دنیا کے لوگ کیڑے مکوڑے
کھیو شہد پہ دوڑاتے گھوڑے
ڈوبتے بہت نکلتے تھوڑے

شیخ وجیہہ الدین علوی بہت بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ ہوئے ہیں ۔(وفات ۹۱۰ھ) ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے ہیں جس کا نام ''بحرالحقائق'' ہے ۔اس میں جگہ جگہ ان کے اقوال پائے جاتے ہیں جو ابتدائی اردو میں ہیں ۔مثلا اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہووے' کام اس کا ہے ۔

یہ ملفوظات بڑے کام کی چیز ہیں ۔ان سے ان لوگوں کی سیرت و حالات تو معلوم ہوتے ہی ہیں لیکن ہمارے لئے سب سے اہم ان کے وہ اقوال ہیں جن سے ابتدائی اردو کی حقیقت معلوم ہوتی ہے ۔

اب میں ان بزرگوں کی ان مستقل تصانیف کا ذکر کرتا ہوں جو میرے کتاب خانے میں ہیں اور جو اردو کی ابتدا اور اس کے ارتقاء کی نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔

سب سے قدیم نظم جو مجھے ملی ہے اور اس سے پہلے کی اب تک کوئی دریافت نہیں ہوئی ۔وہ حضرت سید راجو قتال کی نظم ''سہاگن نامہ'' ہے ۔اس میں سہاگن کو کچھ نصیحتیں کیں ہیں ۔سید راجو قتال حضرت شاہ قطب عالم کے چچا اور حضرت مخدوم جہانیاں کے مرید اور خلیفہ تھے ۔یہ ۸۰۷ھ میں زندہ تھے اور سب سے پہلی نثر کی کتاب حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی ''معراج العاشقین'' ہے ۔جو میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ حضرت بندہ نواز ۸۰۱ھ میں دہلی سے دکن کی طرف آئے ۔اسی سلسلے کے ایک بزرگ میراں جی شمس العاشق ہیں ۔ان کے خاندان نے دکنی اردو کی بڑی خدمت کی ہے ۔یہ بیجا پور میں مقیم ہوئے ۔ان کا مزار بیجا پور کے باہر شاہ پور میں ہے ۔ان کا انتقال ۹۰۲ھ میں ہوا۔ ان کے فرزند شاہ برھان الدین جانم(۹۹۰ھ وفات) اور ان کے پوتے شاہ امین الدین اعلی (وفات ۱۰۸۶ھ)سب کے سب اس زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے اور ایک بزرگ نے مجھے ان کی کلام کا بہت ضخیم مجموعہ جو بہت خوشخط نسخے میں لکھا ہوا ہے' عنایت کیا ۔اس میں زیادہ تر مثنویاں مضامینِ معرفت پر ہیں اور دو تین رسالے نثر میں بھی ہیں ۔علاوہ مثنویوں کے دُھرے' خیال اور غزلیں وغیرہ بھی ہیں ۔یہ بڑا عجیب اور نادر مجموعہ ہے ۔اس میں علاوہ متفرق چھوٹی چھوٹی نظموں کے پندرہ سولہ مستقل رسالے

ہیں۔سید میراں حسینی شاہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔یہ کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔لیکن ان کی سب سے ضخیم کتاب ''شرح تمہید ہمدانی'' ہے یہ ''تمہیدات عین القضاء'' کا ترجمہ ہیں۔یہ ترجمہ قدیم نثر میں خاص درجہ رکھتا ہے۔سید میراں حسینی شاہ کا انتقال ۱۰۷۴ھ میں ہوا۔قاضی محمود دریائی بیر پوری گجرات کے بڑے اولیاء اللہ میں ہیں۔ان کا کلام اچھا خاصا ضخیم ہے اور گجراتی اردو میں ہے۔۹۴۱ھ میں انتقال کیا۔ان کی زبان میں اکثر گجراتی لفظ آتے ہیں۔

شاہ علی محمد گام دھنی بھی گجرات کے بزرگ ہیں۔ان کے کلام کے مجموعہ کا نام جواہر اسرار اللہ ہے۔ان کی زبان بھی گجراتی اردو ہے لیکن قاضی محمود دریائی سے کسی قدر سہل ہے۔میاں خوب محمد چشتی کا تعلق بھی گجرات سے ہے۔یہ سن ۹۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۲۲ھ میں انتقال کر گئے۔ان کا ایک رسالہ بھاؤ بھید مناقع و بدائع کلام میں ہے لیکن ان کی مشہور اور مقبول مثنوی ''خوب ترنگ'' ہے جو سن ۹۸۶ھ کی تصنیف ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں۔اس کی زبان زیادہ سہل اور صاف ہے۔بابا شاہ حسینی ایک بزرگ شاہ علی جیو کے مرید ہیں ان کا پورا دیوان ہے۔کلام صوفیانہ ہے اور زبان میں سلاست اور صفائی ہے۔

میں نے قدیم اردو کے خاص خاص صوفیا کا ذکر کیا ہے۔ورنہ گیارہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانے کی سینکڑوں کتابیں ہیں جن کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔میرے کتب خانے میں قدیم گجراتی اور دکنی اردو میں قرآن پاک کی سورتوں کے ترجمے اور تفسیریں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ان پر میں ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں۔

اب میں قدیم اردو کے غیر صوفی شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کرتا ہوں۔پہلا شاعر جس کا پتہ اب تک لگا ہے وہ نظامی ہے جو احمد شاہ بہمنی کے عہد میں تھا۔(احمد شاہ سن ۸۲۵ھ میں تخت نشیں ہوا) اس نے ایک مثنوی کدم راؤ اور پدم راؤ کے قصے میں لکھی ہے۔میرا نسخہ آخر سے ناقص ہے۔اس لئے سنہ تصنیف نہ معلوم ہو سکا اور افسوس کہ اس کا

دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔لیکن قدیم دکنی اردو کا اصل اور جامع شاعر سلطان محمد علی قطب شاہ ہوا ہے۔جو ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔اس نے ہر صنف سخن میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

میرے پاس ایک قدیم مثنوی نو سر بار نام کی ہے جس میں واقعہ کربلا کا بیان ہے۔یہ ایک شاعر اشرف کی تصنیف ہے۔سنہ تصنیف ۹۰۹ھ ہے۔

اب صرف چند خاص کتابوں کا ذکر کروں گا۔عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں رزمیہ کلام نہیں لیکن قدیم اردو کی کئی رزمیہ مثنویاں میرے کتب خانے میں ہیں۔ایک مرزا مقیم کی فتح نامہ بکھیری جس میں سلطان محمد عادل کی ایک لڑائی کا بیان ہے۔سنہ تصنیف ۱۰۳۷ھ۔دوسری فتح نامہ نظام شاہ حسن شوقی کی تصنیف جس میں وجیا نگر اور شاہان دکن کی لڑائی کا مذکور ہے۔تیسری علی نامہ جو دکن کے عالی پایہ شاعر نصرتی کی تصنیف ہے ۱۰۷۶ھ اس میں بیجا پور کے سلطان علی عادل شاہ اور مغلوں کی جنگ کا حال نہایت تفصیل اور خوبی سے بیان کیا ہے۔یہ مثنوی بھی نایاب ہے۔چوتھی تاریخ سکندری۔یہ نصرتی کی تصنیف ہے (۱۰۸۳ھ) اس میں عادل شاہ خاندان کے آخری بادشاہ سکندر اور سیوا جی کی لڑائی کا بیان ہے۔یہ مثنوی سوائے میرے کتب خانے کے کہیں اور نہیں ہے۔میرے ہاں نصرتی کی ایک عشقیہ مثنوی ''گلشن عشق'' بھی ہے۔

قدیم اردو میں یوسف زلیخا کا قصہ کئی دکنی شاعروں نے لکھا ہے۔ان میں چار مثنویاں زیادہ پرانی ہیں جو میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ایک شیخ احمد شریف کی محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے۔دوسری محمد ابن احمد تخلص عاجز کی جو ۱۰۴۴ھ کی تصنیف ہے۔تیسری دکن کے مشہور شاعر ہاشمی کی جو ۱۰۹۹ھ کی تصنیف ہے۔ہاشمی بہت خوش گو شاعر تھا۔ریختی کا سب سے پہلا شاعر یہی ہے۔چوتھی امین گجراتی کی جو ۱۱۰۹ھ کی تصنیف ہے۔سید محمد گجراتی کی یوسف زلیخا بہت بعد کی ہے۔

وجہی بھی اس زمانے کا قابل ذکر شاعر و نثار ہے۔اس کی مثنوی قطب مشتری۔تصنیف ۱۰۱۸ھ کا صرف ایک نسخہ میرے پاس تھا جو ناقص تھا۔برٹش میوزیم کے

نسخے کی نقل حاصل کر کے میں نے یہ مثنوی شائع کر دی ہے ۔اس کی دوسری تصنیف سب رس ہے جو قدیم اردو نثر کی بہترین کتاب ہے جو میں شائع کر چکا ہوں ۔اسی عہد کے دوسرے مشہور شاعر ریاضی مصنف نجات نامہ۔ علی رحمتی مصنف نصیحت نامہ احکام الصلوۃ (۱۰۷۷) ابلیس نامہ ۔صنعتی مصنف قصہ تمیم انصاری (۱۰۷۵ھ) فواقی مصنف سیف الملوک و بدیع الجمال ۱۰۴۹ھ ابن نشاطی مصنف پھول بن (۱۰۶۶ھ) وغیرہ ہیں ۔یہ سب مثنویاں میرے کتب خانے میں موجود ہیں ۔اس کے علاوہ اس عہد کے اور اس عہد کے بعد کے بہت سے شعراء کا کلام میرے پاس موجود ہے۔اس کا بیان' بخوفِ طوالت ترک کرتا ہوں ۔

البتہ دو ایک کتابوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ۔میرے کتاب خانے میں ایک نسخہ سلطان علی عادل شاہ کے دیوان کا بھی ہے جو نایاب ہے ۔اس کے علاوہ بیسیوں قدیم شعراء کے مرثیے بھی ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گے۔

ایک عجیب ونایاب کتاب بھی ہے ۔یہ خالق باری کے طرز پر ہے ۔اس کا مصنف اجے چند پسرونی چند ساکن سکندر آباد ہے ۔جس کا پتہ وہ یوں دیتا ہے: مستقل دارالملک۔مقام حضرت دھلی نادرنام۔مختلف عنوان مثلاً فیل خانہ' شکار خانہ' طبیب خانہ وغیرہ کے تحت فارسی اسماء وغیرہ کے ھندی مترادف دیئے ہیں ۔اس کا سنہ تصنیف ۹۶۰ھ ہے اور'' خالق باری'' سے پہلے کی ہے۔

اس زمانے میں معروف خالق باری کے متعلق بہت بحث رہی ۔پروفیسر محمود شیرانی نے اندرونی شبہات سے یہ ثابت کیا کہ یہ امیر خسرو کے عہد کی کتاب نہیں ہوسکتی لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا مصنف کون ہے اور کس عہد کی تصنیف ہے ۔میرے کتاب خانے میں خالق باری کا ایک پرانا نسخہ تھا ۔اس نے اس بحث کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اس سے یہ تحقیق ہوا کہ اس کے مصنف ایک دوسرے خسرو تھے ۔جد کا لقب ضیا الدین تھااور عہد جہانگیری کے شخص تھے ۔کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۳۱ھ ہے۔

آخر میں ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہتاہوں جو ریاست میسور کے ایک گاؤں

سے دستیاب ہوئی ۔ یہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی مشہور تصنیف نورس کا عجیب وغریب نسخہ تھا۔ شاہی کتب خانے کے لئے اس وقت کے بہترین کاتب نے لکھا تھا اور ہر عنوان پر نہایت نفیس سنہری اور رنگین کام کیا ہوا تھا ۔افسوس کہ چوری ہو گیا ۔ کسی نیک نفس کتاب چور نے اپنے مطلب کا یہ اچھا مسئلہ گھڑا ہے کہ کتاب کی چوری چوری نہیں ۔ایک دوسرے نیک دل بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو کتاب مانگے دے وہ احمق ہے اور جو لے کر واپس دے وہ اس سے زیادہ احمق ہے۔ جہاں شریعت اخلاق کے ایسے اصول اور مقولے مسلم ومقبول ہوں تو وہاں کتابوں کا خدا حافظ۔

[دہلی سے براڈ کاسٹ]

---❖---

''موازنۂ انیس و دبیر'' پر ایک نادر تحریر

اگلے صفحات میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (ولادت: ہاپوڑ، میرٹھ، ۲۰۔ اگست ۱۸۷۰ء، وفات: کراچی، ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء) کی ایک نادر قلمی تحریر مع عکس ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

بابائے اُردو کی یہ قلمی تحریر، مولانا شبلی کے قیام حیدر آباد دکن (۱۹۰۶ء) کے معروف علمی کارنامے ''موازنۂ انیس و دبیر'' پر مولوی عبدالحق کا ایک ریڈیائی تبصرہ ہے۔

بابائے اُردو کی اصل قلمی تحریر اُن کے متعدد دیگر آثار کے منجملہ، میرے ذاتی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔

(ڈاکٹر سیّد معین الرحمن)

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی علمی ادبی اصلاح
کی ابتدا اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو انگریزی زبان، مغربی
خیالات و تمدن سے ناآشنا تھے۔ سرسید احمد خاں اس کے سالار
اور محرک تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے نقاد تھے۔ انھوں نے
تعلیم، نظامِ تعلیم، معاشرت، اخلاق، مذہب، سیاست، ادب
غرض ہماری زندگی کے ہر شعبے پر آزادانہ اور بےباکانہ تنقیدیں
کیں۔ یہ انھیں کا فیض تھا کہ ہماری زبان میں حالی، نذیر احمد
آزاد، شبلی جیسے زبردست ادیب اور نقاد پیدا ہوئے۔
حالی کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔ وہ جدید شاعری، جدید
تنقید، سوانح نویسی بلکہ جدید ادب کے بانی ہیں اور دوسرے نقادوں
حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا مقدمہ
شعر و شاعری ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت
رکھتا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف اور مقالات میں بھی تنقید
کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں اس کا
چرچا شروع ہوگیا۔
اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ ان کی تنقیدی تالیفات
میں شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر خاص اہمیت رکھتی
ہیں۔ موازنے میں انھوں نے ابتدائے مرثیہ گوئی کی تاریخ بھی لکھی ہے
عربی فارسی مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد وہ ہندستان میں مرثیہ گوئی
کی ابتدا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے کئی جگہ تاریخی
غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں "ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات
میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اس کے کلام میں مرثیہ کا
پتا نہیں لگتا"۔ یہ غلط ہے۔ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔
جو مثنوی اس سے منسوب کی گئی ہے وہ ولی گجراتی کی نہیں بلکہ ولی ویلوری کی

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی، علمی، ادبی اصلاح کی ابتدا، اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو انگریزی زبان، مغربی خیالات و تمدن سے نا آشنا تھے۔ سرسید احمد خاں ان کے سالار اور محرک تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے نقاد تھے۔ انہوں نے تعلیم، نظام تعلیم، معاشرت، اخلاق، مذہب، سیاست، ادب، غرض ہماری زندگی کے ہر شعبے پر آزادانہ اور بے باکانہ تنقیدیں کیں۔ یہ اُنھیں کا فیض تھا کہ ہماری زبان میں حالی، نذیر احمد، آزاد، شبلی جیسے زبردست ادیب اور نقاد پیدا ہوئے۔ حالی کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔ وہ جدید شاعری، جدید تنقید، سوانح نویسی بلکہ جدید ادب کے بانی ہیں اور دوسرے مقلد۔ حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کا مقدمہ شعر و شاعری ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی دوسری تصانیف اور مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں (تنقید کا) خاصا پرچار شروع ہو گیا۔

اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ اُن کی تنقیدی تالیفات میں شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر خاص اہمیت رکھتے ہیں، موازنے میں انہوں نے ابتدا مرثیہ گوئی کی تاریخ سے کی ہے۔ عربی فارسی مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد وہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

"ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اس کے کلام میں مرثیے کا پتا نہیں لگتا"[1]

یہ غلط ہے۔ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ جو مثنوی اُس سے منسوب کی گئی ہے وہ ولی گجراتی کی نہیں بلکہ میر ولی فیاض ویلوری کی ہے۔ اس کا نام دہ مجلس یا روضۃ الشہدا ہے اور ولی گجراتی کی وفات کے بہت بعد لکھی گئی[2] اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

"میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن انہوں نے بھی کہا ہے۔ اُن کے ایک مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا ہے[۲]"

یہ دونوں باتیں غلط ہیں ۔ بے شک میر تقی کے مطبوعہ کلیات میں مرثیے نہیں، لیکن انہوں نے مرثیے کہے ہیں جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہو چکے ہیں[۳]۔ یہ بھی غلط ہے کہ میر صاحب کے ایک مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا۔ جس مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا ہے، وہ میر تقی میر کا نہیں بلکہ یہ ایک شخص میر محمد المتخلص بہ تقی کا ہے۔ یہ غلطی اکثر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں سے سرزد ہوئی ہے۔ نام میں تقی کے مشترک جُز سے، اُسے میر تقی میر سمجھ لیا گیا، حالانکہ سودا کے قلمی نسخوں میں صاف طور سے تقی استعمال ہوا ہے: تقی اس حکایت کو کوئی کیا کہے گا

مولانا لکھتے ہیں:

"معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیے کا رواج ہو چکا تھا[۵]"

سودا اور میر سے پہلے کیا، مرثیے کا رواج ولی سے بھی دو اڑھائی صدی پہلے ہو چکا تھا سلطان قلی قطب شاہ نے بھی جس کا سنہ جلوس ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) ہے کئی نوحے لکھے ہیں اُس کے بعد کے زمانے میں بیسوں بلکہ سینکڑوں مرثیہ گو شاعر ہوئے، مثلاً: میرزا، شاہی، قطبی، رضوان، احسان، غواصی، اشرف، عاجز، اعتقادی، غلامی نظامی، عشقی، ہاشمی، مظہر، داس، رمزی، مشتاق وغیرہ وغیرہ[۶]

یہ قدیم مرثیے بہت سادہ مگر پُر درد ہوتے تھے۔ اُن کا مقصد شہادتِ کربلا کا حال سُنا کر رونا رُلانا تھا — اور نہ اس قدر طویل ہوتے تھے کہ میر و مرزا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے مرثیے۔ ابتدائی مرثیوں میں غم و الم کے لیے شہادت کے واقعات اور مشہور

مروجہ روایات بیان کی جاتی تھیں۔ میر ضمیر اور ان کے بعد مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں نئے نئے اضافے اور جدتیں کی گئیں، مثلاً رزمیہ بیان، سراپا، گھوڑے، تلوار، تیرے وغیرہ اسلحے کی کارستانیاں اور منظر نگاری وغیرہ مرثیے کے خاص اجزاء ہو گئے ہیں۔ آخر آخر میں ساقی نامے جیسی چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ ان مرثیوں میں مرثیت کا رنگ ہلکا پڑ گیا اور شاعری کا پلہ بھاری ہو گیا۔ مرثیہ خوانی کی مجلسوں کی کیفیت قریب قریب مشاعروں کی سی ہو گئی ہے۔ مرثیہ گو اپنا مرثیہ زیادہ تر اپنے کلام کی داد کے لیے پڑھتا ہے اور اس لیے شعر و شاعری کے سارے کمالات صرف کر دیتا ہے۔

مولانا کا یہ فرمانا کہ اردو میں رزمیہ شاعری نہ تھی، میر ضمیر نے اس کی ابتدا کی، اور میر انیس نے کمال کے درجے تک پہنچایا، صحیح نہیں۔ میر انیس کے مرثیوں کو رزمیہ شاعری کہنا درست نہیں کیونکہ ان میں کہیں کہیں ضمنی طور پر لڑائی کے بعض پہلوؤں کا ذکر آجاتا ہے۔ قدیم اردو میں صحیح رزمیہ شاعری موجود ہے مثلاً نصرتی کا علی نامہ (۱۰۶۸ھ) حسن شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ، مرزا مقیم کا فتح نامہ بکھیری (عہد سلطان محمد عادل شاہ)، نصرتی کی تاریخ سکندری یا فتح نامہ بہلول خاں بالشکر سیوا جی (۱۰۸۳ھ، ۱۶۷۲ء) وغیرہ متعدد رزمیہ مثنویاں ہیں خصوصاً نصرتی کا علی نامہ ایسی بے مثل رزمیہ مثنوی ہے کہ جس کا جواب اردو میں اب تک نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جدید مرثیوں میں شاعری پر زیادہ زور ہے، اس لیے مولانا شبلی نے بھی مرثیوں کو اسی معیار پر جانچا ہے۔ مثلاً فصاحت و بلاغت کی خوبیاں، کلام کی ترتیب، محاورے اور روزمرہ کے استعمال، استعارات و تشبیہات، صنائع بدائع اور ان کی قسمیں مثلاً ایہام، مبالغہ، حسن التعلیل، صنعت طباق، مراعات النظیر، لف و نشر، تفصیل، مہملہ وغیرہ کی تعریفوں کی توضیح کرنے کے بعد

ہر ایک کی متعدد مثالیں میر انیس کے کلام سے پیش کی ہیں۔ مولانا خود بہت اچھے شاعر ہیں اور اعلیٰ درجے کے صاحب ذوق ہیں۔ لطفِ سخن پر جان دیتے ہیں۔ موازنے نیز شعر العجم وغیرہ میں وہ تحقیق و تنقید کو چھوڑ کر شعر کے لطف کی طرف ڈھل جاتے ہیں اور شعر کا مطلب، اس کی خوبیاں اور نکات بڑے پُر لطف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تمام توضیح و تشریح اور انتخاب، معانی و بیان کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت قابلِ قدر اور مطالعے کے لائق ہے اس سے ہماری شاعری کے محاسن و عیوب میں بصیرت حاصل ہوتی ہے اور شعر کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔

یہ کلام کا ظاہر ہے۔ باطن یعنی موضوعِ کلام پر کم توجہ کی ہے۔ انہوں نے اس امر پر کافی بحث نہیں کی کہ جو روایات اور واقعات، مرثیوں کے موضوع ہیں، تاریخی اعتبار سے اُن کی کیا حقیقت ہے اور اس سے مرثیے کی حیثیت پر باعتبارِ صنعتِ شعر اور تعلقِ تاریخ، کیا اثر پڑتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

> "بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسباب (اسالیب) آجاتے ہیں[۱۱]"

بلاغت کی اس تعریف کو میر انیس پر مطابق کر کے فرماتے ہیں کہ:

> "میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغتِ الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے، لیکن یہ اُن کے کمال کا اصل معیار نہیں، اُن کے کلام کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے[۱۲]"

اس پر پروفیسر کلیم الدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ:

"اگر بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو

تو صرف میر انیس ہی کا کلام نہیں بلکہ سارے مرثیے بلاغت
سے معرّا ثابت ہوں گے۔ مرثیوں میں اشخاص عربی ہیں،
مقام کربلا ہے، لیکن اس اقتضائے حال کا خیال کسی مرثیہ گو
کے دل میں نہیں گزرتا۔ مرثیہ گو لکھنؤ کی شادی غمی کے رسوم
عرب پہ منطبق کرتے ہیں اور وہ جوہی اور بیلے کے پھول
عراق کے جنگلوں میں بچھا دیتے ہیں۔۔۔ وہ حضرت امام اور
اُن کے اہلِ حرم کے اصل کیریکٹر پہ بھی پردہ ڈال دیتے ہیں۔
۔۔۔۔ واقعہ کربلا کے تصور اور اس کی جزئیات دونوں مقتضائے
حال کے ناموافق ہیں[۱۴]"۔

اس کتاب میں (مولانا نے) میر انیس کے محاسن بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق میں میر صاحب اور مرزا صاحب کا موازنہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فصاحت اور حسنِ بیان میں میر انیس کا درجہ بڑھا ہوا ہے لیکن مولانا شبلی کا یہ کہنا کہ :

" فصاحت اُن کے (مرزا دبیر کے) کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔۔۔ بلاغت نام کو نہیں[۱۵]"۔

"ناانصافی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں :

"تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اُتر جاتا ہے، نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے[۱۶]"۔

یہ تضاد عجیب ہے۔

میر انیس کے کلام میں کہیں صنعت مراعات النظیر، ایہام اور دوسرے صنائع نیز لفظی رعایات کی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مبالغے کا بھی زور ہے اور بعض

مقامات پر تو مبالغہ غلو اور اغراق تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ مرزا صاحب کو نہیں پہنچتے اور بقول مولانا شبلی کے :

"مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے اور وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریفوں کا طائرِ وہم پرواز نہیں کر سکتا"[۱۱۴]

اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں بڑی دھوم دھام اور شکوہ اور شوکت ہے۔ اُن کی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی اور شدتِ مبالغہ صنائع و بدائع کی کثرت کا جواب نہیں لیکن یہ جدتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو فصاحت و بلاغت ہی سے نہیں گر جاتیں بلکہ بدنما، پست اور مبتذل ہو جاتی ہیں اور یہ عیب، مرزا صاحب کے ہاں اکثر پایا جاتا ہے۔

میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، مولانا نے موازنہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے مداحوں کی طرف سے جو جوابات دیے گئے ہیں اُن پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس میں مولانا نے بڑی آزادی اور انصاف سے کام لیا ہے۔ یہ سب اعتراضات لفظی ہیں۔ یہ اعتراضات قافیوں کی غلطی، نون کے اعلان کے جائز ناجائز ہونے، حروف کا تقطیع سے گر جانے سے متعلق ہیں اور صحیح ہیں لیکن مرثیے کے موضوع یا مضمون پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

نساخ نے بعض الفاظ کی صحت کے متعلق بھی اعتراض کیا ہے اور مولانا نے اُنھیں تسلیم کر لیا ہے، لیکن ہمیں ان میں سے بعض غلطیوں کے ماننے میں تامل ہے[۱۱۵]۔ مثلاً :

بُت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

اعتراض ہے صفا کی جگہ صاف ہونا چاہیے[۱۱۶]۔ صفا صاف کرنے کے معنی میں اس وقت

تو استعمال ہوتا ہی تھا؟ اب بھی عام طور پر خصوصاً عورتوں کی بول چال میں مروّج ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے :

کرتا ہے صفا روز جلوہ خانے کو نورا
آئینہ میں شفاف نہ رہے کیوں نہ گھر اپنا

○

"برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی"

اعتراض یہ ہے کہ پروانگی غلط ہے[۲۰]۔ پروانگی ان ہی معنی میں اب بھی مستعمل ہے اور غلط نہیں۔ امانت لکھتے ہیں :

پرندے کو نہیں پروانگی محفل میں آنے کی

○

ایک مصرعہ ہے :

"ایسا بھی کوئی بےکس و بے آس نہ ہوگا"

اعتراض ہے کہ یہ واو عطف فارسی اور اُردو کے لفظ کے درمیان غلط ہے[۲۱]۔ بے شک آج کل غلط ہے، لیکن اُس زمانے میں اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کے زمانے تک مروّج رہا اور خود انھوں نے بھی اس کا استعمال جائز رکھا۔

○

"اس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہوگئیں شیریں"

خوشی، بجائے خوش غلط ہے[۲۲]، لیکن میر صاحب کے زمانے میں یہ استعمال جائز تھا۔ آتش کا مصرع :

خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بیگمات کی زبان پر اب تک ہے۔

بعض معنوی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن وہ بھی کلام کے ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً دو مصرعوں کا بے ربط ہونا[۲۲] لفظی رعایت کی وجہ سے کلام کا اچھا اور بے اثر ہونا[۲۳] وغیرہ۔ کلام کے باطن پر شاذ ہی کوئی اعتراض کیا گیا ہے۔

مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد تنقید پر مولانا شبلی کی یہ کتاب ہے، جو ہماری مشرقی شاعری کے نقطۂ نظر سے اس کے محاسن و عیوب کے سمجھنے میں بہت مدد دے گی۔ اس لیے اس کا مطالعہ خاص ہمارے جدید ادیبوں کے لیے ضرور بصیرت افروز ہوگا۔

توضیحات :

۱۔ دیکھیے: موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

۲۔ پُرگو شاعر میر ولی فیاض ویلوری (علاقہ آرکاٹ، مدراس) ۱۷۵۱ء تک بقیدِ حیات تھے۔ اُن کی مثنوی روضۃ الشہدا جو دہ مجلس بھی کہلاتی ہے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں لکھی گئی یہ مُلا حسین واعظ کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۱ء چھٹی جلد، ص ۵۶۱)۔ بابائے اُردو، ولی گجراتی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء مانتے ہیں (رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۴ء ص ۱۹۷-۱۹۷) اسی لیے انہوں نے لکھا ہے کہ دہ مجلس، "ولی گجراتی کی وفات کے بہت بعد لکھی گئی۔" لیکن ولی کا سالِ وفات تحقیق مزید کے بعد اب ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء کے بعد اور ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء سے پہلے متعین ہوا ہے۔ دیکھیے: ولی کا سالِ وفات از ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ جشن نامہ اورینٹل کالج لاہور، دسمبر ۱۹۷۲ء، ص ۹۰

۳ موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ایضاً، ص۱۸

۴ دیکھیے: میر تقی میر کے سلام اور مرثیے، رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۱ء، ص۱۰۴

۵ موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ص۱۸

۶ تفصیل کے لیے دیکھیے: دکن میں اُردو، نصیر الدّین ہاشمی

اُردو شہ پارے، جلد اوّل ۱۹۲۹ء ڈاکٹر محی الدین قادری

۷ موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ص۲۱۳

۸ ملک الشعرائے بیجاپور نصرتی (وفات: ۱۶۷۵ء) کی مشہور رزمیہ مثنوی "علی نامہ" (اشعار: ۹۵۱۹) ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء کی تصنیف نہیں، اس کا سالِ تالیف ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء ہے۔ اس مثنوی میں اُن مہمات کا ذکر ہے جو علی عادل شاہ ثانی (۱۶۶۵ء - ۱۶۷۲ء) کو سیوا جی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے اور مغلوں کی فوجی مدافعت میں پیش آئی تھیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کے کتاب خانے میں "علی نامہ" کے پانچ مخطوطے محفوظ ہیں۔ دیکھیے: مخطوطاتِ انجمن ترقیٔ اُردو (اُردو) جلد اوّل، ۱۹۶۵ء، ص۲۷۱

۹ حسن شوقی (ولادت ۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء) کا "فتح نامہ نظام شاہ" (اشعار: ۶۲۰) دکن کی جنگ تالیکوٹ ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء کی فتح پر مرتب ہوا۔
(ڈاکٹر جمیل جالبی، مقدمہ دیوان حسن شوقی، ۱۹۷۱ء، ص۱۴)

۱۰ فتح نامہ بکھیری (ابیات: ۲۲۴) اس مقیمی کی مثنوی ہے جس نے ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء اور ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے مابین "چندر بدن و مہیار" ایسی مشہور مثنوی لکھی۔ فتح نامہ بکھیری سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء - ۱۶۵۵ء) کے زمانے کی ایک جنگ کے بیان میں ہے جو ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۷ء میں واقع ہوئی۔
(مخطوطات انجمن ترقی اُردو، ایضاً، ص۲۴۸)

۱۱؎ تاریخ سکندری (اشعار: ۵۵۴) میں نصرتی نے علی عادل شاہ ثانی کے جانشین سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی کے سال (۱۶۷۲ء) پیش آمدہ واقعات نظم کیے ہیں۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: نصرتی، بابائے اُردو ۱۹۴۴ء

۱۲؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۴۷

۱۳؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۴۸

۱۴؎ اُردو تنقید پر ایک نظر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء۔ ص۱۱۹

۱۵؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۵۶۔ ایک دوسری جگہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مرزا (دبیر) صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں، لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔"
(موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۸۰)

۱۶؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۷۴

۱۷؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۷۳

۱۸؎ الفاظ کی صحت کے متعلق جن اعتراضات کو بابائے اُردو نے تسلیم نہیں کیا، وہ خود مولانا شبلی کے عاید کردہ ہیں، نسّاخ کے نہیں۔ شبلی کے الفاظ یہ ہیں:

"نسّاخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیے ان کی تفصیل ذیل میں ہے۔" (موازنہ، ص۲۴۸)

"تفصیل" کے تحت مولانا شبلی نے میر انیس کے بارہ اشعار پر اعتراضات کیے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر انیس کے کلام میں "اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں۔" (موازنہ، ص۲۴۹)، انہی بارہ "غلطیوں" میں چار کے ماننے میں بابائے اُردو کو تامل ہے۔

۱۹؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۴۸

۲۰؎ موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص۲۴۸

۲۱ؐ موازنۂ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

۲۲ؐ موازنۂ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۹

۲۳ؐ موازنۂ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۹

۲۴ؐ موازنۂ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۵۰

اُردو زبان و ادب کے سات سو سال

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (۱۲۶۵ء)
تا
شیخ عبدالحق بابائے اُردوؒ (۱۹۶۱ء)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء) کی پہلی برسی کے موقع پر پاکستان رائٹرز گلڈ کے ترجمان ماہنامہ "ہم قلم" (کراچی) کے شمارہ اگست ۱۹۶۲ء (جلد ۲، نمبر ۱۲، صفحہ ۸۲ - ۱۱۱) میں مرزا جمیل الدین عالی نے "اُردو زبان اور ادب" کے عنوان سے بابائے اُردو کا ایک غیر مطبوعہ اور طویل مضمون شائع کیا تھا جس میں عالی صاحب کے بقول "نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بابائے اُردو نے اُردو زبان اور ادب کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے"۔

بابائے اُردو کے انتقال کے چالیس سال بعد ان کا یہ نادر اور قیمتی مضمون نئی ترتیب کے ساتھ اگلے صفحات میں محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا اُردو زبان کی تاریخ اور جنوبی ہند میں اس کے ارتقا سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا حصہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آغاز سے عہد موجودہ میں ابن انشا تک اردو شاعری کے نت نئے تجربات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس جائزے کا تیسرا اور آخری حصہ اُردو نثر، نثری اصناف کی تدریجی ترقی اور اُردو کے بعض علمی اداروں کی رُوداد کو محیط ہے۔

[ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]
۲۰۰۱ء

(۱)

مسلمانوں کی آمد نے برعظیم پاک وبھارت کو بے شمار برکات اور فوائد پہنچائے جن سے اہلِ ملک کی زندگی اور خیالات میں نیا انقلاب پیدا ہو گیا۔ لیکن ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ وہ عام اور مقبول زبان ہے ۔ اس برعظیم کو جس میں بیسیوں زبانیں اور سیکڑوں بولیاں مروّج ہیں۔ گزشتہ ہزارہا سال سے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

مسلمانوں کی پہلی آمد سندھ میں ہوئی جبکہ محمد بن قاسم نے پہلی صدی کے اواخر ۹۳ھ، ۷۱۱ء میں اس علاقے کو فتح کیا۔ مسلمانوں کا تسلط اس علاقے میں مدت دراز تک رہا۔ سندھ پر اسلام اور اسلامی تہذیب کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے اور سندھی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ غیر نہیں معلوم ہوتے۔

دوسری صدی ہجری میں ہندوستان کی ایک دوسری سمت یعنی جنوب میں عرب مسلمان تاجر کی حیثیت سے پہنچے اور ملیبار کی تجارت کلیتاً ان کے ہاتھ میں آگئی۔ کالی کٹ ان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں مسلمان بلاشرکتِ غیرے زمانۂ دراز تک بحری تجارت کے مالک رہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار ماپلا قوم اب بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔ عرب تاجروں نے نومسلموں کو عربی سکھائی اور

خود ملیالم سیکھی جسے وہ عربی خط میں لکھتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملیالم زبان میں کثرت سے عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند سے مسلمانوں کا یہ تعلق بڑی حد تک تجارتی تھا۔

سندھ کے بعد کوئی تین سو برس گزرنے پر شمالی ہند میں مسلمانوں کا دوسرا سیاسی تعلق سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے ہوا۔

اس دور کو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ گو سلطان محمود کے حملوں کے بعد محمود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب کی حیثیت ایک صوبے کی سی رہی تاہم اس ملک والوں سے فاتحوں کے تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے، چنانچہ ہندوؤں کی ایک خاص فوج غزنی میں متعین تھی۔ ہندی فوج کا کمانڈر سوبند رائے تھا۔ اور جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو محمود نے اس ممتاز عہدے پر تلک کا تقرر کیا۔

پنجاب میں غزنی حکومت تخمیناً پونے دو سو برس تک رہی۔ اس عرصہ میں ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلقات خاصے وسیع ہو گئے۔ اکثر ہندوؤں نے فارسی پڑھی اور مسلمانوں نے ہندی۔ محمود کے زمانے میں غزنی میں متعدد ترجمان تھے جن میں سے تلک اور بہرام کے نام تاریخوں میں آتے ہیں۔ اس زمانے کے بعض نامور اور مستند شعرا کے کلام میں بھی بعض ہندی الفاظ داخل ہو گئے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کی نسبت محمد عوفی مصنف "لباالالباب" نے لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ ان کا تیسرا دیوان ہندی میں بھی تھا۔ (تذکرہ لباالالباب ج ۲، باب ۱۰) امیر خسروؒ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ (دیباچہ غرۃ الکمال) لیکن ان کے ہندی کلام کا اب تک کہیں پتہ نہیں لگا۔ یہ کون سی ہندی تھی اور کس قسم کی زبان تھی؟ اس کا مطلق علم نہیں۔ محمود کی وفات کے کچھ عرصے بعد غزنوی حکومت کی وہ شان نہ رہی۔ غوریوں سے جو لڑائیاں ہوئیں، انھوں نے حکومت کو کمزور کر دیا۔ آخر ۵۸۲ھ مطابق ۸۷-۱۱۸۶ء میں علاؤالدین کے بھتیجے معزالدین بن سام نے جو محمد غوری کے نام سے مشہور ہے، محمود کے آخری جانشین کو تخت سے اتار دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ محمد غوری نے ہندوستان میں دور دور دھاوے مارے اور فتوحات میں کامیابی حاصل کی مگر محمود اور اس کے جانشینوں کی طرح اس کا دل بھی غزنی میں تھا اور محمود کی طرح اسے بھی ہندوستان میں رہ کر سلطنت قائم کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ سلطان تراین کی فتح کے بعد واپس چلا گیا اور ہندوستان کے تمام معاملات اور معرکے اپنے معتمد جنرل اور نائب قطب الدین ایبک کے حوالے کر دیے۔ محمد غوری

کے انتقال کے بعد ۶۰۳ھ م ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک جو زر خرید غلام تھا، ہندوستان کے مفتوحہ علاقہ کا فرماں روا قرار پایا۔ ہندوستان میں اب پہلی بار ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی جس کا پہلا سلطان قطب الدین تھا جو خاندانِ غلامان کا بانی ہوا۔

اب ہندوستان میں ایک نئی قوم آتی ہے اور یہیں بس جاتی ہے۔ اس کا مذہب اور اس کی تہذیب، اس کی زبان اور رسم و رواج اور عادات و خصائل ان لوگوں سے جدا ہیں جو پہلے سے آباد ہیں۔ اب یہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت کی رعایا ہو جاتے ہیں۔ وہ تعلقات جو عارضی اور ادھورے تھے، اب مستقل اور پختہ ہو گئے۔ کاروباری، ملکی اور معاشرتی ضروریاتِ زندگی نے انھیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور قربت کی بدولت ایک کی تہذیب و زبان کا اثر دوسرے کی تہذیب و زبان پر تیزی سے پڑنے لگا۔

مسلمان جس وقت یہاں آئے تو اس ملک کی جسے ہندوستان کہتے تھے، عجب کیفیت تھی۔ جس طرح ملک مختلف رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر علاقے کی حکومت الگ تھی، اسی طرح ہر علاقے کی زبان بھی جدا تھی۔ یہاں ان بولیوں اور اُن کی اصل کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کی آمد کے وقت رائج تھیں۔

آریاؤں کا اصل وطن کہاں تھا؟ اس کے متعلق مختلف اور متضاد نظریات ہیں اور اب تک قطعی طور پر اس کا فیصلہ نہیں ہوا لیکن یہ قرین یقین ہے کہ جو آریہ ایران میں آ بسے تھے، ان میں کا ایک گروہ مشرق کی جانب کوچ کرتا ہوا وسط ایشیا سے برعظیم پاک و بھارت میں داخل ہوا۔ یہاں آ کر انھیں یہاں کے دیسی باشندوں یعنی دراوڑی قوم سے سابقہ پڑا۔ یہ آریہ غیر متمدن تھے اور ان کی حالت خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ ان کے مقابلے میں دراوڑی زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن تھے۔ آریہ جسمانی لحاظ سے قوی تھے۔ اُنھوں نے دراوڑوں کو ان کے زرخیز علاقوں سے مار بھگایا اور جو باقی بچے انھیں غلام بنا لیا۔ چنانچہ ان "بہادر اور شریف" آریاؤں کی یادگار وہ شودر اور اچھوت ہیں جو اس برعظیم میں اب تک اپنے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جب دو ایسی قومیں آپس میں ملتی ہیں جن میں ایک متمدن اور دوسری غیر متمدن ہو تو جو تہذیب اس ملاپ سے پیدا ہوتی ہے، اس پر غالب اثر متمدن قوم کا ہوتا ہے خواہ وہ قوم مفتوح ہی کیوں نہ

ہو۔ بنابریں دراوڑی تہذیب کا اثر آریاؤں کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا حتیٰ کہ وہ دراوڑوں کے بعض دیوتاؤں کو بھی پوجنے لگے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دو قوموں کی یکجائی سے جن کی بولیاں مختلف تھیں، ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازم تھا۔ متمدن قوم کی بولی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ آریاؤں اور دراوڑوں کے میل جول سے جو بولی وجود میں آئی اس میں لامحالہ دراوڑی الفاظ کی بہتات تھی، کیونکہ متمدن قوم کی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس میں اشیا کے ناموں، خیالات، جذبات کے اظہار کے لیے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ غیر متمدن بولی پر غالب آجاتی ہے۔ دراوڑی بولی کا اثر صرف الفاظ ہی تک محدود نہ رہا، اصوات بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ لسانیات کا یہ گوشہ ابھی تحقیق کی روشنی سے محروم ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسی پراکرت سے وہ زبان نکلی جو سنسکرت کہلاتی ہے نیز یہی بولی ان قدیم پراکرتوں اور بولیوں کی ماں ہے جو اس برعظیم میں بولی جاتی ہیں اور اسی کے اثر سے اس زبان نے جو آریا ایران سے بولتے آئے تھے، ہند آریائی شکل اختیار کی۔

پراکرت کے معنی فطری، غیر مصنوعی کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنسکرت سے مراد شستہ، مصنوعی زبان ہے۔ سنسکرت برہمنوں کے تشدد اور نحویوں کے اصول و ضوابط کے قیود اور جکڑ بند سے بانجھ ہو کر رہ گئی اور عام بول چال کی زبان نہ ہونے پائی۔ برہمنوں اور اہل علم کے طبقے تک محدود رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پراکرتوں کو جو عوام کی بولیاں تھیں خاطر خواہ فروغ ہوا اور ان پراکرتوں سے دوسری بولیاں نکلیں اور پھولی پھلیں۔ ان ہی بولیوں میں سے ماگدھی اور اردھ ماگدھی ہیں جو مہاتما بدھ اور جین مذہب کے بانی مہاویر نے اپنے مذہبی عقائد کی تلقین کے لیے اختیار کیں۔ انھیں بولیوں نے بعد میں کسی قدر تغیر سے پالی اور جینی اردھ ماگدھی کی شکل اختیار کی۔ جب یہ زبانیں بھی سنسکرت کی طرح ٹھیٹ ادبی اور مذہبی بن جانے پر ویسی ہی قواعد اور ضوابط کی پابند ہو گئیں اور بول چال کی زبانیں نہ رہیں تو اس وقت پراکرت کی بول چال کی بولی اپ بھرنشا (بگڑی زبان) نے ان کی جگہ لے لی۔

بارھویں صدی میں متعدد اپ بھرنشائیں تھیں۔ سورسینی (شورسین دیس متھرا) اپ بھرنشا وسطی علاقے کی بولیوں کی ماں ہے۔ ان میں سے ایک اس علاقے میں بولی جاتی تھی جو ستلج کے کنارے سے دہلی تک اور روہیلکھنڈ کی مغربی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور ایک (یعنی برج بھاشا) آگرے اور متھرا کے علاقے میں اور بندیل کھنڈ میں مشرق کی جانب دوسری بولیاں مروج

تھیں مثلاً متھلی، ماگدھی، بھوج پوری وغیرہ۔ اور آگے بنگالی، آسامی، اڑیا۔ مغرب کی جانب راجستھانی اور گجراتی جنوب کی طرف مرہٹی اور تامل مغرب میں پنجابی۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس حصۂ ملک میں یہ سب بول چال کی بولیاں تھیں۔ ان بولیوں کا سنسکرت سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا بجز اس کے کہ ان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ کچھ اصلی صورت میں اور زیادہ تر مسخ شدہ حالت میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

دلی، میرٹھ اور آس پاس کے مقامات میں جو بولی مروج تھی وہ دہنوی تھی جسے امیر خسرو دہلوی کہتے ہیں۔ (مثنوی نہ سپہر) ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ عوام کی بولی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسے اس زمانے میں کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور سلطنت کو استقلال ہوا تو یہی بولی تھی جو وہاں بولی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس پر آس پاس کی بولیوں پنجابی ہریانی وغیرہ کا بھی اثر پڑا۔

مسلمان جو ہندوستان میں آئے ان کی مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ اس کا بول چال سے تعلق تھا نہ روزمرہ کی ضروریات سے۔ ترکی امرا اور شاہی خاندان والوں تک محدود تھی۔ دفتری، کاروباری درباری، تہذیبی اور عام تعلیمی زبان فارسی تھی۔ جب اس کی قلم دہلوی زبان پر لگی تو اس پیوند سے ایک نئی مخلوط بولی وجود میں آئی۔ ابتدا میں یہ ہندی یا ہندوی کہلائی۔ بعد میں دوسری بولیوں سے امتیاز کے لیے اسے ریختہ کا نیا نام دیا گیا۔ اس سے مراد ملی جلی زبان کے ہیں۔ ابتدا میں ریختہ صرف کلام منظوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں عام زبان کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہندوستانی (یعنی زبان ہندوستان) بھی اس کا دوسرا نام ہے یہی بولی رفتہ رفتہ اس رتبے کو پہنچی جسے ہم "اردو" کہتے ہیں اور جو اب مقبول عام نام ہے۔ عالمگیر کے عہد سے قبل یہ نام زبان کے لیے کسی تحریر میں نظر نہیں آتا۔

یہ زبان جس کے لیے زمین پنجاب کے میدانوں میں تیار ہوئی، اور جس نے دلی میں خاص حالات میں ایک نئی بولی کا روپ دھارا، صوفیوں، درویشوں اور سلطنت دہلی کے لشکروں کی بدولت گجرات، دکن، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔

درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی زیارت و صحبت کو موجب برکت سمجھتے ہیں۔ عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

خواص سے زیادہ عوام درویشوں کی طرف جھکتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے اصول وعقائد کی تلقین کے لیے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ جہاں جائیں اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق فاضل شاہ اکمروتی (تصنیف ملک محمد جائسی) کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں:

"وتوہم نکند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ پس ہر ملک کہ بودہ زبان آں ملک را بکار بردہ اند۔ وگمان نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملت والدین قدس سرہ بدین زبان سخن فرمود۔ بعد از ان خواجہ گنج شکر قدس سرہ، وحضرت خواجہ گنج شکر در زبان ہندی وپنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ ..... ہم چناں ہر یکے از اولیاء اللہ بدین لسان تکلم فرمودند۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ العزیز کا کوئی ہندی قول اب تک نہیں ملا، لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے البتہ شیخ فریدالدین شکر گنج قدس سرہٗ (ولادت ۵۶۱ھ م ۱۱۷۳ء وفات ۶۶۴ھ م ۱۲۶۵ء) کے بعض مقولے ملتے ہیں۔ مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید و مصاحب خاص تھے۔ اپنی تالیف "سیرالاولیا" میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت نے شیخ جمال الدینؒ کے چھوٹے بیٹے کو اپنی بیعت سے مشرف کیا اور رخصت کے وقت خلافت نامہ، مصلّا اور عصا عنایت فرمایا تو مادر مومناں (شیخ جمال الدین کی خادمہ) نے کہا: "خوجا بالا ہے" تو آپ نے ہندی زبان ہی میں فرمایا: "پونوں کا چاند بھی بالا ہے۔" یعنی بدر بھی پہلی رات کو چھوٹا ہوتا ہے۔

شیخ بہاؤالدین باجن (۷۹۰ھ م ۱۳۸۸ء تا ۹۱۲ھ م ۱۵۰۶ء) نے اپنی تصنیف "خزائن رحمت" میں حضرت شکر گنجؒ کے یہ دو قول نقل فرمائے ہیں جو ہماری رائے میں مستند معلوم ہوتے ہیں:

راول دیول ہی نہ جائے   پھاٹا پہنا روکھا کھائے

ہم درویشنہ رہے ریت   پالی، لورین اور مسیت

۲۔ جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس

جمعات شاہی ہیں جو حضرت قطب عالمؒ (۷۹۰ھ م ۱۳۸۸ء تا ۸۵۰ھ م ۱۴۴۶ء) حضرت شاہ عالم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا یہ منظوم قول نقل کیا ہے:

اسا کیری یہی سو ریت جاون نائے کی جادن میت

یوں بہت سے منظوم اقوال آپ کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کی کوئی باوثوق سند نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ان کے ہم نام بابا فریدؒ کے ہیں۔

شیخ بوعلی قلندرؒ (وفات ۷۲۴ھ م ۱۳۲۳ء) کا امیر خسروؒ سے یہ کہنا "ترکا کچھ سمجھدا ہے" ثابت کرتا ہے کہ یہ بزرگ بھی مقامی زبان سے واقف تھے۔

اسلامی ہند کے صاحب کمال شاعر و ادیب امیر خسروؒ (۶۵۱ھ م ۱۲۵۳ء تا ۷۲۵ھ م ۱۳۲۴ء) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ اور جملے بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ ان کی نسبت عام طور پر یہ یقین ہے کہ ان کا کلام ہندی میں بھی تھا اور بعض تذکروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، خود امیر خسرو نے بھی اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں صاف طور پر لکھا ہے کہ میں نے ہندی نظم بھی کہی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ریختہ قسم کے بعض قطعے یا ایک آدھ غزل اور کچھ پہیلیاں، چیستانیں، کہہ مکرنیاں، انملیاں، دوسخنے یا دوہے جو ان سے منسوب ہیں، ان کی صحت کے جانچنے کا اس وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں ان میں سے ممکن ہے بعض ان کے ہوں، لیکن صدہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ اور زبان میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ سب سے قدیم حوالہ ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" (۱۰۴۵ھ، ۱۶۳۵ء) میں ملتا ہے۔ اس میں ان کا یہ دوہا نقل کیا گیا ہے:

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(سب رس مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۳)

ان کی فارسی مثنویوں میں ہندی الفاظ اور جملے بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً تغلق نامے (ص ۱۰۸) میں "بے بے تیرا مارا" مثال عہد دہلوی زبان ہے۔

شیخ لطیف الدین دریا نوش" سلطان الاولیا شیخ نظام الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے حضرت شیخ باجنؒ اپنی تصنیف "خزائن رحمت" میں لکھتے ہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ شہر (دلی) سے سرکی لاتے اور اپنے رہنے کا گھر بنا لیتے۔ جب یہ سرکی پرانی ہوجاتی یا آندھیوں میں اڑ جاتی تو دوسری سرکی لے آتے۔ ان سے جب یہ کہا گیا کہ آپ مستقل گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو فرمایا:

آرے آرے بابا ہیں بنجارے — کیا گھر کرتے ہیں بنیارے

شیخ بہاؤ الدین باجنؒ نے اپنی اسی تصنیف "خزائن رحمت" میں اپنے مرشد شیخ رحمت اللہؒ کے ملفوظات وارشادات اور اقوال مشائخ سلف جمع کئے ہیں۔ اس میں جگہ جگہ اپنے اشعار اور دوہے بھی لکھے ہیں چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ساجن دعا خدا اس کی قبولے — کھاوے حلال اور سانچ بولے

قل ھو اللہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

نا اُنہ جنیا نہ وہ جایا — نا اُنہ مائی باپ کہلایا

نا اُنہ کوئی گود چڑھایا — باجن سب اُنہ آپ تپایا

پرگٹ ہوا ہو کہیں ڈیٹھیا آپ لکایا

مسجد مسجد بانگا دیویں بت خانے تیرا شور — مے خانے بھیتر رنگ کرے ایسا تیرا جور

باجن جس وہ کرے کرم — پاپ بھی ہووے دھرم

یہ فقنی کیا کس ملتی ہے — جب ملتی ہے تب جھلتی ہے

ان مثالوں سے ظاہر ہو گا کہ جو زبان امیر خسروؒ کے وقت یا ان کے قریب کے زمانے میں بولی جاتی تھی، وہ اس زبان سے جسے ہم اردو کہتے ہیں کس قدر قریب تھی۔ بعض جملے تو بالکل آج کل کی سی زبان میں ہیں۔

صوفیوں اور درویشوں کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اس زبان کے پھیلانے اور دور دراز

علاقوں میں پہنچانے میں مدد دی وہ سلطنت کی فوجیں تھیں صوفیوں کا مقصد اس زبان کی اشاعت نہ تھا انھوں نے یہ زبان اس لیے اختیار کی کہ یہی ایک ایسی زبان تھی جس کے ذریعے وہ ملک کے ہر حصے میں اپنے اصول وعقائد کی تلقین کر سکتے تھے، یہ اور بات ہے کہ اس ضمن میں زبان کی بھی اشاعت ہوگئی یہی صورت سلاطین دہلی کی فتوحات سے ظہور پذیر ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے ۶۹۵ھ م ۱۲۹۶ء میں علاؤالدین نے دکن پر لشکر کشی کی اور دیوگری تک جا پہنچا اور ۶۹۸ھ م ۱۲۹۹ء میں گجرات پر تسلط کر لیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کر دیا۔

علاؤالدین کے بعد ۷۲۷ھ م ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے دلی شہر کی آبادی کو دیوگری (دولت آباد) میں لے جاکر بسا دیا اور تخمیناً دو لاکھ دلّی والے دولت آباد میں آباد ہوگئے۔ ان کے ساتھ ان کی زبان بھی جا پہنچی، جس کے آثار اب بھی دولت آباد و خلد آباد میں پائے جاتے ہیں۔ اس حیرت انگیز واقعہ نے اس زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔

اس زبان کو دو وجوہ سے ایک جداگانہ اور خاص حیثیت حاصل ہوگئی۔ ایک تو یہ کہ وہ شروع ہی سے فارسی حروف ورسم خط میں لکھی جانے لگی۔ دوسری یہ کہ اس نے تھوڑی ہی مدت بعد وہ عروض بھی اختیار کر لیا جو فارسی زبان میں مروج ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس نے دلی میں جنم لیا، دکن میں جاکر ادب وانشا کا مرتبہ حاصل کرتی ہے اور وہاں اسے فروغ ہوتا ہے بہمنی عہد ہی میں اس کا رواج ہو چلا تھا اور موزوں طبع لوگ اس سے کام لینے لگے تھے۔ اس عہد کی پہلی کتاب معراج العاشقین سمجھی جاتی ہے جو حضرت سید محمد بن یوسف الحسینی الدهلویؒ سے منسوب ہے۔ یہ شیخ نصیرالدینؒ چراغ دہلی کے مرید تھے اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں۔ معراج العاشقین میں نے ہی حیدرآباد دکن سے شائع کی تھی۔ مجھے اس وقت بھی پورا یقین نہ تھا کہ یہ خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے۔ خواجہ بندہ نوازؒ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کی سب کتابیں فارسی یا عربی زبان میں ہیں۔ میں نے ان کی اکثر تصانیف اس خاص نظر سے بالاستیعاب دیکھی ہیں۔ کہیں کوئی ہندی لفظ یا جملہ نظر نہ پڑا۔ علاوہ معراج العاشقین کے مجھے اور بھی کئی رسالے مثلاً تلاوت الوجود، دُرّ الاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ وغیرہ ملے جو قدیم اردو میں ہیں اور خواجہ صاحب سے منسوب ہیں

اخبار الاخیار تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور جوامع الکلم تالیف سید حسین المعروف بہ سید محمد اکبر حسینیؒ فرزند اکبر خواجہ بندہ نوازؒ جس میں حضرت کے ملفوظات و حالات وغیرہ تفصیل سے درج ہیں۔ نیز دیگر کتابوں میں جس میں حضرت کا تذکرہ ہے کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ دکنی یا قدیم اردو میں بھی ان کی کوئی تصنیف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے فارسی عربی رسالوں کے ترجمے ہیں جو ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہماری زبانوں میں ہوتی آئی ہے۔

ان کا منظوم کلام بھی بعض بیاضوں میں پایا جاتا ہے۔ شہباز کا لفظ بھی ان کے نام کے ساتھ آیا ہے، اس لیے بعض منظوم اقوال جن میں شہباز بطور تخلص استعمال ہوا ہے ان ہی کا کلام سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض میں نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں نقل کیے ہیں۔ سب سے قدیم حوالہ ان کے منظوم کلام کا ایک پرانی مستند بیاض میں ملا جس میں میراں جی شمس العشاقؒ اور ان کے بیٹے پوتے اور بعض مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے اس کتاب کا سن کتابت ۱۰۶۸ھ، ۱۶۵۷ء ہے اس میں ان کی ایک غزل بھی ہے جس کے مقطع میں شہباز حسینی آیا ہے۔ اس بنا پر اسے خواجہ کا کلام سمجھ لیا گیا لیکن اس نام کے دو اور بزرگ گزرے ہیں؛ ایک ملک شرف الدین شہباز گجراتی (متوفی ۹۳۴ھ، ۱۵۲۷ء) اور دوسرے بیجاپور کے شہباز حسینی (متوفی ۱۰۱۸ھ، ۱۶۰۹ء) اس لیے حتمی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خواجہ بندہ نوازؒ کا کلام ہے۔ زبان بھی اس کی بہت پرانی نہیں۔ البتہ اسی بیاض میں مقام "ابھنگ" میں تین مصرعوں کا ایک مثلث ان کے نام سے درج ہے جو یہ ہے:

حضرت خواجہ نصیر الدین جنے جیو میں آئے جیو کا گھونگھٹ کھول کر مکھ یا ود کھائے
آکھے سید محمد حسینی پیو کا سکھ کھیا نہ جائے

اس نظم میں ان کے اپنے پیر و مرشد کا نام بھی ہے اور اس کے ساتھ اپنا پورا نام ہے، اس لیے یہ قیاس کر لینا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خواجہ صاحب کا کلام ہے۔ جوامع الکلم میں خود خواجہ صاحب کی زبانی ان کی متعدد غزلیں منقول ہیں۔ ان غزلوں میں وہ اپنا تخلص محمد یا ابوالفتح یا بوالفتح لکھتے تھے۔
اس وقت تک ہم نے قدیم زبان کی بول چال کے یا منظوم اقوال پیش کیے ہیں کسی مستقل

کتاب کا ذکر نہیں آیا مستقل کتابیں ایک مدت کے بعد تحریر میں آئیں۔ اگر معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے تو دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے مصنف کا نام فخر الدین نظامی ہے جس کا اظہار اس نے اس نظم میں کئی جگہ کیا ہے صحیح سن تصنیف معلوم نہ ہوسکا لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یہ کتاب سلطان علاؤ الدین شاہ بہمنی ابن احمد شاہ ولی کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ نعت کے بعد ایک عنوان ہے "مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلطان علاؤ الدین کو مرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا سلطان علاؤ الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ، ۱۴۳۴ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۸۶۲ھ، ۱۴۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا فرزند اور جانشین ہمایوں شاہ تھا جو ۸۶۵ھ، ۱۴۶۰ء میں فوت ہو گیا۔ ہمایوں کا جانشین اس کا فرزند نظام شاہ ہوا۔ اس کا دو سال بعد ۸۶۷ھ، ۱۴۶۲ء میں انتقال ہو گیا۔ مدح سلطان کے یہ اشعار قابل غور ہیں:

شہنشہ براشاہ احمد کنوار ، پرتپال سینسار کرتار ادھار
دھنین تاج کا کون راجا بھنگ ، کنور شاہ کا شاہ احمد بھنگ

سلطان علاؤ الدین کی اولاد اور اس کے جانشین میں کسی کا نام احمد شاہ نہ تھا بعض صاحبوں نے بہمنی سکوں سے یہ پتا لگایا ہے کہ جو سکے ۸۶۵ھ، ۱۴۶۰ء سے ۸۶۷ھ ۱۴۶۲ء تک مضروب ہوئے ہیں ان پر احمد شاہ کا نام ہے اگر یہ صحیح ہے تو یہ مثنوی انھیں سنین میں تصنیف ہوئی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ سلطان علاؤ الدین شاہ کے انتقال کے بعد اس کے کسی جانشین کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

اس مثنوی کی زبان میں ہندی عنصر بہت زیادہ ہے۔ عربی فارسی لفظ کہیں کہیں آجاتے ہیں چونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ نہیں اس لیے دو چار شعر بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں،

حمد: گسائیں تہیں ایک دونہ جگ ادھار ، بردبر دونہ جگہ تہیں دنیہار
جہاں کچھ نکو بے تہاں ہے تہیں
اکاس انچہ پاتال دھرتی تہیں

نعت: تُیں ایک سا جاگ سائیں امر سری دوی تین جگ تورا دگر
امولک مکت سیبس سنسار کا کرے کام سردھار کرتار کا

لیکن اس زبان کے ساتھ ساتھ بعض مصرعے یا شعر ایسے صاف ہیں کہ وہ آج کل کی سی زبان کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

سیانا کھرا ات بدھ ونت توں تجھ نا کہوں اور کس کوں کہوں

گنواوے کہیں اور ڈھونڈے کہیں نہ پاوے کہیں ڈھونڈنے بن کہیں

نظامی کہنہار جس یار ہوئے سُنہار سن نغز گفتار ہوئے

نہ باسی دھروں نہ تواسی دھروں
(آج کل کی زبان میں "باسی تباسی" کہتے ہیں —)

جہاں تک موجودہ تحقیقات کی دسترس ہے، اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگرچہ دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب نظامی کی مثنوی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس زبان کو مستقل طور پر ادبی صورت میں پیش کرنے کی فضیلت گجرات کو حاصل ہے اور یہ فضیلت اسے صوفیائے کرام کی بدولت نصیب ہوئی۔

مسلمان سلاطین میں سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور ۶۹۶ھ، ۱۲۹۶ء میں گجرات پر تسلط کر لیا۔ اس وقت سے اس علاقے کے صوبیدار دلی کی سلطنت کی طرف سے مقرر ہو کر آتے رہے۔ صوبیدار کے ساتھ لاؤ لشکر، مختلف پیشہ ور، شاگرد پیشہ، ملازمین، مصاحبین وغیرہ کی ایک کثیر جماعت ہوتی تھی اور ان کے لواحقین اور اہل و عیال بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ دوسرے ساز و سامان کے ساتھ دلی کی زبان بھی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ گویا دلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسروؒ کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔

تیمور کے حملے کے بعد جب دلی کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا اور صوبیدار ظفر خاںؒ
کے بیٹے تاتار خان نے گجرات میں خود اپنی حکومت قائم کرلی ۔ (۸۰۶ھ، ۱۴۰۳ء) تو شمالی
ہند سے شرفا کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے گجرات آگئی ۔ ان میں کچھ ایسے بزرگ بھی
تھے جو علومِ ظاہر و باطن کے عالم اور صاحبِ عرفان تھے ۔ چنانچہ شیخ احمد کھٹوؒ (متوفی ۸۴۹ھ
۱۴۴۵ء) حضرت قطب عالم جانشین مخدوم جلال جہانیاںؒ (۷۹۰ھ تا ۸۵۰ھ ۱۳۸۸ء تا ۱۴۴۶ء)
خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان کے اقوال میں اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے
کرام کا کام" میں نقل کر چکا ہوں ۔ اس زبان میں ان حضرات کی کوئی مستقل تصنیف و تالیف نہیں لیکن
ان کے مریدوں میں بعض ایسے بزرگ ہیں جن کی مستقل تصانیف اس زبان میں پائی جاتی ہیں ۔
ان میں ایک قاضی محمود دریائی ہیں جن کا شمار گجرات کے اولیاء اللہ میں ہے ۔ ان کے
کلام کا مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے ۔ زبان ہندی نما ہے ۔ مقامی رنگ صاف ظاہر ہے
گجراتی اور فارسی عربی لفظ بھی کہیں کہیں استعمال کیے ہیں ۔ کلام کا طرز بھی ہندی ہے چونکہ سماع
کا خاص ذوق تھا اس لیے ہر نظم کی ابتدا ریئں اس کے راگ یا راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے ۔
ان کا مشرب عشق و محبت ہے اور سارا کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے ۔ ان کا کلام (زبان
کی اجنبیت کی وجہ سے) مشکل ہے ۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ۔ نمونے کے طور پر دو چار
شعر لکھے جاتے ہیں ۔ اس سے ان کی زبان اور طرزِ کلام کا اندازہ ہوگا :

نینوں کاجل مکھ تنبولا ناک موتی گل ہار ۔۔۔ سیس نماؤں نیہ اپاؤں لپے پیر کروں جوہار

(یعنی آنکھوں میں کاجل منہ میں پان ناک میں موتی گلے میں ہار ۔ اس سج دھج سے میں
سر کو جھکاؤں، محبت کروں اور پیر کو آداب کروں)

کوئی مایلا مرم نہ بوجھے رے ۔۔۔ بات من کی کس نہ سوجھے رے

(مایلا = اندر کا ۔ مرم = بھید)

دکھ جیوں کا کس کہوں اللہ ۔۔۔ دکھ بھریا سب کوئی رے
ہر دو کھی جگ میں کو نہیں ۔۔۔ ہیں پر کھی بھر بھر جوئی رے

[یعنی اے اللہ میں اپنے جی کا دکھ کس سے کہوں، سب کوئی دکھ بھرے

ہیں۔ میں نے دنیا جہان میں پھر پھر کے دیکھ لیا۔ کوئی ایسا نہ ملا جو دکھی نہ ہو۔]

ان کی ولادت ۸۷۴ھ، ۱۴۶۹ء اور وفات ۹۴۱ھ، ۱۵۳۴ء میں ہوئی۔

ایک دوسرے بزرگ شاہ علی جیو گام دھنیؒ ہیں جن کا مولد و منشا گجرات ہے۔ گجرات کے کامل درویشوں اور عارفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے پائے کے شاعر ہیں اور ان کا کلام توحید اور وحدت الوجود سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وحدت وجود کے مسئلے کو معمولی باتوں اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں، مگر ان کے بیان اور الفاظ میں پریم کا رس گھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے۔ طرز کلام ہندی شعرا کا سا ہے۔ اور عورت کی طرف سے خطاب ہے۔ زبان سادہ ہے، لیکن چونکہ پرانی ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کیے ہیں، اس لیے کہیں کہیں سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "جواہر الاسرار" کے نام سے موسوم ہے:

تم ری پیا کو دیکھو جیسا ہور جیون پر تھوسائیں ایسا
سوبے تمہیں ہوناں وہ ایسا

اک سمند سات کہاوے دھولوس بادل مینہ برساوے
وہی سمند ہور بوند کہا لے ندیا، نالے ہور کرچا لے

پیو ملا گل لاگ رہی جے سکھ منہ دکھ کی بات نہ کیجے

شاہ صاحب کا سن وفات ۹۷۳ھ م ۱۵۶۵ء ہے۔

ایک اور بزرگ میاں خوب محمد چشتیؒ ہیں۔ یہ بھی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے ان کا شمار وہاں کے بڑے درویشوں اور اہلِ عرفان میں ہے۔ تصوف میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ صاحبِ تصانیف اور صاحبِ سخن تھے۔ آپ کی ولادت ۹۴۶ھ م ۱۵۳۹ء میں اور وفات ۱۰۲۳ھ م ۱۶۱۴ء میں واقع ہوئی۔

تصوف میں آپ کی کئی کتابیں ہیں۔ سب سے مشہور اور مقبول کتاب "خوب ترنگ" ہے
جس کا سن تصنیف ۹۸۶ھ م ۱۵۷۸ء ہے۔ یہ خاص تصوف کی کتاب ہے۔ میاں خوب محمدؒ عالم
اور سالک ہیں۔ تصوف کی اصطلاحات و نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ اپنی اس
کتاب کی شرح انھوں نے "امواجِ خوبی" کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ خوب ترنگ کے ان
کا ایک منظوم رسالہ "بھاؤ بھید" صنائع و بدائع کلام پر بھی ہے۔

یہ صوفی شعرا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، ہندی میں لکھنے کی معذرت کرتے ہیں اور اپنی
زبان کو "گوجری یا گجری" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دلی سے جو زبان جنوب کی طرف گئی اس کی
دو شاخیں ہو گئیں۔ دکن میں گئی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے دخیل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات
میں پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی۔ زبان درحقیقت
ایک ہی ہے۔ بعض مقامی الفاظ اور محاورات کی وجہ سے یہ تفریق ہو گئی۔ آخر میں یہ تفریق مٹ
گئی اور دونوں علاقوں کی زبان دکنی ہی کہلائی۔

دکنی زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجاپور تھا۔ جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیرِ سرپرستی اس
زبان کو فروغ ہوا۔ اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ امیرالدین عرف میرانجی شمس العشاقؒ ہیں
جو مکہ میں پیدا ہوئے جیسا کہ انھوں نے خود اپنے حالات میں لکھا ہے اور بحکم پیر (کمال الدین بیابانی)
بھنکار (علاقہ احمد آباد) میں جا کر مقیم ہوئے۔ بعد ازاں کچھ عرصے بعد وہاں سے منتقل ہو کر انھوں
نے بیجاپور میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ان کے نظم و نثر میں کئی رسالے ہیں۔ ایک منظوم رسالے
کا نام "خوش نامہ" ہے۔ اس میں وہ تصوف و معرفت کی باتیں ایک لڑکی "خوشی" نامی سے
لڑکیوں کے حالات کی مناسبت سے بیان کرتے ہیں، مثلاً یہ دنیا اس کی سسرال ہے اور عالم آخرت
اس کا میکا ہے۔ اس طرح تمام نسوانی مناسبات مثلاً زیور پہنا، مہندی لگانا، چرخا کاتنا وغیرہ
کا ذکر کرتے ہیں۔

اس رسالے میں پونے دو سو شعر ہیں۔ ایک دوسری نظم "خوش نغز" ہے، جس میں خوشی
سوال کرتی ہے اور میرانجیؒ جواب دیتے ہیں۔ ایک اور منظوم رسالہ جس میں تخمیناً پانچ سو شعر
ہیں تصوف کے معمولی مسائل پر ہے۔ اس میں وہ ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں اور

معذرت کرتے ہیں۔ میرانجیؒ کا سنہ وفات ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء ہے جو "شمس العشاقؒ" سے نکلتا ہے چنانچہ بعد میں وہ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ اس کی مزید تائید اس مرثیے سے ہوتی ہے جو ان کے ایک عقیدت مند نے ان کی رحلت پر کہا ہے۔ یہ مرثیہ اس بیجاپوری بیاض میں ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس مرثیے کے وہ شعر نقل کئے جاتے ہیں، جن میں ان کی وفات کا سنہ، تاریخ اور دن مذکور ہے:

تاریخ حضرت سال نور — اور اس پر اگلے بھی دو
دو دین مدت و فا شو — جے کچھ حکم الاہی کا
اربع سوں یوں سال ہے — ما ہے کوں شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے — جے کچھ حکم الاہی کا
تاریخ بست و پنج بد — بسیار گریاں رنج شد
در حال واصل گنج خود — جے کچھ حکم الاہی کا
شب پنجشنبہ روشن کیا — ہجرت منور پور کیا
جیوڑا قبض کر اُن لیا — جے کچھ حکم الاہی کا

میرانجی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم اپنے وقت کے بڑے عارف اور صوفی اور بہت خوش گو شاعر تھے۔ یہ علی عادل شاہ اول (۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۰ء) اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) کے عہد کے بزرگ ہیں کیونکہ ان کے کلام نکتہ واحد کے ایک "فرمان" کا سنہ $\frac{۹۶۷ھ}{۱۵۵۹ء}$ اور ایک دوسرے کا ۱۵۶۹ء ہے اور ان کی مثنوی "ارشاد نامہ" کا سن تصنیف ۱۵۸۲ء ہے۔ ان کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن کم از کم اتنی بات متحقق ہے کہ انھوں نے $\frac{۹۹۰ھ}{۱۵۸۲ء}$ میں یا اس کے بعد وفات پائی۔ مجھے ان کی متعدد نظمیں اور منظوم رسالے ملے ہیں جن کا ذکر میں نے رسالہ "اردو" ماہ جنوری ۱۹۲۷ء میں کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی نظم (مثنوی) ارشاد نامہ ہے جس میں تخمیناً اڑھائی ہزار اشعار ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ پرانی ہے لیکن میرانجی شمس العشاقؒ کے مقابلے میں سہل اور سادہ ہے بعض مقامات پر سادگی کے ساتھ کلام میں شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

بن عشق ڈھونڈھ کو سوچ نہیں   اور بن ڈھونڈھ عشق کو گوج نہیں
جے آپ کو کھو جیں پیو کو پائیں   پیو کو کھو جیں آپ گنوائیں

علاوہ مثنویوں اور دوسری منظومات کے شاہ صاحب نے بہت سے خیال اور دوہے بھی لکھے ہیں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے اور ہر دوہے کے ساتھ راگ راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ خاندان چشتیہ کے بزرگ موسیقی کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ روحانی ذوق پیدا کرنے اور روحانی مدارج طے کرنے میں اسے بہت بڑا ممد خیال کرتے ہیں۔

ان کی اکثر نظموں کی بحریں ہندی ہیں اور زبان پر بھی ہندی رنگ غالب ہے البتہ ہندی الفاظ و اصطلاحات کے ساتھ کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ اور اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں، نیز وہ اپنی نظموں میں ہندو مسلم دونوں روایات و تلمیحات سے کام لیتے ہیں۔ اگر ایک دوہے میں یوسف زلیخا کی تلمیح ہے تو دوسرے میں سری کرشن جی کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ برہان رح اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ ("یہ سب گجری کیا بیان")

عبدل (عبدالغنی ؟) بھی اسی زمانے کا شاعر ہے اس کی تصنیف "ابراہیم نامہ" ہے جو اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات میں خود اس کی فرمائش پر تصنیف کیا۔ (۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء)
اسی عہد کا ایک مشہور شاعر حسن شوقی ہے۔ مجھے اس کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں ایک "فتح نامہ نظام شاہ" یا "ظفر نامہ نظام شاہ" جو رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں تالی کوٹ کی مشہور جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ جنگ ۹۷۲ھ م ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس میں دکن کے فرمانرواؤں یعنی علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر وجیانگر کے راجہ رام راج پر لشکر کشی کی اور اسے مقام تالی کوٹ پر شکست دی۔ دوسری مثنوی میں جس کا نام "میزبانی سلطان محمد عادل شاہ" سلطان کی شادی سے متعلق ہے۔ اس میں شہر گشت اور جشنوں کی دھوم دھام اور میزبانی اور مہمان کی شان و شوکت کا ذکر ہے۔ ان مثنویوں کی زبان قدیم دکنی اردو ہے، مگر نسبتاً سہل ہے۔ بیان میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ شوقی کی غزلیں بھی مجھے ملی ہیں ان میں بعض مسلسل اور مرصع ہیں۔ اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو ولی اور اس کے بعد کے اساتذہ کی غزلوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں قدیم دکنی اردو کا خاصا رواج ہو گیا تھا اور یہ سرکاری دفاتر میں بھی پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ خود بھی شاعر اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اسی بنا پر اس نے "جگت گرو" کا لقب پایا۔ اس کی مشہور کتاب "نورس" فن موسیقی پر ہے جس پر ظہوری نے دیباچہ لکھا، جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی زبان ہندی ہے البتہ کہیں کہیں کوئی دکنی لفظ آ جاتا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ تخت پر بیٹھا (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۷ھ) اس عہد میں بھی اردو کا رواج برابر بڑھتا رہا۔ اس عہد کے تین شاعر قابل ذکر ہیں۔ ایک مقیمی (مرزا مقیم خان) مصنف "چندر بدن مہیار" (۱۰۵۰ھ)، دوسرا ملک خوشنود مصنف "جنت سنگھار" (قصہ بہرام، ترجمہ ہشت بہشت امیر خسرو سن تصنیف ۱۶۴۵ء) تیسرا رستمی (کمال خان) جو بہت پرگو شاعر تھا۔ اس کی تصنیف "خاور نامہ" ایک ضخیم رزمیہ مثنوی ہے جو چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں حضرت علیؓ اور ان کے رفقا کی لڑائیوں کی فرضی داستان ہے۔ سن تصنیف ۱۰۵۹ھ، ۱۶۴۹ء ہے۔

محمد عادل شاہ کے جانشین علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد میں دکنی اردو خوب فروغ ہوا۔ اس بادشاہ نے اردو کی طرف خاص توجہ کی۔ خود بھی بہت اچھا شاعر تھا شاہی تخلص کرتا تھا۔ اس کا کلیات موجود ہے جس میں اس کا کلام اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے اس عہد میں سب سے بڑا شاعر نصرتی ہے جو علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا رزم و بزم دونوں میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس کی تین مثنویاں یادگار ہیں ایک "گلشن عشق" جو نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے (۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء) یہ منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستان ہے۔ دوسری "علی نامہ": اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا بیان ہے جو اسے مغلوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑنی پڑیں۔ یہ بڑے پائے کی مثنوی ہے۔ اس میں شاعر نے تاریخی واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے۔ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر [illegible]
نصرتی کے قصائد بھی بہت پرشکوہ ہیں اور زور بیان، علو مضامین اور شوکت لفظی میں بے مثل ہیں تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کے جانشین اور عادل شاہی سلطنت کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ تا ۱۰۹۷ھ) (۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۵ء) کی اس لڑائی کا بیان ہے

جو اسے شیوا جی بھونسلہ سے لڑنی پڑی۔ یہ ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء کی تصنیف ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰؒ اپنے والد حضرت برہان الدین جانمؒ اور اپنے دادا میراں جی شمس العشاقؒ کی پیروی میں متعدد نظم و نثر کے رسالے تصوف کے مسائل پر لکھے۔ ان کی زبان نسبتاً آسان ہے۔

اس عہد کا ایک بڑا شاعر سید میراں ہاشمی گزرا ہے جو مادر زاد اندھا تھا۔ اس کی مثنوی "یوسف زلیخا" بہت مشہور ہے۔ اس نے غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ریختی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرز کلام کا لکھنے والا یہ پہلا شخص ہے۔

دکنی اردو کا تیسرا مرکز گولکنڈہ قطب شاہیوں کا دارالحکومت تھا۔ قطب شاہی بادشاہ علم و ہنر کے بہت قدرداں تھے۔ بالخصوص اس خاندان کا پانچواں بادشاہ سلطان محمد قلی (۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء) کے عہد میں ملک نے خوش حالی میں اچھی ترقی کی اور علم و فن اور شعر و شاعری کا خاصا چرچا رہا۔ بادشاہ خود بڑا اچھا شاعر تھا۔ اس کا کلیات بہت ضخیم ہے۔ وہ بہت پرگو اور قادر الکلام شاعر ہے۔ غزل کے علاوہ اس نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ متعدد قصیدے اور مثنویاں مظاہر قدرت، تہواروں، رسوم و رواجوں، موسموں، میووں اور اپنے باغات اور محلات وغیرہ پر لکھی ہیں۔ محمد قلی کا کلام بہت قدیم ہے، لیکن اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو اس کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو بعد کے نامور شعرا میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا مستند کلیات (مرتبہ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) میں ہندی اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔

اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ بھی (۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء تا ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) جس نے سلطان محمد قلی کا کلیات مرتب کیا ہے، شاعر تھا اور "ظل اللہ" تخلص کرتا تھا۔ محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی موجود ہے۔

قطب شاہی عہد کے تین شاعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک "وجہی" مصنف "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء) ہے۔ یہ نظم دکنی ادب کی ابتدائی مثنویوں میں بڑی پائے کی ہے۔ یہ در پردہ محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق ہے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری

تصنیف "سب رس" ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ دوسرا شاعر غواصی ہے۔ اس کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء اور "طوطی نامہ" ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء بہت مشہور ہیں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اسی نام کے فارسی قصے کا اور "طوطی نامہ" ضیاء الدین نخشبی کے "طوطی نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے غواصی کا دیوان بھی ہے۔ وہ بہت خوش گو شاعر ہے۔ اس کی غزلوں کی زبان صاف اور فصیح ہے۔ اس کے قصیدوں میں بھی شوکت پائی جاتی ہے تیسرا شاعر ابن نشاطی مصنف "پھول بن" ہے۔ "پھول بن" ایک فارسی قصے "بساتین" کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس نے صنائع بدائع سے خوب کام لیا ہے اور ساری مثنوی مرصع ہے لیکن سادگی اور روانی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال پر اس کے حصے بخرے ہو گئے اور پانچ نئی خود مختار سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ یعنی قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، برید شاہی، ان سب حکومتوں نے قومی زبان اردو (دکنی) کی سرپرستی کی۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بحری الملقب بہ نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ / ۱۴۸۹ء تا ۱۵۰۸ء ہے۔ اس کے زمانے کے ایک شاعر کا پتہ لگا ہے جس کا تخلص اشرف ہے۔ اس کی مثنوی "نوسرہار" شہدائے کربلا کے بیان میں ہے اس کتاب کا سن تصنیف جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء ہے۔

بازان جو تھی تاریخ سال بعد از نبی ہجرت حال
نوسو ہوئے اگلے نو یہ دکھ لکھیا اشرف تو

اگرچہ یہ مثنوی دکنی اردو کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے اور بہت قدیم ہے، لیکن اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور دوسری دکنی کتابوں کی طرح جو بعد کی اور بہت بعد کی ہیں، مشکل اور سخت نہیں ہے۔ اس میں ٹھیٹ دکنی الفاظ اور محاورے اور ہندی سنسکرت کے مشکل الفاظ نہیں ہیں۔

برید شاہی حکومت کا بانی قاسم برید تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت بیدر قرار دیا جو بہمنی سلطنت کا بھی دارالخلافہ تھا۔ اس کے فرزند امیر برید کے عہد میں ایک شاعر شہاب الدین قریشی گزرا ہے۔ اس کی کتاب "بھوگ بل" کوک شاستر کا ترجمہ ہے، امیر برید کے نام معنون ہے:

اہے شہر بیدر رچا تخت گاہ کہ بیٹھا امیر شاہ سا بادشاہ

کتاب کے آخر میں سن تصنیف (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۴ء) بھی بیان کر دیا ہے :

ہزار اور تیو میں تھے سال جب ۱۰۲۲ کیا میں مرتب سو خوش حال سب

گجرات و دکن میں اردو کی ترویج و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ عالم گیر اورنگ زیب کے عہد تک پہنچتا ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات صاف معلوم ہو گی کہ بتدریج ہندی کے غریب نامانوس اور نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے اور عربی فارسی الفاظ بڑھتے گئے حتیٰ کہ ولی دکنی (گجراتی) کے کلام میں ہندی فارسی الفاظ کا مناسب توازن نظر آتا ہے۔ یہ ہونا لازم تھا کیونکہ اردو شاعری کی تمام اصناف فارسی کی مرہونِ منت ہیں اور ان کے ادا کرنے میں بھی فارسی کی تقلید کی گئی ہے اسی لیے اب تک اردو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چھایا رہا۔ عہد عالم گیر کے آخر زمانے میں اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ولی دکنی کا انتقال شہنشاہ عالم گیر کی وفات کے ایک سال بعد ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے (۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں) وہ دلی آیا تو اہلِ ذوق اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوئے اور وہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ وہاں کے موزوں طبع حضرات نے اسی طرز میں غزل گوئی شروع کر دی۔ اس سے قبل شمالی ہند میں کوئی غزل گو شاعر نہیں پایا جاتا۔ ولی کو بھی دلی کی زبان سے فیض پہنچا۔ ولی غزل کا شاعر ہے۔ قدما کی زبان میں جو کرختگی اور ناہموری تھی وہ ولی کی زبان میں نہیں۔ اس کی زبان میں لوچ اور لطافت اور بیان میں لذت اور روانی پائی جاتی ہے۔ تصوف کے لگاؤ نے اس کے کلام میں دردمندی پیدا کر دی ہے۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا مناسب تناسب قائم رکھا ہے۔ ولی کا درجہ بین بین ہے۔ اگر وہ بہت بلند پروازی نہیں کرتا تو پستی کی طرف بھی نہیں جاتا۔

دکن میں ولی کے ہم عصر اور بھی کئی شاعر تھے۔ ان میں صرف چند قابل ذکر ہیں۔ گجراتی مصنف "یوسف زلیخا" (۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء) قاضی محمد بحری جن کی مثنوی "من لگن" دکن میں بہت مقبول ہوئی اور بار بار طبع ہوئی۔ ان کا کلیات بھی ہے جس میں غزلوں کے علاوہ بعض دیگر اصناف ہیں۔ ان کا کلام بڑے پائے کا ہے۔ وجیہ الدین وجدی جن کی مثنوی "پنچھی باچا" (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) ترجمہ "منطق الطیر" بہت مشہور ہے۔

۲

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز محمد بادشاہ (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء)
کے وقت سے ہوتا ہے۔ ولی کا دیوان دلی میں پہنچا تو غزل گوئی کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ شاہ مبارک آبرو (متوفی ۱۱۶۴ھ م ۱۷۵۰ء) شاہ حاتم (۱۱۱۱ھ م ۱۶۹۹ء تا ۱۲۰۶ھ م ۱۷۹۱ء) شرف الدین مضمون متوفی ۱۱۵۸ھ م ۱۷۴۵ء) سید محمد شاکر ناجی وغیرہ نے اسی رنگ میں غزل گوئی کا آغاز کیا۔

اس عہد میں خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ م ۱۷۲۱ء تا ۱۱۹۹ھ م ۱۷۸۴ء) اپنے کلام اور بزرگی کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا کلام اپنی خصوصیت کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ فارسی اور ہندی کے اثر سے تصوف اردو شاعری میں پہنچ گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں صوفیانہ شاعری کا حق خواجہ صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کا تصوف عطار و سنائی سے ملتا ہے نہ کہ حافظ و خیام سے۔ ان کا طرز بیان پاک صاف رواں اور پختہ ہے اور تاثیر سے خالی نہیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کے اولیا اور عارفوں میں تھا۔ ان کے کلام میں بھی عرفان و معرفت کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ بڑے خود دار اور اعلیٰ سیرت کے بزرگ تھے۔ جب دلی پر پے بہ پے آفات نازل ہوئیں اور شعر و سخن کا کوئی سرپرست نہ رہا تو شعرائے عظام دلی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے مگر خواجہ صاحب کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔

لیکن اردو کے کمال کا زمانہ میر تقی میر (۱۱۳۵ھ م ۱۷۲۲ء تا ۱۲۲۵ھ م ۱۸۱۰ء) کا زمانہ ہے۔ میر کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے والد ایک گوشہ نشین متوکل درویش تھے۔ میر کی نو عمری کا بڑا حصہ شب و روز درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے اور تلاش معاش میں دلی سے آگرے آئے۔ اُس وقت مغلوں کے اقبال کا ستارہ گنا رہا تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد احمد شاہ درانی کے حملوں مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گری نے اس کی رہی سہی وقعت خاک میں ملا دی تھی۔ ان تمام واقعات کا اثر ان کے دل پر بہت گہرا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حزن و یاس، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ ہے اور جذبات کے اظہار میں خلوص پایا جاتا ہے اور زبان میں خاص گھلاوٹ اور شیرینی، سادگی اور موسیقیت ہے۔ یہ خوبیاں یکجا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تمام باکمال شعرا نے انہیں استاد مانا ہے۔ ان کی بعض مثنویاں بھی بڑے پائے کی ہیں۔ وہ بہت بلند سیرت کے شخص تھے۔ خودداری اور بے نیازی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اسی

نہ رہی تو دلی کی ساری رونق لکھنؤ آ گئی ۔ میر صاحب بھی نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے آئے ۔

ان کے ہم عصر سودا (۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء تا ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۰ء) کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ۔ ان کے دیوان میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی لپٹے ہوئے ہیں ۔ وہ مصاحب اور درباری تھے ۔ اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھتے تھے ۔ اکثر اوقات خواہ مخواہ جھگڑے مول لیتے تھے اور طویل طویل ہجویں کہتے تھے لیکن باوجود اس کیچڑ کے جو انھوں نے اچھالی ہے وہ بہت قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا شمار اردو کے اوّل درجے کے باکمال اساتذہ میں ہے ۔ اردو زبان میں ان کے قصائد اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ ان کے کلام میں شکوہ بیان میں قدرت اور وسعتِ نظر پائی جاتی ہے ۔ وہ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے ۔

میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ ، ۱۷۸۶ء) اپنے زمانے کے رسوم و عادات کے مصوّر ہیں ۔ وہ ہر چیز کو صحیح طور سے اور اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں ۔ وہ حقیقت نگار ہیں ۔ ان کی مشہور مثنوی "سحر البیان" میں قدرتی مناظر اور انسانی جذبات ، دلوں کا بیان موجود ہے نیز حسن بیان اور لطف زبان بدرجہ کمال پایا جاتا ہے ۔ اردو زبان میں یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی ۔ یہ اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ اس نظم کا قصہ قدیم طرز کا ہے ۔

مصحفی (متوفی ۱۲۴۱ھ م ۱۸۲۵ء) بہت پرگو، مشّاق اور پختہ شاعر تھے ۔ فنِ شعر کے نکات پر گہری نظر تھی ۔ ان کا کلام آٹھ جلدوں میں ہے ۔ سودا کے انداز میں قصیدے بھی بہت لکھے ہیں ۔ زبان میں صفائی اور روانی ہے اور ہر قسم کے مضمون ادا کرنے پر قادر ہیں ۔ ان کے استاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں

اب رنگین (متوفی ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) ، انشا (۱۲۳۳ھ م ۱۸۱۷ء) کا دور آتا ہے ۔ یہ بھی سودا ، میر اور حسن کی طرح لکھنؤ آ گئے تھے ۔ لکھنؤ اس زمانہ میں عشرت پسندی ، تکلفات اور نمود و نمائش کا مرکز تھا ۔ یہ رنگ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں نظر آتا ہے ۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی تھی ۔ اسی رنگ میں شاعری بھی رنگی گئی ۔ رنگین ریختی کا موجد ہے یعنی وہ اس طرز کا بانی ہے جس میں سارا کلام عورتوں کی ہی زبان میں اور عورتوں ہی کے متعلق ہوتا ہے ۔ وہ جام ہندی کا مے نوش ہے ۔ مگر اس کا معیار ادنیٰ ہے ۔ اس کی شاعری تمام تر شہواتِ نفسانی سے پُر ہے ۔
انشا شہواتِ نفسانی کا دلدادہ نہیں مگر بڑا زندہ دل ، خوش طبع اور ظریف ہے ، خوب ہنستا

ہے اور ہنساتا ہے۔ انشا اردو ادب میں ایک شاندار کھنڈر کی مانند ہے۔ وہ سچا شاعر تھا جو زمانہ زوال میں پیدا ہوا جب کہ عزتِ نفس اور خودداری کی جگہ غلامی نے لے لی تھی۔ انشا زندگی کو کھیل سمجھتا ہے۔ اس کی نظم کا رنگ بہت شوخ ہے اور جذبات جھوٹے ہیں۔ وہ فن شعر کا استاد ہے۔ اس میں بلا کی جدت اور طباعی ہے۔ اگرچہ اس کے تکلفات اور تصنعات نے اردو ادب کو ایک طرح سے نقصان پہنچایا مگر پھر بھی اس نے بیان میں شگفتگی، تازگی اور وسعت پیدا کی ہے۔ اس کا اثر نظم و نثر دونوں جانب ہے۔ وہ اس برِعظیم کی متعدد زبانیں جانتا تھا۔ اردو زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس پر اس کا کلام اور خاص کر اس کی کتاب "دریائے لطافت" شاہد ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک اہلِ زبان نے اردو صرف و نحو اور لسانیات پر لکھی ہے۔ اگر وہ شاہی دربار میں جاکر اپنی ہستی نہ کھو دیتا تو سودا کی ٹکر کا ہوتا اور شاید بعض صورتوں میں وہ اردو کے حق میں بے نظیر کام کرتا۔

نظیر (متوفی ۱۸۳۰ء م ۱۲۴۶ھ) اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ بہت ناانصافی کی گئی ہے۔ ہمارے شاعروں اور تذکرہ نویسوں نے اسے سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھا۔ اس کی قدر سب سے پہلے یورپیوں نے کی، لیکن انھوں نے اور ان کے مقلدوں نے اسے اس قدر بڑھایا جس کا شاید وہ مستحق نہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ اپنی وضع کا ایک ہی شاعر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر ہے۔ اس میں پاک دلی اور معصومیت کے ساتھ انتہا درجے کی رندمشربی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بے اعتدالی جو کہیں کہیں آجاتی ہے لطف سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض اوقات شہوانی خواہشیں اسے گمراہ کردیتی ہیں، مگر اس کا کمال اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کی شاعری شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کا بہترین کلام وہ ہے جس میں وہ اپنے دیس کا راگ گاتا ہے اور مزے مزے سے .... چیزوں پر نظمیں لکھتا ہے جن کو بوڑھے بچے امیر غریب سب پڑھتے اور مزہ لیتے ہیں۔ اپنے وطن کی بنجر زمین کی طرح اس کی طبیعت زرخیز اور مالا مال ہے۔ اس کی اکثر نظمیں پرندوں اور جانوروں پر ہیں (مثلاً ہنس بچارا، ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ) جو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ دراصل اس زمانے کے معاشرے کی رسوم و عادات پر تنقید ہے۔ اس نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں ہندوستان کے تہواروں کا پرلطف سماں کھینچا ہے۔ اس نے ہندوستان کے موسموں کا حال جس لطف و خوبی سے لکھا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا عاشق ہے۔ اس کا یہ کمال کالیداس سے کم نہیں۔ وہ اپنے اسلوبِ بیان میں بے پرواہ ہے۔ اس کا کلام عیب سے خالی نہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں لااُبالی ہے اور اسے اپنے بیان کی روانی میں کسی چیز کا حارج ہونا گوارا نہیں۔ اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ عوام کا شاعر ہے۔

ذوق (۱۲۰۴ھ م ۱۷۸۹ء تا ۱۲۷۱ھ م ۱۸۵۴ء) فارسی شعرا کے ایک طویل سلسلے کا مقلد ہے۔ اس کے قصیدے جو زیادہ تر آخری مغل بادشاہ کی مدح میں ہیں، اردو زبان میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ غزلوں کی حالت دوسری ہے۔ اس کی طبیعت غزل کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ فن کے لحاظ سے اس کی غزلیں بے عیب ہیں مگر ان میں شعریت کم ہے ذوقِ محبت کی گرمی اور جوش سے خالی ہے۔

مومن (۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء تا ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء) ایک عاشق مزاج لذت کا دلدادہ حسن پرست شاعر تھا۔ اگرچہ اس نے قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا اصل کوچہ غزل ہے جس میں وہ عشقیہ معاملات اور واردات کو پیش کرتا ہے۔ ان خیالات کے ادا کرنے میں اس نے اکثر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے لیکن اس کے کلام میں سوز و گداز اور اثر نہیں۔ اس کا عشق صادق نہیں۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ بہت پرگو شاعر تھے۔ ان کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں۔ بہت سی اصنافِ سخن پر شاہ نصیر کے شاگرد رہے۔ ان کے بعد ذوق سے مشورہ سخن کرنے لگے جو ان کے دربار کے ملک الشعرا تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے۔ ان کے کلام کا اکثر حصہ بھرتی کا ہے۔ نئی نئی زمینیں اور نئے نئے قافیے اور ردیفیں نکالنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن اکثر اشعار جن میں وارداتِ قلبی کی کیفیت کا بیان ہے سوز و گداز اور یاسیت سے پُر ہیں۔ بادشاہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ اپنے اشعار میں روزمرہ اور محاورہ بڑی خوبی سے باندھتے ہیں، اس لیے ان کا کلام سند ہے۔ بقول حالی "ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے"۔ تصوف سے بھی بہت لگاؤ ہوگیا تھا چنانچہ اُن کے کلام میں صوفیانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری بے مزہ اور تقلیدی تھی جس میں وہی خیالات وہی الفاظ وہی باتیں ہیں جو بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ شمع نظم بجھنے کو تھی کہ غالب ایک شعلۂ طور کی طرح نمودار ہوا۔

غالب سپاہی خاندان کا تھا۔ اس کی رگوں میں ایک ترکی خون تھا جس نے اس کی شاعری میں گرمی پیدا کر دی۔ ابھی وہ مکتب ہی میں تھا کہ اس نے شاعری شروع کر دی۔ لیکن اس کا کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اگرچہ ترقی کا انقلاب تھا مگر غارت گر بھی تھا۔ اس میں بہت سی وہ چیزیں بھی برباد ہو گئیں جو رہنے کے قابل تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ اسے ہوا، اس کا اثر اس کے کلام میں درد اور سوز سے پایا جاتا ہے۔

غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہم عصروں نے اس کی قدر نہ کی۔ غالب کے کلام سے اردو کی جدید شاعری کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس میں جدت تخیل کا زور اور ایسی بلند پردازی ہے جو اردو کے کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ غالب کی بدولت اردو شاعری میں فلسفہ کا ذوق پیدا ہوا جس سے وہ اب تک محروم تھی۔ فلسفے، تصوف اور سوز و گداز نے مل کر اس کے کلام میں ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے۔

غالب کا طرز مرصع اور دل نشین ہے۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ اکثر اوقات اس کا طرزِ ادا فارسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ جتا دینا لازم ہے کہ اس کے خیالات کی نزاکت اور جدت کسی آسان طرز میں ادا نہیں ہو سکتی تھی لیکن جہاں کہیں اس نے صاف شعر کہے ہیں وہ انتہا درجے کے سہل ممتنع ہیں۔ غالب نے اُردو شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی جس میں اب تک کی جدید شاعری کا ہیولا موجود تھا۔ وہ بہت زندہ دِل، ظریف، خوب صورت اور شاندار شخص تھا۔ دہلی میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مُردوں پر رونا اور آنسو بہانا دنیا کی شاعری کا ایک قدیم طرز ہے، لیکن مسلمانوں کی المیہ شاعری امام حسینؓ کی شہادت سے متعلق ہے۔ ایران میں اس پر بہت سے مرثیے لکھے گئے۔ محتشم کاشی کی نظم بہت مشہور ہے۔ محتشم ایرانی تھا۔ اس کا غم عورتوں کا سا ہے۔ اسی کی تقلید ہندوستان کے مرثیہ گو شاعروں نے کی۔ انیس (۱۸۰۲-۱۸۷۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) محتشم کاشی سے سبقت لے گئے ہیں لیکن ان کے مراثی میں بھی مردانہ پن نہیں ہے۔ حسنِ بیان اور زبان اور مذہب کے جوش نے ان مرثیوں

کی قدر و منزلت بہت بڑھادی ہے اور اس وجہ سے اردو ادب میں مرثیے کو ایک خاص مقام حاصل ہوگیا ہے۔

میر انیس کے کلام میں واقعاتِ کربلا ایسے فطری احساس سے بیان کیے گئے ہیں اور شہدائے کربلا کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان کی تاریخی شخصیت زندہ نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار رواں اور شاندار ہیں اور اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بات چیت کر رہا ہو۔ لیکن ان پر حزن و مایوسی کا پردہ پڑا ہوا ہے حضرت امامؑ کے عظیم الشان شجاعت کے کارنامے کو رزمیہ رنگ میں بلند آہنگی سے بیان کرنے کی بجائے اسے مایوسانہ اور زنانہ طرز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں وہ شان نہیں پائی جاتی جو صداقت و راستی کے شہید میں پائی جانی چاہیے۔ انیس اور دبیر دونوں ان کے مصائب و آلام پر عورتوں کی طرح آہ و زاری اور ماتم کرتے ہیں۔ باوجود ان تمام نقائص کے انیس زبان اور فن شعر کا باکمال استاد ہے۔

لکھنؤ کے زوال کا زمانہ ردِعمل اور رکاوٹ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے شاعروں کے خیالات میں گہرائی نام کو نہیں۔ کوئی جدید خیال نہیں، کوئی نیا طرز نہیں۔ شاعری انہی پرانے قالبوں میں ڈھالی جاتی ہے۔ تصنع اور تکلف کی بھرمار ہے۔ آتش اور ناسخ فن کے استاد ہیں مگر بڑے شعرا میں شمار کئے جانے کے مستحق نہیں۔ ناسخ کے مقلد اور شاگرد (اوزیر رشک، صبا، بحر، امانت وغیرہ) شاعر نہیں ضلع جگت باز ہیں۔ ان کی شاعری کا دار و مدار محض الفاظ کے الٹ پھیر، رعایت لفظی، روزمرہ کی پامال تشبیہوں اور استعاروں پر ہے اور ابتذال کی طرف مائل ہے۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی شاعرانہ صنعت کے کمال کا نمونہ ہے لیکن رعایت لفظی کا خبط عیب تک پہنچ گیا ہے۔ شوق کی مثنویاں اس زمانے کی عیاشانہ سوسائٹی کا خاکہ ہیں جس کا اصل منبع واجد علی شاہ کا چھبیلا دربار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مثنویوں کی زبان کی صفائی، بیساختہ پن اور محاورے اور بول چال کی خوبی قابل داد ہے لیکن شاعر خوش فعلیوں پر جان دیتا ہے اور تلون کا شکار ہے۔

داغ اور امیر کے بعد میر تقی میر کی قدیم (کلاسیکی) شاعری کی بنیاد ڈھے گئی۔ دونوں کا کلام

پستی کی طرف مائل ہے۔ یہ اس مردہ روایت کے علمبردار ہیں جس کی ساری کوشش بے اثر، چھوٹی چھوٹی خوش نمائیوں میں صرف ہوتی تھی لیکن داغ زبان کا بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی زبان کی سادگی، روانی اور بے ساختہ پن اور اس زبان میں اظہار خیال حیرت انگیز ہے۔ اس نے اردو کو روزمرہ اور محاورے اور شوخ اسلوب بیان سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ بات داغ پر ختم ہے اس کا اثر اس کے ہم عصر شاعروں پر بھی ہوا۔

جب ادب ایک تمسخر اور نقالی ہو گیا تو ملک کی دماغی زندگی پر مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہ ہندوستانی طبائع کے لیے خیالات کی نئی دنیا تھی۔ پرانی روایات بدل گئیں۔ جدید سائنس کی بدولت باطنی خودی کی جگہ ظاہری فن نے لے لی۔ ذوق سخن کے اصولوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ مسجع اور مقفیٰ زبان کی بجائے سادگی اور زنانہ پن کی بجائے مردانہ پن اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔

اس عہد کی ایک ممتاز ہستی محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) ہیں۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مغرب کی ابلتی ہوئی شراب سے اپنا جام بھرا۔ وہ زبان کے محقق اور مسجع نثر کے استاد تھے مگر وہ بڑے شاعر نہ تھے۔ وہ صرف مٹی کی عورتیں بنانا جانتے تھے۔ ان کے ہم عصر حالی کی حالت بالکل دوسری تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء تا ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) پانی پت میں پیدا ہوئے جہاں ہندوستان کی تین فیصلہ کن لڑائیاں ہوئیں اور سلطنتوں نے پلٹا کھایا۔ ان کا لڑکپن اور جوانی دلی میں بسر ہوئی۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس میں سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اقبال کا سورج انھوں نے اپنی آنکھوں سے ڈوبتا دیکھا تھا۔ ان تمام واقعات کا گہرا اثر ان کے قلب پر ہوا۔ ادبی فیض انہیں شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی سے پہنچا۔

ان کی ابتدائی شاعری عام طرز کی تھی لیکن جدید اثر نے ان کی شاعری کا رخ نیچرل ازم اور حقیقت نگاری کی طرف پھیر دیا۔ ان کی قومی اور اخلاقی شاعری علی گڑھ تحریک کا نتیجہ ہے۔ سر سید احمد خان کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ حالی نے ان جدید خیالات کا گیت

گایا۔ اسلامی حکومتوں کے زوال نے ایک عجیب وغریب درد پیدا کر دیا تھا۔ اس نے اس کھوئے ہوئے عظمت اور جلال کو دلی سوز وگداز اور درد سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے مسدس (مدو جزر اسلام) میں تاریخ زمانۂ گذشتہ ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرقع بھی حیرت انگیز صفائی سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری کی بنیاد زوال یافتہ قوم کی گہرائی بے آواز مایوسی پر ہے جسے پڑھ کر بے اختیار دل بھر آتا ہے مگر وہ اُسے پھر بنانا اور تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حالی اگرچہ انگریزی زبان وادب سے واقف نہ تھے تاہم وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے باوجود زبان نہ جاننے کے بساط بھر انگریزی خیالات وادب کی ایک گونہ ترجمانی کی ہے انھوں نے ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ شاعری حالی کے لیے صداقت کا جذبہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات صداقت کی خاطر فن کے حسن سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کا بڑا نقاد ہے۔ اس کی زبان پاک صاف اور پر اثر ہے۔ بول چال کے وہ سادہ اچھوتے جاندار لفظ جن کی اس وقت تک دربار میں رسائی نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ اس نے اپنی قوم کی بے زبان عورتوں کی حمایت بڑی دردمندی سے کی ہے۔ "مناجات بیوہ" اس کا دوسرا شہ کار ہے جو انتہائی سادہ اور ایسی زبان میں ہے جو اسی موضوع کے لیے خاص طور پر موزوں ہے اور اس قدر پر درد اور دل گداز ہے کہ اسے پڑھ کر سخت سے سخت دل بھی پگھل جاتا ہے۔ "چپ کی داد" اس کی ایک دوسری نظم ہے جس میں اپنے ملک کی عورت عصمت، شرافت اور بے بسی کو عجیب انداز سے بیان کیا گیا ہے مرثیہ اُردو میں شہدائے کربلا کے لیے خاص تھا۔ حالی نے قوم کی بعض برگزیدہ ہستیوں کے ایسے مرثیے لکھے ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں اس سے پہلے نہ تھی۔ غالب کا مرثیہ اردو ادب میں شہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ حکیم محمود خاں کا مرثیہ گویا دلی کا مرثیہ ہے۔

مغربی خیالات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر جو قدیم روایات کو بہائے لیے جا رہا تھا، اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) نے مشرقی تہذیب و روایات کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور اپنی طنز و تضحیک کے زہریلے تیر یورپ اور اس کی فضولیات کے پرستاروں پر برسانے شروع کیے۔ اس نے علی گڑھ تحریک کو بھی نہیں بخشا۔ علی گڑھ اور سر سید احمد خاں تو گویا اس کے مزاح و طنز کے ہدف تھے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یورپ کی مادیت کا سیلاب اسلام اور اسلامی ثقافت

کو لے ڈوبے۔ ہر نیا خیال اور جدید تحریک کو وہ بدگمانی کی نظر سے دیکھتا اور اس کے ہاتھوں اس کی بری گت بنتی خصوصاً ان تنگ نظر ہندیوں سے اسے سخت نفرت تھی جو اندھا دھند اہلِ یورپ کی نقالی کرتے تھے، اگرچہ خود اس کی نظر بھی محدود تھی۔ نئے خیال سے بدکتا اور مذہب کے نام پر ان کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اس کا اسلوب بیان بہت ستھرا، پرلطف اور پرمزاح ہے اس کی طنز بڑی گہری اور کاری ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ بہت مقبول ہوا لیکن یہ مقبولیت اب کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کا اس قسم کا کلام کا معتدبہ حصہ وقتی تھا۔ اب اس کا ڈنک نکل گیا ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کے کلام کے بعض حصے اس زمانے کی نفسیاتی تنقید اور خوبیٔ بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاعری کے اس جدید دور میں تین شخصیتیں دوسروں سے الگ نہایت بلندی پر نظر آتی ہیں۔ غالب، حالی، اور اقبال۔ ان تینوں کے کلام نے مردہ شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ غالب نے اگرچہ کوئی نئی راہ نہیں نکالی لیکن اس کی جدتِ فکر، بلندیٔ تخیل اور بیان کی شوخی نے پرانی شاعری میں جان سی ڈال دی۔ باوجود زندہ دلی کے اس کے کلام میں یاسیت جھلکتی ہے۔ اس کے بعد ہی زمانہ بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ہماری شاعری بھی بدل جاتی ہے اور حالی نے آکر ہماری شاعری کا رُخ یکسر بدل دیا۔

اقبال میں گو غالب کے سے تخیل کی بلند پردازی اور حالی کا سا سوز و گداز نہ ہو لیکن اس کے کلام میں جو ولولہ، جوش اور تخلیقی قوت ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ اس نے فرنگی تہذیب، جمہوریت، وطنیت اور مادیت کے بت بڑی بے دردی سے توڑے ہیں لیکن ہماری شاعری میں سب سے زیادہ مغربی خیالات سے تمتع اسی نے حاصل کیا ہے۔ وہ بہت بڑا مفکر اور عظیم المرتبت شاعر ہے۔ اس نے ان حکیمانہ افکار کو جو مغرب و مشرق کی حکومتوں کے گہرے مطالعہ ذاتی غور و فکر اور زندگی کے تجربات سے حاصل ہوئے، اپنے جذبات و وجدانات میں ڈبو کر شعر کے قالب میں ایسے لطیف، پرجوش اور انقلاب انگیز پیرائے سے ادا کیے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مردہ دلوں میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے مسلمانوں کو جو مغرب سے مرعوب اور برادرانِ وطن سے مجوب عارضۂ کمتری میں مبتلا، مایوس و دل شکستہ تھے عزتِ نفس اور خودداری کا پیغام سنایا اور خودی کا جدید تصور پیش کر کے ان کی ہمتوں میں بلندی اور عزائم میں استقلال

پیدا کیا۔ ابتدا میں اس نے مقبول عام شاعری کے بعد وطنیت کے گیت گائے اُسے خاک وطن
کا ہر ذرہ دیوتا نظر آیا اور وہ ایک نئے شوالے کی بنیاد استوار کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی
ملک کی اجتماعی زندگی اور بنیادی اصولوں پر بھی نظر ڈالی اور بندۂ مزدور کو بیداری کا پیغام دیا۔
آخر میں وہ وطنیت سے نکل کر تعمیر ملت کی طرف مائل ہوگئے اور بنی نوع انسان کو اپنا پیغام دیتے
ہیں یعنی وہ قوموں کو روحانی رشتے میں منسلک کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی پیروی
میں ہے۔ ان کے خیال میں اسی میں بنی نوع انسان کی مشکلات و مصائب کا حل اور ان کی نجات ہے۔
اقبال نے اپنے کلام سے اردو زبان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے جو اس سے پہلے اسے نصیب
نہیں ہوا تھا۔ اب اردو کی تنگ دامانی کی شکایت اس شدت سے باقی نہیں رہ گئی۔ وہ بلاشبہ شاعر
مشرق کے خطاب کا مستحق ہے۔

اقبال کی شاعری کا اثر بعد کے اردو شاعروں پر بہت کچھ ہوا۔ وہ خیالات ہی سے
متاثر نہیں ہوئے الفاظ اور تراکیب بھی اسی قسم کی استعمال کرنے لگے۔

غزل اپنی رعنائی، حسن بیان، سبک پن، رمزیت اور اشاریت کی وجہ سے ہماری شاعری
پر چھائی رہی اور چھائی ہوئی ہے اس کا میدان حسن و عشق ہے۔ اگر کوئی اور بات بھی کہنی ہوتی
ہے تو اسی کی بول چال اور اشاروں کنایوں میں کہنی پڑتی ہے غزل کا قدیم اسلوب داغ پر
ختم ہو جاتا ہے۔ حالی کی تنقید نے اسے ایک طرف تو ابتذال و پستی سے بچایا اور دوسری
طرف لفظی صنعت گری اور بے جان و بے لطف قافیہ بندی کی مشق سے نجات دلائی، حالی
کے پیش نظر غزل کی اصلاح تھی۔ اس کے سب اُتار چڑھاؤ اور محاسن و عیوب حالی کی نظر
میں تھے۔ اس کی اصلاح کی محرک وہ بد ذوقی تھی جس نے غزل کو لفظوں کا کھیل بنا دیا
تھا۔ اس میں خیال کی جدت تھی نہ تازگی۔ خیال پس پشت جا پڑا تھا۔ حالی کی تنقید نے
غزل کو پستی اور لفظی شعبدہ بازی سے نکالا۔ مضامین کے لحاظ سے وسعت کا مشورہ دیا
اور اس صنف سخن کو زندگی سے زیادہ قریب لانے کی طرف توجہ دلائی، صداقت اور خلوص
لازم شرط تھی۔ حالی نے خود بھی اس پر عمل کر کے اچھی مثال پیش کی۔ اس کی غزلیں بھی حسن و
عشق کے تذکرے سے خالی نہیں۔ ان میں عشق کے نازک جذبات و احساسات اور انسان

کی نفسی کیفیات کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کی شاعری کا مقصد قومی اصلاح تھا، اس لیے یہ خیالات بھی اس کی غزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس سے بعض اوقات غزل کی وہ شان باقی نہیں رہتی جس سے غزل عبارت ہے۔ تاہم اس سے وسعت کا رستہ کھل گیا بعد کے شعرا اس کی تقلید اور مثال سے کسی نہ کسی صورت سے ضرور متاثر ہوئے۔

غزل کی قدیم روایت اس وقت حسرتؔ، اصغرؔ اور فانیؔ کے دم سے قائم تھی۔ حسرتؔ کی شاعری خالص عشقیہ ہے جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اپنے وقت کے مصحفی ہیں۔ وہ محبوب کے انداز بیان کرنے میں حقیقت سے ہم کنار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے عشقیہ واردات کو سچے اور صاف طور سے بیان کیا ہے۔ یہ صوفیا کا عشق نہیں بلکہ عام انسانوں کا عشق ہے اس کی غزلوں میں کہیں سیاسی رنگ بھی آ گیا ہے مگر بے اثر ہے۔

غزل میں جدت کا رنگ بھرنے میں اصغرؔ کا بھی حصہ ہے۔ ان کا میلان اگرچہ صوفیانہ خیالات کی طرف ہے اور ان کی نظر مسائلِ حیات پر حکیمانہ ہے لیکن انسانی حسن کی کیفیات اور اثر کو بھی بڑی خوبی سے اور بعض اوقات کیف آور انداز سے بیان کیا ہے۔ فانیؔ زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں ان کے کلام پر سراسر حزن و ملال اور یاسیت چھائی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود وہ حسن و عشق کے وہ اسرار بیان کر جاتے ہیں جو غزل کے لوازم میں سے ہیں۔ اصغرؔ اور فانیؔ دونوں جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے اور باوجود وفورِ جذبات کے ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے بخلاف جگرؔ حسن و عشق کا شاعر اور ان کی نفسیات کا ماہر ہے۔ اس نے غزل میں بڑی رنگینی اور مستی پیدا کی ہے اس وقت جب کہ نظم کے مقابلے میں غزل کا اقتدار گھٹتا نظر آ رہا ہے، جگرؔ نے اس کی پشت پناہی کی اور اپنے والہانہ اور سرور افزا کلام سے تغزل کا رنگ پھر جما دیا۔

لکھنؤ بھی جدید اثرات سے نہ بچا۔ وہاں کے شعرا کو اپنے پرانے غیر شاعرانہ طرز کو خیرباد کہنا پڑا۔ انھوں نے تصنع اور لفظی صناعی کو ترک کر کے سادگی اور حقیقت کو پیش نظر رکھا۔ چکبست کی غزلیں حسن و عشق سے خالی ہیں۔ وہ وطنیت اور ہوم رول (Home Rule) کا راگ گاتے ہیں۔ ان کی نظر غزلوں میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف پڑتی ہے،

لیکن انھوں نے آدابِ غزل کو ترک نہیں کیا۔ شعرائے لکھنؤ نے ناسخ کی تقلید چھوڑ کر غالب و میر کی پیروی کی طرف توجہ کی۔ صفیؔ، حزیںؔ، ثاقبؔ، آرزوؔ، اثرؔ کا کلام اس کا شاہد ہے۔ خاص کر آرزو نے سادہ اُردو کو اپنی "سریلی بانسری" میں ہندی کے سانچے میں خوب ڈھالا ہے اور ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے۔ اثرؔ کی غزل میں سادگی، صفائی، نفاست اور رنگینی پائی جاتی ہے، جس سے ان کی غزلوں میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ یگانہ میں عاشقانہ رنگ ذرا گہرا ہے اور وہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا۔ اس کی خودداری اور بے باکی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح مسائلِ حیات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات کو بھی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یگانہ نے غزل میں جدّت پیدا کی ہے —

اقبال کے بعد جس شاعر نے ملک میں عام مقبولیت حاصل کی وہ جوشؔ ہے۔ اگرچہ اس کے کلام میں وہ گہرائی نہیں جو اقبال کے کلام میں ہے۔ وہ اسم بامسمیٰ ہے، شاعرِ شباب بھی ہے اور شاعرِ انقلاب بھی۔ اس کے یہاں رومان اور انقلاب باہم یکجا نظر آتے ہیں، وہ بہت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہے۔ اس کے کلام میں شان و شکوہ اور دبدبہ ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بغیر جھجک کے آزادی کے ساتھ کہہ دیتا ہے۔ اسے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔ الفاظ اس کے سامنے پرا باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے کلام میں دریا کی سی روانی ہے۔ بعض وقت یہ روانی خوفناک طغیانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خصوصاً جب مظلوموں اور مزدوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر سرمایہ داروں اور حکومتوں پر گرجتا ہے یا جب وہ فرنگی سیاست کی کارستانیوں اور اپنی قومی معاشرے کی خرابیوں اور بدکاریوں کی قلعی کھولتا ہے۔ وہ اب غزل سے بیزار ہے۔ غزل میں اس کے خیالات کی گنجائش نہیں۔ حالی اور اقبال نے بھی غزلیں کہیں ہیں اور اپنے افکار ان میں ادا کیے ہیں اور غرض اس کے لیے مسلسل غزلوں سے بھی کام لیا ہے، مگر غزل مربوط اور مسلسل خیالات کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے حالی اور اقبال نے دوسری اصنافِ سخن یعنی مثنوی، قطعہ، ترکیب بند وغیرہ سے کام لیا ہے۔ جوشؔ کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اب وہ نظم کا شاعر ہے۔ اس کی بعض خاص نظمیں زندہ رہنے والی

ہیں۔ اس کا میلان اشتراکیت کی طرف ہے مگر عمل کچھ اور کہتا ہے۔
سیماب بہت پرگو شاعر ہے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ فن کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اس کے کلام میں ایسے جذبات و احساسات نہیں پائے جاتے جو دل پر اثر کریں قریب قریب یہی کیفیت علی اختر کی ہے۔
خالص غزل گویوں کا زمانہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر تک رہا۔ اس کے بعد نئے شاعروں کی آمد ہوئی جو نظمیں لکھتے ہیں، مگر غزل نے ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ اس زمانے میں اسے اور فروغ ہوا اور مشاعروں نے اسے اور رونق بخشی۔ طرحی مشاعروں کی بجائے غیر طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ مشاعرہ غزل ہی کی خاطر بنا تھا اور غزل ہی مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی، اب غزل کے ساتھ نظمیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ نئے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعوں سے ان کی سیری نہیں ہوتی۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش، روش صدیقی کا شمار انہیں شعرا میں ہے۔ انہوں نے مختلف قومی، سماجی اور ملکی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اختر شیرانی اپنے وقت میں رومانیت کا امام تھا۔ اس کی شاعری میں ترنم، نغمگی، شادابی اور شدید عاشقانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ سانیٹ (sonnet) کو اُردو میں شیرانی ہی نے رواج دیا۔
جدید ترین شاعروں میں فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین ترقی پسند ہیں۔ ان کے ہاں رومان و حقیقت یا رومان و سیاست باہم مل جاتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان کے ہاں اشاریت اور ابہام پایا جاتا ہے، جنسی لذت کی طرف میلان بڑھا ہوا ہے جو بعض اوقات عریانی کی حدود میں بھی جا پہنچتا ہے۔
فراق کی غزل میں بھی نئے دور کا احساس موجود ہے اس نے بھی غزل میں وسعت پیدا کی ہے۔ وہ اس کی سماجی، سیاسی اور عمرانی تجربات ہیں، جس سے اس کی غزل میں تنوع ہو گیا ہے۔ وہ حسن و عشق کی کیفیات کو حقیقی رنگ میں بیان کرتا ہے اور دیکھ کر ہی نہیں چھو کر بھی لذت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مزاج میں رومانیت ہے جس نے غزل میں خاص شان پیدا کر دی ہے۔ اس کی غزلوں میں فلسفیانہ رجحان بھی ہے مگر وہ اس دنیا اور مادی حیات سے آگے نہیں جاتا۔

کچھ شاعر اور بھی ہیں جن کا کلام منظرِ عام پر آیا ہے، مثلاً قیوم نظر، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیارپوری، مجروح، اختر ہوشیارپوری، عدم، سلام مچھلی شہری، ناصر کاظمی، فضلی، مسعود حسین خاں، ابنِ انشا، وغیرہ۔ نئے شاعروں میں دو چار کے سوا ابھی اوروں نے اپنا مقام حاصل نہیں کیا۔ کچھ ابھی سے تھک گئے ہیں اور ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں رہی۔ کچھ ایسے ہیں جن کی شہرت فی الحال ان کی صرف دو چار غزلوں یا نظموں پر ہے، اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے ابھی ابھی اس کوچے میں قدم رکھا ہے وقت اس کا فیصلہ کرے گا کہ کون کس رتبے کا ہے۔

اس زمانے میں شعرائے نئے نئے تجربے بھی کیے ہیں، مثلاً غیر مقفیٰ اور آزاد نظم۔ راشد، میراجی اور ڈاکٹر خالد وغیرہ نے کچھ نظمیں اس قسم کی لکھی ہیں۔ اس سے قبل پرانے شاعروں میں مولوی محمد اسمٰعیل، مولانا طبا طبائی، مولانا شرر، پنڈت کیفی دہلوی نے بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن یہ طرز مقبول نہ ہوا۔ اس کے لیے بڑی قادرالکلامی اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے تاکہ قافیے اور ردیف سے جو ترنم اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو وہ اپنے اسلوبِ بیان کے حسن اور الفاظ اور حروف کی صورت و ترتیب سے پورا کر سکے لیکن اس سے ہم بے اعتنائی نہیں کر سکتے۔ جب ہماری زبان میں ڈرامے، رزمیہ نظمیں یا اسی قسم کے موضوعات پر لکھنے کی نوبت آئے گی تو یہ طرز اختیار کرنا پڑے گا۔

ہمارے قدیم شعرا میں محبوب کا تصور خیالی تھا۔ نئے شاعروں میں یہ تصور زیادہ تر حقیقی اور مادی ہے۔ ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بہت سے ایسے ہیں جن پر فرائڈ اور مارکس کے نظریوں کا اثر ہے۔ ایک کا تعلق نفسیات سے ہے اور دوسرے کا سیاسیات سے۔ ان نظریوں سے بلا شبہ ہمارے ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ نفسیات نے اندرونی کیفیات کے تجزیے میں مدد دی اور اشتراکیت نے فرد اور سوسائٹی کے امتیاز اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھایا لیکن جن ادیبوں نے ان نظریوں کو تنقیدی نظر سے نہیں پرکھا وہ غلط راستے پر جا پڑے۔ ایک تحت الشعور کے فلسفے میں گم ہو کر لذت پرستی کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا، دوسرا بغیر یہ سمجھے کہ وہ کس ماحول اور کس سوسائٹی میں ہے، بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔

۴

ہر زبان کے ادب میں اوّل قدم گیت نظم یا شعر کا ہے، نثر بہت بعد کی چیز ہے۔ اُردو زبان کا آغاز بھی اسی منہج سے ہوا نظم کی طرح نثر کا ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ اُردو نثر کی سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت میں گزشتہ اوراق میں لکھ چکا ہوں۔ اس سے قطع نظر کی جائے تو سب سے قدیم نثر ہمیں میراں جی شمس العشاق کی ملتی ہے۔ آپ کا مختصر رسالہ ہے جس کا نام "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دس باب ہیں جن میں شریعت اور طریقت کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس نثر کا یہ نمونہ ہے:

"خدا کیا تحقیق ماں اور بینگڑے (اولاد) تمھارے دشمن ہیں چھوڑ ریو پشتمان کون ـــ اے کیسا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تھی (سے) تجھے بسرا کر۔"

دکھنی نثر کی دوسری کتاب "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرح شرح تمہید" ہے۔ یہ "تمہیدات عین القضاۃ" کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاہ میراں (شاہ میراں حسینی یا میراں جی خدا نما) امین الدین اعلیٰ کے مرید اور ساکن بلدۂ حیدر آباد دکن ہیں۔ ان کا سن وفات ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء ہے۔ کتاب کی زبان ٹھیٹ دکنی اردو ہے لیکن صاف ہے مغلق نہیں۔ کتاب میں تصوف کے مسائل، مسائلِ شرعیہ، عقائد اور قرآن کی بعض آیات کے باطنی معانی بیان کیے ہیں۔ میرے کتب خانے میں اس کے تین نسخے ہیں۔ سب سے قدیم نسخے میں سنِ کتابت ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء لکھا ہے۔ اس حساب سے یہ اردو دکنی کی بہت قدیم کتاب ہے۔

میراں جی شمس العشاق کے فرزند و خلیفہ برہان الدین جانمؒ کا ایک رسالہ خاصا بڑا "کلمۃ الحقائق" دکنی اُردو میں ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابیں اگرچہ اُردو نثر کی قدیم ترین کتابیں ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ادبی نظر سے ان کا درجہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ جو کتاب اس بلند مرتبے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ

ملّا وجہی کی کتاب "سب رس" ہے جو ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں حسن و عشق کی عالمگیر حقیقت کو مجازی صورت کے قصّے کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور دونوں کو میدانِ کارزار میں لاکر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر دیا ہے۔ پوری کتاب مقفّیٰ عبارت میں ہے باوجود قافیے کی پابندی کے اسلوبِ بیان صاف، شگفتہ اور رواں ہے۔ زبان چونکہ پرانی ہے بعض الفاظ اور محاوروں کے سمجھنے میں اُلجھن ہوتی ہے اُردو ادب میں یہ کتاب خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وجہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی زبان کو "زبانِ ہندوستان" لکھا ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰؒ نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، نثر میں بھی بعض رسالے لکھے ہیں۔ ان میں ایک "گفتارِ شاہ امین" ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ دوسرا مختصر رسالہ "گنجِ مخفی" کے نام کا ہے اس میں شاہد و شہود کی بحث ہے۔

اسی عہد کی ایک کتاب "شمائل الاتقیا" ہے جو ترجمہ ہے، اسی نام کی ایک کتاب کا جس کے مصنف رکن عماد الدین دبیر معتوی و مرید برہان الدین غریب ہیں۔ مترجم کا نام میران یعقوب ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے ۱۰۷۸ھ ۱۶۶۷ء میں شروع کیا اور کئی سال میں ختم ہوا۔ کتاب کا موضوع تصوف و طریقت کے مسائل میں خاصی ضخیم کتاب ہے۔ عبارت سادہ ہے۔ میرے نسخے میں سن کتابت ۱۱۰۵ھ ۱۶۹۳ء ہے۔

میر حسن نے اپنے "تذکرۂ شعرائے اُردو" میں لکھا ہے کہ "میر محمد حسین المتخلص بہ کلیم جوان محمد شاہی نے فصوص الحکم کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا اور ایک کتاب "نثرِ ہندی" میں بھی لکھی تھی جس کے دو ایک جملے بطور نمونہ تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ یہ جملے بہت اچھی صاف اُردو میں ہیں تذکرہ ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء اور ۱۱۹۲ھ ۱۷۷۸ء کے درمیان کسی سن میں لکھا گیا ہے۔ اس وقت کلیم کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دو کتابیں اُردو نثر کی پہلی کتابیں ہیں مگر نایاب ہیں۔ اب تک ان کا کہیں پتا نہیں لگا۔

دوسری کتاب "نوطرزِ مرصع" ہے جس کے مصنف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین ہیں۔ یہ بہت اچھے خوش نویس تھے اس بنا پر ان کا خطاب "مرصع رقم" تھا۔ اس کتاب کی تکمیل مصنف نے وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ (نواب اودھ) کے سایۂ عاطفت میں کی، اور ان کے حضور میں پیش کرنا چاہتے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات

کے بعد یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی ۱۱۸۹ھ م ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ یہ وہی قصہ ہے جسے میرامن باغ و بہار یا قصۂ "چہار درویش" کے نام سے لکھ چکے ہیں۔ "نو طرز مرصع" کی عبارت، رنگین اور تشبیہات و استعارات سے مملو ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گویوں کا طرز اختیار کیا ہے۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ (۱۱۶۱ تا ۱۲۳۳ھم ۱۷۵۰ء تا ۱۸۰۸ء) اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادرؒ (۱۱۶۷ھم ۱۷۵۳ء تا ۱۲۴۲ھم ۱۸۲۶ء) نے قرآن مجید کے ترجمے اُردو میں کیے، لیکن یہ ترجمے بالکل لفظی ہیں۔ عبارت کا تسلسل اُردو بول چال کے مطابق نہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ کو ترجمے میں ۱۸ سال لگے اور ۱۲۰۵ھم ۱۷۹۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ اس زمانے میں حکیم شریف خاں دہلی نے شاہ عالم بادشاہ کی فرمائش پر قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے خاندان میں حکیم محمد احمد کے قبضے میں تھا۔ ترجمے کے آخر میں کاتب نے روز جمعہ ۹، ذیقعدہ لکھا ہے، حساب کرنے سے اس کا سن ۱۲۰۸ھم ۱۷۹۴ء برآمد ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے ترجمے کی زبان زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں سختی نہیں برتی گئی، اگرچہ شاہ صاحب کے ترجمے کی سی ادبی خوبیاں کسی دوسرے ترجمے میں نہیں۔ حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں ہوا۔

جدید اُردو نثر کی بنیاد دراصل ولیم کالج کلکتہ میں پڑی۔ یہ کالج لارڈ ولزلی نے ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو قائم کیا۔ اس کا مقصد اُن نو عمر انگریزوں کو تعلیم دینا تھا جو انگلستان سے ہندوستان بھیجے جاتے تھے، چونکہ آگے چل کر ان کا تقرر ذمہ دار عہدوں پر ہوتا تھا، اس لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا کہ وہ اہلِ ملک کی زبان اور اہلِ ملک کے خیالات اور رسم و رواج اور آئین و قوانین سے واقف ہو جائیں۔ اس ضمن میں کالج نے ہندوستانی زبان یعنی اُردو کی بڑی خدمت کی۔ اردو میں سادہ اور روزمرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا اور مقفیٰ اور مسجع عبارت ترک کر دی گئی۔ پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں، جن میں کچھ ترجمے، کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات، صرف و نحو اور مذہب پر مشتمل تھے۔ کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے، ایک تو روزمرہ کی زبان کو سلاست اور صفائی کے ساتھ لکھنا سکھایا، دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز کی کتابیں لکھنے کی کوشش کی۔ اس

میں کالج کے ڈائرکٹر جان گلکرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک اور اچھا کام کالج نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اس میں چھپنے لگیں۔

کالج کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں خصوصاً میرامن کی "باغ و بہار" زبان کی فصاحت وسلاست اور بے تکلف طرزِ بیان کی وجہ سے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میرامّن کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور ہر موقع پر اس کی مناسبت سے صحیح اور ٹھیٹ لفظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ اس خوبی سے کھینچتا ہے کہ اس کے کمالِ انشاپردازی کی داد دینی پڑتی ہے۔ میرامن کے علاوہ میر شیر علی افسوس بھی کالج میں ملازم تھے۔ ان کی کتاب "آرائشِ محفل" جو سجان رائے کی "خلاصۃ التواریخ" سے ماخوذ ہے بہت مشہور ہے۔ افسوس نے سعدی کی گلستان کا ترجمہ "باغِ اردو" کے نام سے کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے "طوطا کہانی" لکھی، جو محمد قادری کے فارسی "طوطی نامہ" کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ "آرائشِ محفل" (قصہ حاتم طائی) "گلِ مغفرت" وغیرہ کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کے قصے کو نثر میں بیان کیا ہے جس کا نام "نثرِ بے نظیر" ہے۔ مظہر علی خاں ولا نے ہندی سے "بیتال پچیسی" کا اُردو میں ترجمہ کیا اور "اتالیق ہندی" وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔ مرزا جان طپش کا بھی کالج سے تعلق رہا۔ ان کی کتاب "شمس البیان فی اصطلاحاتِ ہندستان" قابلِ ذکر ہے۔ طپش نے "بہارِ دانش" نام کا ایک منظوم عاشقانہ قصہ بھی لکھا ہے۔ وہ صاحبِ دیوان ہیں۔ کاظم علی جوان نے "شکنتلا" ناٹک، کا اور شیخ حفیظ الدین احمد نے "خرد افروز" کے نام سے "عیارِ دانش" کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ خلیل خاں اشک، نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں وغیرہ اور کئی اشخاص کالج سے متعلق تھے۔ گلکرسٹ نے لغت اور صرف و نحو پر کتابیں لکھیں۔

ایک اور ادارہ جس نے اُردو زبان اور اس وقت کے نظامِ تعلیم میں انقلاب پیدا کیا وہ مرحوم دہلی کالج تھا۔ اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں: ایک یہ کہ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے مشرق و مغرب کے علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا۔ اس کالج سے ایسے روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری

زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا، تمام مغربی علوم اُردو کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک مجلسِ ترجمہ (ٹرانسلیشن سوسائٹی) تھی جو کالج کے طلبا کے لیے انگریزی سے اُردو میں درسی کتابوں کے ترجمے یا تالیف کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کی مطبوعات کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے جو تاریخ' جغرافیہ' اصولِ قانون' ریاضیات' اور اس کی متعلقہ شاخوں، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جرّاحی' نباتیات' عضویات' معاشیات' وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل تھیں۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا تو یہ کالج ہماری زبان و ادب کی عظیم الشان خدمت انجام دیتا۔

فورٹ ولیم کالج نے بلاشبہ سادہ اردو لکھنی سکھائی مگر اس کی تقریباً سب کتابیں قصص و حکایات کے ترجمے ہیں۔ دہلی کالج میں کالج کی جماعتوں کے درس کے لیے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں جس کا مقصد طلبہ کو مغربی علوم سے روشناس کرنا تھا۔ یہ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ تا ۱۸۹۸ء) تھے جنھوں نے سنجیدہ اور علمی مضامین سادہ اور بے ساختہ زبان میں ادا کرنے کا ڈھنگ ڈالا۔ ان کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ استدلال اور عقلیت کی پختگی ہے وہ ابہام سے بہت بچتے ہیں اور بعض اوقات اپنے خیال کو دل نشین کرانے کے لیے اس قدر سادگی اور وضاحت سے کام لیتے ہیں کہ عبارت بے رنگ ہو جاتی ہے لیکن ان کے کلام میں اثر ہے جو سادگیٔ بیان اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

اگرچہ سر سیّد کا شمار ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریروں کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جس میں خوش بیانی' مزاح اور ادبیت کا دل آویز رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" نے اُردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب خیالات ہی میں نہیں ادائے خیالات کے طرز میں بھی تھا۔ یہ نثر نگاری قدیم نثر نگاری سے جدا تھی جس کا لازمی جز تصنع اور آرائش تھی۔ سرسید کے بقول "جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی' اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا کرنے میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہے وہی دوسروں کے دل میں پڑے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے" یہ نثر نگاری کا کمال ہے۔

اس نوبت پر ہم مرزا غالب کے رقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے' جو زبان کی فصاحت

اور سلاست، بے ساختگی، مزاح وظرافت اور دلکش انداز کا بے مثال نمونہ ہیں۔ ان کی مقبولیت ہمارے ادب میں کبھی کم نہ ہوگی۔

وہ بزرگ جن کو جدید اردو نثر نگاری میں استادی کا مرتبہ حاصل ہے اور جن کی تصانیف ہمارے ادب میں "کلاسکس" کا درجہ رکھتی ہیں وہ یا تو وہ تھے جو سرسید احمد خاں کے زیر اثر آ گئے تھے یا وہ جن کی تعلیم قدیم دہلی کالج میں ہوئی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ زبان کے محقق اور مسجع نثر کے اُستاد تھے اور باوجود اس کے کہ وہ بعض اوقات تکلف اور کہیں کہیں تصنّع سے کام لیتے ہیں، وہ اُردو نثر کے ایسے صاحب طرز ہیں کہ جس کی مثال نہیں۔ ان کی زبان میں غضب کی سادگی، شیرینی اور لطافت ہے۔ اُن کا سحر نگار قلم واقعات و حالات کا بیان ایسے پُرمعنی سبک اور لطیف الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ان کی تصنیف "آبِ حیات" میں جو باوجود بعض فنی اور تاریخی نقائص کے اُردو میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، یہ کمال خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں انھوں نے شعرا کی سیرت اور زندگی کے حالات اس خوبی سے بیان کیے ہیں کہ ان کی زندہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں یعنی "نیرنگِ خیال"، "دربارِ اکبری" اور "قصصِ ہند" حصہ دوم پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ نقاد نہیں اگرچہ انہوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی۔ وہ اس کے اہل نہ تھے۔ ان کی تنقید پرانے تذکرہ نویسوں کی طرح بیان و بدیع کے عیوب و محاسن اور مبہم الفاظ میں ایک قسم کی تقریظ یا تنقیص ہوتی ہے۔ ان کی رائیں ایک طرح کی روائتیں ہیں جو بزرگوں سے سنی ہیں، یا سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ ان کی نثر بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں۔

حالی نے جس طرح اردو شاعری میں انقلاب پیدا کرکے صحیح رستے کی طرف رہنمائی کی، اسی طرح اردو نثر پر بھی ان کا کم احسان نہیں۔ نثر ہماری زبانوں (یعنی اردو فارسی عربی) میں ایک قسم کی نیم شاعری تھی، یعنی رنگین مسجع یا مقفیٰ عبارت، تشبیہوں، استعاروں اور مبالغے سے لدی، خیال کم اور لفظوں کی بھرمار، ایک معنی کے لیے کئی کئی مترادف الفاظ۔ جیسے صحیح نثر کہنا چاہیئے اُس کی ابتدا اگرچہ سرسید سے ہوئی لیکن حالی نے اس کی بنیادیں مضبوط کیں اور اسے سنوارا۔

حالی کی نثر دلچسپ ہے، سادہ اور متین ہوتی ہے۔ متین سے میری مراد ایسی نثر ہے جس میں جان اور قوت ہو۔ حالی کے مزاج اور کلام میں اعتدال اور قدیم اساتذہ کا سا ضبط ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے، عقلیت اور استدلال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ رنگین عبارت جو تشبیہہ اور استعارے سے مملو ہوتی ہے ذہن کو اصل موضوع سے ہٹا کر لفظی صنائع اور آرائش کی طرف لے جاتی ہے اور اصل مضمون کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ان کی نثر میں الفاظ اور خیالات ایسے یک جان ہو جاتے ہیں کہ اس سے معنی میں روشنی اور کلام میں قوت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر کی ایک اور خصوصیت ایجاز ہے۔ پھیلاؤ سے کلام میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، وہ لفظ کے برتنے سے شناس ہیں۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر کرتا ہے۔ حالی جملوں کا کام لفظوں سے لیتے ہیں۔ وہ جملے میں ایسا برمحل لفظ بڑھا دیتے ہیں کہ سارا خیال چمک اٹھتا ہے۔

جدید سوانح نگاری کی بنیاد بھی حالی نے ڈالی۔ اس میں پہلی کتاب جو ان کے قلم سے نکلی وہ حیاتِ سعدی ہے۔ سعدی کی حیات پر فارسی اردو میں کوئی سامان نہ تھا صرف شیخ کے کلام کے مطالعے سے شہد کی مکھی کی طرح ذرہ ذرہ چن کر سعدی کی سیرت اور اخلاق اور حالات کو مرتب کیا۔ کلام پر مفصل تبصرہ اور اس کے محاسن اور ادبی نکات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

حالی کی "یادگارِ غالب" اردو کے عالی مرتبہ شاعر پر پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ اس کے بعد غالب پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن "یادگارِ غالب" کو پڑھ کر غالب کی عادات و اخلاق، اس کی سیرت اور شخصیت کا جو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے دوسری کتابیں اس سے قاصر ہیں۔ "یادگارِ غالب" نے پہلی مرتبہ غالب کی قدر و منزلت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی اور اس کی سیرت اور کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور نکات کو اس انداز سے بیان کیا کہ غالب کی شخصیت، انسان اور شاعر کی حیثیت سے اس رتبے کو پہنچ گئی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ "یادگارِ غالب" نے غالب کو زندہ جاوید کر دیا ہے —

تیسری کتاب اس موضوع پر "حیاتِ جاوید" ہے۔ تحریر حالی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں صرف سر سید احمد خاں کی سیرت اور ان کے حالات اور کارناموں ہی کا ذکر نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت اور

تعلیم، مذہب، سیاست، زبان، نئی تحریکیں اور ان کے اثرات و نتائج، سب ہی کچھ آگیا ہے۔
یہ زمانہ بہت انقلاب انگیز تھا۔ مسلمانوں کی حالت نہایت پست اور درماندہ ہوگئی تھی۔ ان کی
اصلاح کے لیے سرسید کی مساعی اور جد و جہد، مخالفوں کی یورش، حکومت کی بے التفاتی اور
سرد مہری، آپس کے تنازعات یہ سب حالات بہت دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔ ایک ایسے
شخص کے حالات کا لکھنا جو ہر طرف سے نرغے میں گھرا ہوا تھا جو اپنی قوم کے لیے اپنوں اور
غیروں سے مجاہدانہ لڑ رہا تھا اور جس کی اصلاح کا موضوع کوئی ایک نہ تھا، بلکہ تعلیم، معاشرت، زبان،
مذہب، سیاست سب ہی میں اسے کام کرنا اور دخل دینا پڑتا تھا، حالی ہی کا کام تھا۔ ہماری
زبان میں یہ سوانح عمری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی اس کتاب کا پلہ نہایت بلند ہے۔

اُردو میں جدید تنقید کی ابتدا بھی حالی سے ہوئی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کی ماہیت،
حیات و سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے بعض اہم مسائل، اُردو کے اصنافِ شعری
اور ان کے عیوب و محاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے۔ خاص کر نیچرل شاعری
پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی تنقید نگاری کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کی خوبی کے لیے جن
شرائط کو حالی نے لازم قرار دیا ہے اُن پر خود بھی عمل کیا۔ تنقید پر یہ پہلی کتاب ہے اور اس موضوع
پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ ادبی تنقید میں حالی کا درجہ امام کا ہے۔ ان کی تنقید
نے اُردو کے ذوقِ سخن کو بدل دیا۔

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) نے قدیم دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اردو ادب
میں ان کا خاص درجہ ہے۔ یہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے جدید طرز پر اردو میں ناول
لکھے۔ یہ ناول مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے پیش نظر لکھے گئے ہیں۔ ان کا پہلا
ناول "مراۃ العروس" ہے۔ اس کا مقصد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس میں اوسط درجے کے
شریف خاندان کی روزمرہ زندگی کا نقشہ ہے۔ جب یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی تو بہت مقبول
ہوئی اور اصغری اور اکبری کے نام سگھڑاپے اور پھوہڑپن میں ضرب المثل ہوگئے۔ ایک بڑی
خوبی اس میں (اور ان کے اکثر دوسرے ناولوں میں) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے
خیالات کو ہوبہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ عورتیں بھی قائل ہوگئیں۔ ان کا دوسرا ناول "بنات النعش"

اس کا گویا دوسرا حصہ ہے۔" توبۃ النصوح" کا موضوع ایک خاندان کی دینی اصلاح ہے۔" محصنات" میں دو بیویاں کرنے کے مضر اثرات کو بتایا ہے۔" ابن الوقت" میں انگریزوں اور انگریزی معاشرت کی بے جا تقلید کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ان ناولوں کا مقابلہ آج کل کے ترقی یافتہ ناولوں سے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پہلی کوشش تھی اور ان میں سے اکثر ناول بہت مقبول ہیں۔ان میں ایک عیب یہ ہے کہ قصّے کے دوران میں بعض وقت طویل وعظ شروع کر دیتے ہیں جو کبھی کبھی تو مزاح وظرافت کی بدولت جو مولانا کی فطرت میں تھی یا قصّے کی مناسبت سے نبھ جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کا پڑھنا اجیرن ہو جاتا ہے۔ ان ناولوں میں اس وقت کے اوسط درجے کے مسلمان شرفا کی خانگی زندگی کا نقشہ بہت خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ بعض کرداروں کی نگارش میں کمال کیا ہے۔وہ زندہ اور جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔" مراۃ العروس" میں اصغری، اکبری اور" توبۃ النصوح" میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کیرکٹر بہت پُرلطف اور بے مثل ہے اور کلیم کا کردار تو اس قصّے کی جان ہے۔ان ناولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو زندگی سے کس قدر دلچسپی تھی اور انھوں نے اپنے وقت کی اسلامی سوسائٹی اور اسلامی خاندانوں کی معاشرت اور ان کی نفسیات کو کس قدر گہری نظر سے دیکھا ہے، جس کا ایسا سچا نقشہ کھینچا ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اُردو میں ترجمہ ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان کی سلاست وفصاحت کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قائم رہے۔اس کے علاوہ ان کی ایک ضخیم تصنیف" الحقوق والفرائض" ہے۔ یہ کتاب ارکانِ اسلام، احکامِ قرآن، اسلامی آداب واخلاق اور شرعی معلومات کی چھوٹی موٹی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ان کے سوا اور بھی مختلف موضوع پر ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔

مولانا جیسے اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشاپرداز تھے، ویسے ہی زبردست مُقرر بھی تھے زبان پر ان کو حیرت انگیز قدرت تھی۔ ان کے قلم میں بڑا زور تھا۔مشکل سے مشکل مطالب کو وہ ایسے خاص طرز میں آسانی سے ادا کر دیتے تھے۔ان کی تحریر میں بلا کی آمد تھی، مگر طبیعت میں ضبط نہ تھا اس لیے بعض وقت ان کا بیان عامیانہ رنگ اختیار کر لیتا تھا۔

مولانا شبلی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) ان لوگوں میں جو سرسیّد احمد خاں کے اثر اور فیض صحبت

کی بدولت محدود دائرے سے نکل کر علم و ادب کے وسیع میدان میں آئے۔ انہوں نے اردو زبان میں اسلامی تاریخ کا صحیح ذوق پھیلایا۔ تاریخ میں انہوں نے "ہیروز آف اسلام" کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کی ابتدا "المامون" سے ہوئی۔ اس سلسلے میں متعدد نامور اسلاف کے سوانح آگئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور اور مقبول کتاب "الفاروق" ہے۔ ان کی آخری تصنیف جسے ان کا شاہکار سمجھنا چاہیئے "سیرت نبوی" ہے جو ان کے انتقال کی وجہ سے ناتمام رہ گئی اور بعد میں ان کے فاضل شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی۔ اگرچہ وہ یورپی مورخین اور ان کے طرز تاریخ نویسی کے بہت شاکی ہیں اور سخت مذمت کرتے ہیں لیکن انہوں نے یورپی طرز تحقیق سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ انہوں نے بے شمار تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں جن سے اس برعظیم کے اردو دان طبقے اور خاص کر مسلمانوں میں تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا شوق پیدا ہوگیا۔

شبلی شاعر بھی ہیں اور شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ بڑے سخن سنج اور سخن فہم ہیں۔ حالی کے بعد تنقید نگاری میں انہیں کا نام آتا ہے۔ وہ اس باب میں حالی سے بہت متاثر ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" بہت مشہور ہے۔ شروع میں جو اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کی ہے وہ ناقص ہے۔ وہ مرثیے کی ابتدا سودا سے کرتے ہیں قدیم اردو مرثیے کا انہیں علم نہیں، لیکن سودا کے بعد اردو مرثیے میں جو ترقی ہوئی ہے اسے خوب بیان کیا ہے۔ تاریخی بحث کے بعد فصاحت، بلاغت، واقعیت اور نفسیات، انسانی جذبات، مناظر قدرت، واقعہ نگاری کے مختلف عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر ایک کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اپنی تائید میں میر انیس کے کلام سے منتخب اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان بیانات کے بعد انیس کی شاعری کو رزمیہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں معرکۂ کارزار، لڑائی کے داؤ پیچ، فقاروں کی گونج پہلوانوں کی مبارز طلبی، تلواروں اور نیزوں کے کرتب دکھائے گئے ہیں لیکن یہ صرف رزمیہ شاعری کی جھلک ہے۔ اردو میں حقیقی رزمیہ شاعری صرف قدیم اردو میں پائی جاتی ہے۔ انیس کی شاعری کے محاسن دکھانے کے بعد آخر میں دبیر سے مقابلہ کیا گیا ہے اور ہم مضمون اشعار یا بند نقل کرکے انیس

کے کلام کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

شبلی کی ایک اور مشہور اور مقبول تصنیف "شعرالعجم" ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں انہوں نے اس امر پر بحث کی ہے کہ شاعری کیا چیز ہے اور اس کے تحت وہ احساس، ادراک، محاکات، تخئیل وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ شاعری پر یہ بحث جامع اور قابلِ قدر ہے۔ شبلی نے حالی کے بعد تنقید کے سلسلے کو قائم رکھا، اگرچہ وہ اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

آزاد، حالی، شبلی انگریزی نہیں جانتے تھے، انگریزی ادب کے متعلق کچھ موٹی موٹی باتیں سُن رکھی تھیں۔ اپنی ذہانت اور ذوق کے بل پر انہوں نے اردو ادب کو حقیقت کی راہ دکھائی اور تنقید کا نیا ڈول ڈالا اور اردو ادب کی انہوں نے وہ عظیم الشان خدمت کی جو انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہ کر سکے۔

جدید تنقید نگاروں میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ شروع شروع میں بعض نے جو کچھ لکھا وہ اخذ و ترجمہ اور نقل کی حد سے آگے نہ بڑھا لیکن بعد کے لکھنے والوں نے تنقید کے فن کو ترقی دی اور مغرب کے اثر سے تنقید کے کئی مذہب بن گئے۔ بعض تاثراتی ہیں جن پر رومانیت اور جذباتیت کا غلبہ ہے، بعض انتہا پسند ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تنقید میں اعتدال ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے مغربی زبانوں اور ادب سے پورا استفادہ کیا، مگر انہوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد اور بعض دیگر مغرب زدہ حضرات کی طرح اپنے ادب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے ادب اور روایات کی برتری کو دکھایا ہے۔ غالب پر ان کی تنقید اس کی شاہد ہے، اگرچہ اس میں بعض جگہ جذباتیت سے مغلوب ہو کر وہ بہت دور نکل جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری اور فراق گورکھپوری کی تنقید بھی جذباتیت اور رومانیت سے تعلق رکھتی ہے۔ نیاز کی تنقید بالکل وجدان اور ذوق پر ہے اور اس سے وہ اس قدر مغلوب ہیں کہ عقل و شعور کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ فراق بھی وجدان و ذوق کے قائل ہیں، وہ شاعر یا ادیب کے کلام میں ڈوب کر تنقید لکھتے ہیں اور پورے جوش کے ساتھ کیف آور اور پراثر الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تخلیقی رنگ جھلکتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی ابتدائی تنقیدیں تاثراتی ہیں مگر بعد میں وہ مارکسی نظریے کی طرف جھکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں

گہرے مطالعے پر مبنی ہیں۔
مغرب ہی کے اثر سے ایک جماعت ترقی پسند مصنفین کی وجود میں آئی۔ ان کی تنقید کی
بنیاد مارکسی خیالات پر ہے۔ وہ زندگی اور ادب اور اس کے تمام شعبوں کو ایک ہی نظر سے
دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے تنقید کی ایک نئی راہ نکالی اور تنقید کو آگے
بڑھایا، لیکن ان کی تنقیدات بنیاداً مادی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں۔ وہ وجدانی، روحانی، الہامی، ماورائی اور
مابعد الطبیعاتی نظریوں کے قائل نہیں۔ سجاد ظہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین وغیرہ اسی جماعت
سے تعلق رکھتے ہیں۔

کچھ اور نقاد ہیں جو نہ زیادہ مغرب زدہ ہیں نہ اشتراکی اور نہ مارکسی نظریے سے مغلوب۔
انہوں نے مغرب کے اثر میں آکر مشرقی اصول اور تنقید کو ترک نہیں کیا۔ اُن کی تنقید میں توازن
اور اعتدال ہے، انتہاپسندی نہیں۔ اس جماعت میں ممتاز نام آل احمد سرور کا ہے۔ اُن کی تنقید
حالی کی پیروی میں ہے۔ صلاح الدین احمد اور وقار عظیم بھی اسی قسم کے نقاد ہیں۔ ڈاکٹر عبادت
بریلوی کی تنقید میں توازن ہے، اگرچہ وہ مغربی تنقید کے قائل اور ان کے اصولوں پر عامل ہیں
مگر وہ مشرقی روایات سے منحرف نہیں۔ کلیم الدین احمد کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے۔ انہوں نے
مغربی ادب کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے، لیکن وہ مغرب کے اثر سے اس قدر مغلوب ہیں کہ
بعض اوقات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی رائے بے رو و
رعایت بڑی آزادی و بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "اردو تنقید پر نظر" نے یہ تو کیا کہ
ہمارے ادیبوں کو چونکا دیا اور وہ اپنے کاموں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کی تنقید
یک طرفہ ہے۔ پروفیسر احسن فاروقی بھی اپنے خیالات میں پروفیسر کلیم الدین سے ملتے جلتے ہیں
لیکن وہ اتنے انتہا پسند نہیں۔ انہوں نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ بڑے غور سے کیا ہے
اور اس کا ان پر بہت اثر ہے۔ وہ تنقید میں صحیح اصول سے کام لیتے ہیں اور بے لاگ رائے
دیتے ہیں۔

جدید سوانح نگاری اور تنقید کی طرح ناول اور مختصر افسانے کا رواج بھی مغربی اثر کا نتیجہ
ہے۔ مولوی نذیر احمد اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، دوسرے

ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء-۱۹۰۲ء) ہیں۔ یہ بالکل دوسرے رنگ کے شخص ہیں۔ مولوی نذیر احمد جس قدر سنجیدہ ہیں، یہ اُسی قدر آزاد اور رنگین مزاج ہیں۔ ان کا مشہور ناول "فسانۂ آزاد" ہے جو بہت ضخیم ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بہت بے ڈھنگا اور بے ربط ہے بہت سے اجزا زبردستی داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اکثر واقعات غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر اُن کی نظر وسیع ہے، خاص کر لکھنؤ کی سوسائٹی کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ نوابی درباروں، خاص خاص تہواروں، رسوم و رواج، شادی بیاہ کے ہنگاموں، ناچ رنگ کے جلسوں، بازاروں کی چہل پہل، سرائے کی بھٹیاریوں، چانڈو بازوں، افیونیوں، بانکوں، شہدوں، طوائفوں کے حالات بڑے مزے سے بیان کرتے ہیں بیگمات کی زبان پر بڑی قدرت ہے۔ اس ناول کا مشہور مضحک کردار خوجی ہے جو ہمارے ادب میں بطور ضرب المثل کے ہو گیا ہے۔ باوجود نقائص اور خامیوں کے یہ کتاب اردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہے۔

نذیر احمد اور سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر کا نمبر آتا ہے۔ ہماری زبان میں ناول کا نام انہیں کی کتابوں کی بدولت مشہور ہوا۔ شرر مورخ ہیں۔ ان کے اکثر ناول تاریخی ہیں۔ ان کے ناولوں سے لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا شوق ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ اسلامی حمیت اور جوش بھی نمودار ہوا۔ شرر کو قصہ کہنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ پلاٹ بنانا اور سنوارنا بھی جانتے ہیں لیکن حقیقت نگاری میں بیٹھے ہیں۔ اُن کے ناولوں کے تاریخی ہیرو تاریخ کے نامور اور زندہ اشخاص ہیں لیکن وہ ان ناولوں میں بے جان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ہیرو کے مقابلے میں بعض اوقات اس قدر غلو کرتے ہیں کہ غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں میں "فردوس بریں" ایک کامل ناول ہے۔ اس میں کردار نگاری اور مرقع کشی میں شرر نے کمال دکھایا ہے۔ شیخ جودی اور حسین کے کردار اور ان کے مکالمے بہت خوب ہیں اور زندہ رہنے والے ہیں۔ وہ بہت پُر نویس اور زود نویس تھے اس لیے خامیوں کا ہونا لازم ہے۔ باوجود خامیوں کے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہماری زبان میں تاریخی ناول نگاری کے بانی تھے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ان کا نام باقی رہے گا۔

مرزا ہادی رسوا ذی علم اور صاحب ذوق شخص تھے۔ اُن کا ناول "امراؤ جان" اردو ادب

وہ کردار نگاری، رُوداد (پلاٹ) کی ترتیب
میں ایک خاص اور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔
افراط و تفریط کے عیب سے بری ہے۔
کے اعتبار سے بہت متوازن اور مربوط ہے۔
امراؤ جان کا کردار زندہ کردار ہے۔ یہ سارا قصہ بہت
حقیقت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

اچھی ستھری زبان میں ہے۔

مولانا راشد الخیری نے بہت سے ناول عورتوں کی اصلاح و بہبود کے لیے لکھے ہیں۔
اس میں انہوں نے اپنے پھوپا مولوی نذیر احمد کی پیروی کی ہے عورتوں کی زبان اور ان کی
سیرت بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں غم و الم اور درد انگیزی کی نگارش میں کمال رکھتے ہیں۔ اسی
لیے "مصورِ غم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے بیانات میں آورد پائی جاتی ہے اور ناولوں کے
اکثر پلاٹ اور مکالمے غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کردار نگاری سے زیادہ انشا پردازی کی طرف
مائل ہیں ان کے ناولوں کے کردار اکثر بے جان ہیں لیکن ایک ظریفانہ کردار "عشو نانی" بہت دلچسپ

اور زندہ کردار ہے۔

اب تک جتنے ناول نویسوں کا ذکر کیا ہے، پریم چند ان میں سب سے الگ ہیں انہوں
نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے حقیقت نگاری پریم چند کی بڑی خصوصیت
ہے۔ اُن کا اندازِ بیان صاف ستھرا اور مشاہدہ وسیع ہے ان کے ناول اصلاحی ہیں۔ ان میں
بے کس کسانوں سے ہمدردی کی ہے اور ان کی روزمرہ کی زندگی، جھگڑے ٹنٹے، زمینداروں
کے جبر و استبداد اور اُن کے افلاس وافلاس کے مسائل کو سچائی سے بیان کیا ہے پریم چند نے
متعدد ناول لکھے ہیں لیکن دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ایک "میدانِ عمل" جس میں ادنیٰ طبقے
کے افلاس اور ہندوستان نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا نقشہ کھینچا ہے، دوسرا
"گئو دان" جو ان کا شاہکار ہے اس میں باپ اور بیٹے، قدیم اور جدید، ظلم اور بغاوت کی
کی کشمکش ہے۔ اس کے کردار بلاشبہ جاندار ہیں لیکن کوئی ایسا کردار پیدا نہیں کر سکے جسے

ابدیت حاصل ہو۔

کچھ اور ناول نویس بھی ہیں: مرزا محمد سعید کا "خوابِ ہستی" قابلِ ذکر ہے۔ مرزا صاحب صاحبِ فکر
اور ادیب ہیں، فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ اُن میں نفسیاتی نظر بھی پائی جاتی ہے لیکن طویل

تقریریں اور پند و وعظ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کشن پرشاد کول کا "شیاما" ایک ہندو بیوہ کی کہانی ہے۔ اس زمانے کے متوسط درجے کے ہندو گھرانے کے حالات کا صحیح نقشہ ہے۔

نئے لکھنے والوں میں کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، احمد علی، عصمت چغتائی، عزیز احمد قابلِ ذکر ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ایک طبقہ فرائڈ اور مارکس کے نظریوں سے متاثر ہے۔ ان ناولوں میں رومانیت کے ساتھ جنسیت اور لذتیت ہے یا اشتراکیت، اشتمالیت کا ہلکا سا رنگ، باوجود اس کے ناول مطالعے کے قابل ہیں کیونکہ اس میں مشاہدے اور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے اور ان میں سے بعض کا انداز مفکرانہ ہے جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

مختصر افسانے کی ابتدا اس صدی کے اوائل میں پریم چند سے ہوئی۔ پریم چند بہت اچھے افسانہ گو اور افسانہ نویس ہیں۔ اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کے دکھ درد، ان کی دلچسپیوں اور مشکلات و مصائب کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں ان کے افسانوں میں مقامی رنگ ہے اور مقصد اصلاح ہے۔ اسی زمانے کے لگ بھگ نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور پنڈت سُدرشن نے بھی افسانے لکھنے شروع کیے۔ نیاز حسن و عشق کے داستان گو ہیں۔ مقامی رنگ اور مقصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی اور ایرانی افسانوں کے ترجمے کیے اور چند خود بھی لکھے۔ ان کے افسانے عشقیہ ہیں اور رجحان بے قیدِ محبت کی جانب ہے۔ نفسیاتی نظر بھی رکھتے ہیں۔ سلطان حیدر جوش کے افسانے بھی پریم چند کی طرح مقصدی ہیں۔ پریم چند کا مقصد وطن کی محبت ہے اور سلطان حیدر نے اپنے افسانوں میں مغربیت اور اس کے مضر اثرات کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس زمانے میں اور بہت سے افسانہ نویس پیدا ہوئے لیکن قابلِ ذکر صرف چند ہیں یعنی علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، اختر اورینوی، حسام اللہ افسر وغیرہ۔ یہ لوگ اب رومانیت کی بجائے زندگی کے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں اور پریم چند کی قائم کی ہوئی روایت سے متاثر ہیں، لیکن ان کی نظر بہت گہری نہیں۔ وہ کارزارِ زندگی میں پورے جوش سے نہیں اترتے۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں یوپی کے مشرقی علاقے کی دیہاتی زندگی کے خاص خاص پہلو اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے یوپی کے شرفا اور تعلیم یافتہ طبقے کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ علی عباس حسینی نے یو۔ پی کے

زمینداروں کی وضعداریوں اور کرتوتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ حامد اللہ افسر نے مسلمانوں کی خانگی زندگی کی مخصوص باتیں چن چن کے نکالی ہیں غرض ان میں سے ہر ایک جس طرح اپنے ماحول اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے متاثر ہوا ہے، اُس نے اس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

گذشتہ بیس پچیس سال میں غیر زبانوں کے افسانوں کے ترجمے بہت کثرت سے ہوئے۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی، امریکی، ترکی، چینی، جاپانی، ہسپانوی، اطالوی وغیرہ تمام بڑی بڑی زبانوں کے افسانے اُردو میں منتقل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ان ترجموں کا اثر ہماری افسانہ نگاری پر بہت کچھ ہوا۔ ترجمہ کرنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، محمد مجیب، جلیل قدوائی، خواجہ منظور احمد، اختر حسین رائے پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۳۲ء میں دس کہانیوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع ہوا جس میں بڑی بے باکی اور آزادی کا اظہار کیا گیا تھا بعض کہانیوں میں عام روایات، ظاہر پرستی، مذہبیت پر شدید طنز، تضحیک اور تمسخر کیا گیا ہے جو مبتذل اور عام اخلاق سے گرا ہوا ہے۔ ان میں باغیانہ اور انقلابی رُجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر بعد کے افسانہ نگاروں پر بھی ہوا۔ اس کے دوسرے سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا، جس نے حقیقت پسندی اور آزادی کی تلقین کی اور اُردو افسانہ نگاری میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ کرشن چندر، احمد علی، عصمت چغتائی، بیدی، حسن عسکری، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، ممتاز مفتی، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری وغیرہ نے زندگی کی مختلف پیچیدگیوں اور معاشی پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے بیان میں نفسیاتی تجزیہ بھی پایا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور وغیرہ نے بھی بعض افسانے اچھے لکھے ہیں۔

اسی کے ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات نے بھی جدید شاعری اور تنقید کی طرح ہمارے افسانے پر اثر ڈالا اور شاید افسانہ ان نظریات سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ وسعت پیدا ہو گئی لیکن بعض افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری اور فن کے نام سے بہت بے اعتدالیاں کی ہیں اور لوگوں کے جذبات اور معتقدات کو مجروح کرنے میں تأمل نہیں کیا۔ بعض نے جنس کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس قدر غلو کیا ہے کہ عریانی اور لذتیت صاف نمایاں ہے، مثلاً عصمت اور

منٹو بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے بعض افسانے درحقیقت اعلیٰ پائے کے ہیں لیکن چند ایسے بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں جن کو پڑھ کر گھن اور نفرت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گذشتہ پچیس تیس برس میں اُردو افسانے نے قابلِ تعریف ترقی کی ہے اور اس کے بعض افسانے ایسے ہیں کہ ہم انہیں دنیا کے مشہور افسانوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جو نیا دور آیا ہے اس میں بہت سے نئے نئے افسانہ نویس طبع آزمائی کر رہے ہیں جن کے متعلق اس وقت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

واجد علی شاہ کے عہد میں رقص و سرود کو خوب فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۳ء کے لگ بھگ سید آغا حسن امانت نے ایک ناٹک "اندر سبھا" کے نام سے تصنیف کیا۔ اس میں اُس نے ہندی دیومالا کو اسلامی روایات میں سمو کر خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ گانے اور رقص نے اس کی مقبولیت میں اور اضافہ کیا۔

اسی دوران یعنی ۱۸۵۳ء میں ڈھاکے اور بمبئی میں اُردو اسٹیج کا آغاز ہوا۔ ڈھاکہ میں ابتدا امانت کی "اندر سبھا" ہی سے ہوئی۔ شیخ فیض بخش کانپوری نے جو ایک مدت سے ڈھاکے میں مقیم تھے، ایک تھیٹریکل کمپنی "فرحت افزا" سے قائم کی اور نواب علی نفیس کو ڈرامے لکھنے کے لیے بُلایا۔ انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ وہاں کے اُمرا نے اُس کی سرپرستی کی۔ اس نے بنگال کے مختلف مقامات میں ڈرامے دکھائے جس کا ایک اثر یہ ہوا کہ بنگال کے ان علاقوں میں جہاں ٹوٹی پھوٹی اُردو بولی یا سمجھی جاتی تھی، اُردو کا شوق پیدا ہو گیا۔

۱۸۵۳ء میں ہندو ڈرامیٹک کور کو جو مرہٹی ڈرامے دکھاتی تھی، یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک کی عام مقبول زبان اُردو میں ڈرامے دکھائے جائیں تو زیادہ رونق اور کامیابی ہوگی چنانچہ اُس نے گرانٹ روڈ تھیٹر میں اُردو کا ناٹک "گوپی چند" دکھایا۔ اسی ناٹک کو اس نے دوبارہ جنوری ۱۸۵۴ء میں پیش کیا۔

ہندو ڈرامیٹک کور کے ٹوٹ جانے یا بمبئی سے چلے جانے کے بعد پارسی تھیٹریکل کمپنی نے جو گجراتی تماشے دکھاتی تھی، اُردو کی طرف توجہ کی اور اُردو کے کئی ڈرامے دکھائے۔ ڈرامے کے آخر میں نقل دکھانے کی رسم بھی اسی نے جاری کی۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۴ء کے اواخر تک رہا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم نے ملک کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ ناٹک کمپنیوں پر بھی اوس پڑ گئی لیکن کچھ ہی عرصے بعد تاجرانہ ذہنیت کے پارسی سرمایہ داروں نے اس کو پھر زندہ کیا اور اسے کاروباری اصول پر چلانے کا ڈول ڈالا۔ سیٹھ پیستن جی فرام جی نے جو شاعر بھی تھے اور اداکار بھی، اوریجنل تھیٹریکل کمپنی" کی بُنیاد ڈالی۔ رونق بنارسی اور حسینی میاں ظریف اس کے ڈراما نگار اور بالی والا اور کاؤس جی کھٹاؤ اس کے مشہور اداکار تھے۔ اس کمپنی کی بڑی شہرت ہوئی اور اس نے ۱۸۸۸ء میں دہلی دربار کے موقع پر خوب نام پایا۔

ہندوستان میں اُردو ڈرامے کی مقبولیت دیکھ کر بعض پارسی کمپنیوں کو بیرونِ ملک میں اپنے تماشوں کو اسٹیج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ خورشید جی بالی والا اپنی کمپنی لے کر رنگون پہنچا اور وہاں خوب دولت کمائی۔ رنگون سے یہ کمپنی مانڈلے گئی جہاں برما کے مہاراجہ اور مہارانی نے بھی ڈرامے دیکھے اور بہت محظوظ ہوئے اور اس قدر زر و جواہر انعام میں دیے کہ کمپنی مالا مال ہو گئی۔ برما میں تماشے دکھانے کے بعد یہ کمپنی سنگاپور گئی اور اس کے تماشے بے حد مقبول ہوئے۔ سنگاپور کے قیام میں اس کو جاوا سماٹرا کے ہندوستانی تاجروں نے مدعو کیا۔ چنانچہ سنگاپور کے بعد یہ بٹاویہ گئی، وہاں بھی اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ کمپنی (وکٹوریہ منڈلی) جہاں بھی گئی خلقت نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور تماشوں سے بہت معقول آمدنی ہوئی۔ اب ان کامیابیوں سے ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ لندن کا قصد کیا، اور ۱۸۸۰ء میں وہاں جا کر اُردو ڈرامے اسٹیج پر دکھائے۔

ان پارسی کمپنیوں کے کاروبار کے ختم ہونے پر بعض دیگر اصحاب نے بھی تھیٹریکل کمپنیاں بنائیں۔ خاص بمبئی میں محمد علی ناخدا نے "نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی" قائم کی اور بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست رام پور کے نواب حامد علی خاں اشک نے لاکھوں روپے کے صرف سے رام پور قلعہ کے سامنے تھیٹر کی عالی شان عمارت تعمیر کی اور قابل ڈرامہ نگاروں، شاعروں اور اداکاروں کو اپنی کمپنی کے لیے جمع کیا۔ اس کمپنی کے ٹوٹنے پر اس کے عملے نے دہلی میں "جوبلی تھیٹر" قائم کیا جو بہت مقبول ہوا۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک بیسیوں کمپنیاں بنیں اور ٹوٹیں اور کچھ دن اپنا اپنا تماشا دکھا کر رخصت ہو گئیں۔ فلم نے ان کا بازار سرد کر دیا۔ اگرچہ پارسی سرمایہ داروں نے حصولِ زر کی خاطر اپنا سرمایہ اس کام میں لگایا، لیکن اس ضمن میں اردو ڈرامے اور اردو زبان کی خدمت بھی ان کمپنیوں نے کی۔

قدیم ڈرامے ابتدا میں اندر سبھا کے انداز کے تھے، بعد میں کچھ اصلاح ہوئی لیکن پھر بھی قدیم روایات کے پابند رہے۔ موضوع عشق و محبت ہوتا تھا۔ کردار اکثر فوق الفطرت ہوتے حقیقی زندگی سے بہت کم واسطہ ہوتا۔ باتیں گانے میں ہوتیں۔ بادشاہ بھی گاتا، وزیر بھی گاتا، غلام بھی گاتا۔ اشعار کیا تھے تُک بندی ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں نثر آجاتی تو نظم سے بدتر، مقفیٰ، مسجع نیم شاعری ہوتی۔ احسن لکھنوی، بے تاب اور آغا حشر نے کچھ اصلاح کی۔

جدید اردو میں جو ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ اسٹیج پر آنے کے قابل نہیں، پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان لکھنے والوں میں مرزا ہادی رُسوا، احمد علی شوق، لالہ کنور سین، حکیم احمد شجاع، اشتیاق حسین قریشی، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمٰن عظیم بیگ چغتائی، سُدرشن، عبدالماجد کیفی، اور مرزا ادیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یورپی ڈراموں کے بھی اردو ترجمے ہوئے ان کا بھی ہمارے ڈرامہ نگاروں پر اثر پڑا۔

آخر میں ان چند اداروں اور انجمنوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، جنہوں نے اردو کی اشاعت و ترقی اور اس کے علمی مرتبے کو بلند کرنے میں کام کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، قدیم دہلی کالج کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا تذکرہ ضروری ہے یہ سوسائٹی (سر) سید احمد خاں نے ۱۸۶۴ء میں قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر اہلِ وطن میں مغربی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے اور علمی مضامین پر لکھے دیے جائیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ یہ کتابیں تاریخ، معاشیات (پولیٹکل اکانمی) فلاحت، ریاضیات، طبیعات وغیرہ مضامین کی تھیں۔ اس سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ بھی جاری کیا گیا جس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار سرسید کی وفات تک جاری رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مطبع نولکشور نے بھی علاوہ عربی فارسی تصانیف کے اُردو زبان کی بے شمار کتابوں کی طبع و اشاعت کا قابلِ تعریف کام کیا اور نظم و نثر کی ایسی ایسی ضخیم کتابیں چھاپ کر شائع کیں جو کسی دوسرے ادارے یا مطبع کے بس کی بات نہ تھی۔ بیسویں صدی میں جن

انجمنوں اور اداروں نے یہ خدمت انجام دی' ان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور انجمن ترقی اردو اور جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن اور جامعہ عثمانیہ نے صدہا کتابیں مختلف علوم و فنون کی ترجمہ و تالیف کیں اور ہزارہا اصطلاحاتِ علمیہ وضع کرکے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ انجمن نے اس کے سوا اردو شعرا کے قدیم نایاب تذکرے مرتب کرکے شائع کیے اور اردو زبان کی قدیم کتابیں جن کے نام تک سے لوگ ناواقف تھے شائع کرکے اردو زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔ جامعہ عثمانیہ برِعظیم بھارت و پاکستان میں پہلی یونیورسٹی تھی جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم ملک کی ایک دیسی زبان یعنی اردو تھا۔ افسوس کہ بھارت کے قبضہ کے بعد یونیورسٹی کا سررشتۂ تالیف و ترجمہ بند کر دیا گیا اور ذریعۂ تعلیم اردو جو جامعہ عثمانیہ کی ممتاز خصوصیت اور اس کا بڑا کارنامہ تھا موقوف کر دیا گیا۔ حیدرآباد دکن میں ہماری قومی زبان اور تہذیب کو جس بیدردی سے مٹایا گیا، اس کا صدمہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

تقسیمِ ملک کے بعد حال میں پاکستان میں چند ادارے ایسے قائم ہوئے ہیں جو علمی ادبی ثقافتی کام کر رہے ہیں ---"

---❖---

"سب سے مقدم اور اہم کام یہ ہے کہ تمام علوم و فنون حتیٰ کہ انگریزی بھی اپنی ہی زبان کے ذریعے پڑھائی جائے' جیسا کہ دنیا میں ہر جگہ ہوتا ہے ----- کیا کسی انگریزی یونیورسٹی میں گوئٹے یا خیام پر جرمن یا فارسی زبان میں لیکچر دیے جاتے ہیں؟ کیوں نہ ہم شیکسپیئر' شیلے یا دانتے پر اردو زبان میں لیکچر دیں۔ اس سے ہماری زبان میں وسعت' پختگی اور قوت کا اضافہ ہو گا -----"

----- بابائے اردو عبدالحق

الوقار پبلی کیشنز کی اہم مطبوعات

alwaqrpublications@hotmail.com
Ph: 0300 - 8408750
پی او بکس نمبر 7104 ' لاہور

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱۔	مجموعہ تنقیدات از: پروفیسر آل احمد سرور	مرتبہ: عاصمہ وقار	۔/۰۰
۲۔	غالب نامہ۔ تجزیاتی مطالعہ	از: عاصمہ وقار	۔/۳۷۵
۳۔	حرف سرور (آپ بیتی پروفیسر آل احمد سرور)	از: پروفیسر زہرا معین	۔/۲۵۰
۴۔	باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ	از: پروفیسر زہرا معین	۔/۲۵۰
۵۔	نقد غالب	مرتبہ: پروفیسر مختار الدین احمد	۔/۲۵۰
۶۔	مرقع غالب	از: پرتھوی چند	۔/۳۹۵
۷۔	کلیات ولی	مرتبہ: پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۔/۳۲۵
۸۔	کلیات ممنون	مرتبہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان	۔/۴۳۰
۹۔	اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	از: ڈاکٹر حنیف کیفی	۔/۴۳۰
۱۰۔	نقد عبد الحق	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۔/۲۹۰

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۔	بابائے اردو: خدمات اور فرمودات	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۲۹۵/-
۱۲۔	لطائف غیبی' از غالب	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۹۰/-
۱۳۔	غزل' غالب اور حسرت' از: رشید احمد صدیقی	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۲۰/-
۱۴۔	نقوش غالب	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۲۸۰/-
۱۵۔	دل کی کتاب	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۳۲۵/-
۱۶۔	بازیافت غالب	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۹۵/-
۱۷۔	تحقیق نامہ غالب	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۳۵۰/-
۱۸۔	غالب کا علمی سرمایہ	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۴۵۰/-
۱۹۔	غالب پیائی	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۲۸۰/-
۲۰۔	بر سبیل غالب	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرتبہ: سید وقار معین	۱۹۵/-
۲۱۔	دیوان غالب' نسخہ خواجہ (ڈیلکس ایڈیشن)	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۴۹۰/-
۲۲۔	دیوان غالب' نسخہ خواجہ	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۴۵۰/-
۲۳۔	دیوان غالب' نسخہ خواجہ۔ تجزیہ و تحسین	مرتبین: اصغر ندیم سید' ڈاکٹر معراج نیر	۲۹۰/-
۲۴۔	دیوان غالب (صحیح صورتحال)	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۸/-
۲۵۔	غالبیات جہات و جستجو	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۹۵/-
۲۶۔	غالب آشنائی	از: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۱۹۵/-
۲۷۔	کائنات غالب اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	از: پروفیسر نیر پرویز	۲۵۰/-
۲۸۔	فورٹ ولیم کالج' از: پروفیسر سید وقار عظیم	مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۲۵۰/-
۲۹۔	اردو ڈرامہ --- تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ	از: پروفیسر سید وقار عظیم	۳۹۵/-
۳۰۔	داستان سے افسانے تک	از: پروفیسر سید وقار عظیم	۳۸۰/-
۳۱۔	ہماری داستانیں	از: پروفیسر سید وقار عظیم	۴۲۵/-
۳۲۔	بابائے اردو مولوی عبدالحق	از: ڈاکٹر معراج نیر	۲۵۰/-

۳۳۔	بیسویں صدی کے منتخب افسانے	مرتبہ: ڈاکٹر معراج نیر	-/۲۸۰
۳۴۔	بیسویں صدی کے بیس افسانے	مرتبہ: ڈاکٹر معراج نیر	-/۲۸۰
۳۵۔	اب دریچوں کو نہ بند رکھنا کبھی (شاعری)	از: جمیل صبا	-/۱۲۰
۳۶۔	یونان کا ادبی ورثہ	از: پروفیسر عقیل احمد روبی	-/۳۵۰
۳۷۔	عالمی ادب کی رزمیہ شاعری (عہد بہ عہد)	از: پروفیسر عقیل احمد روبی	-/۳۹۵
۳۸۔	شخصیات وادبیات	از: پروفیسر عقیل احمد روبی	-/۴۹۵
۳۹۔	انور مسعود شخصیت و فن	از: پروفیسر رؤف امیر	-/۴۵۰
۴۰۔	میر انیس حیات و شاعری	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۲۷۰
۴۱۔	اقبال سب کے لیے	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۴۵۰
۴۲۔	اردو نثر کا فنی ارتقاء	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۴۹۵
۴۳۔	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۳۹۵
۴۴۔	خودنوشت اور تنقید خودنوشت	مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۲۵۰
۴۵۔	میر کو سمجھنے کے لیے	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۱۹۵
۴۶۔	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۳۲۵
۴۷۔	اردو ادب کی فنی تاریخ	از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	-/۷۵۰
۴۸۔	پاکستانی زبان وادب	از: ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/۳۲۵
۴۹۔	نوادرات ادب	از: ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/۲۹۵
۵۰۔	جہات جہد آزادی	از: ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/۲۵۰
۵۱۔	فتح نامہ ٹیپو سلطان	از: ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/۲۵۰
۵۲۔	دیوان حافظ شرح و ترجمہ	از: عباد اللہ اختر	-/۶۵۰
۵۳۔	منتخب کلام غالب (انگریزی ترجمہ)	از: مطلوب الحسن سید	-/۱۹۵
۵۴۔	تنہا چاند (پروین شاکر، فکر و فن)	از: عالیہ جلیل شاہ	-/۱۸۰

۵۵۔	غالب شناسی اور نیاز و نگار	مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر	۳۲۵/-
۵۶۔	اقبال شناسی اور نیاز و نگار	مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی	۳۳۰/-
۵۷۔	ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار	مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی	۱۹۵/-
۵۸۔	نظیر حسنین کی علمی اور ادبی خدمات	از: سعدیہ ناز	۱۸۰/-
۵۹۔	اعتبارات (شعری تنقید)	از: ڈاکٹر نیر صمدانی	۲۵۰/-
۶۰۔	تقاریر سربراہان پاکستان (اولین خطبات)	مرتبہ: لیاقت علی چوہدری	۱۳۰/-
۶۱۔	مکتوبات اقبال (بنام چوہدری محمد حسین)	مرتبہ: پروفیسر ثاقف نفیس	۹۰/-
۶۲۔	مہک (شعری مجموعہ)	از: ڈاکٹر وسیم کتان	۳۰۰/-
۶۳۔	ادبی جائزے	از: پروفیسر نظیر صدیقی	۱۵۰/-
۶۴۔	درد کا سورج (شعری مجموعہ)	از: ڈاکٹر محمد خاں اشرف	۱۰۰/-
۶۵۔	رومانویت اور ادب میں رومانوی تحریک	از: ڈاکٹر محمد خاں اشرف	۱۹۵/-
۶۶۔	انجمن پنجاب کے مشاعرے	از: ڈاکٹر عارف ثاقب	۲۹۰/-
۶۷۔	وفا کے پھول (شعری مجموعہ)	از: خاور بوسالوی	۱۲۰/-

☆☆☆

برادرِ مکرم معین صاحب، سلام مسنون

....آپ کراچی کب آ رہے ہیں۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خاص طور پر مولوی (عبدالحق) صاحب کے بارے میں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے اشتراک اور تعاون سے مرحوم کے شایانِ شان کوئی کام کیا جائے۔ آپ کے سوا کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ہے جسے اس کام میں شریک کیا جا سکے..... آپ کا بھائی: مشفق خواجہ

۲۱-اگست ۱۹۷۱ء

مولانا عبدالحق پر ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کی کتاب (سے) پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ یادوں پر دُکھی ہوا، مُعین صاحبؐ کے کام پر خوش ہُوا۔ عبدالحق مرحوم پر ابھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علمی کام تو ظاہر ہیں لیکن اُن کو جاننے اور اُن کی شخصیت کو پہچاننے کے لئے اُن کے شخصی اور ذاتی حالات پر زیادہ لکھنے اور اُن کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے بڑا مبارک کام کیا ہے۔ اُمید ہے وہ اس اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

کراچی: ۱۹۷۵ء ——— پیر سیّد حسام الدین راشدی

"ایثار، آدمی دولت کا کرتا ہے، وقت کا کرتا ہے اور اپنے جسم و جان کا کرتا ہے لیکن اگر ایثار کی ایک ایسی مثال تلاش کرنی ہے کہ جہاں جسم و جان اور روح کی آخری حد تک آدمی اپنے آپ کو قربان کر دے اور برباد کر دے تو وہ مولوی عبدالحق کی زندگی ہے! معین صاحب نے کام کو اُس انداز میں کیا جو انداز مولوی عبدالحق نے انہیں سکھایا تھا..... کہ کام چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اُسے کاوش سے، محنت سے اور لگن کے ساتھ کرنا چاہیے..... تو یہ سبق مُعین صاحب نے سیکھے [illegible] جس حصے میں وہ مولوی عبدالحق صاحب سے ملے [illegible] اس طرح سیکھے ہیں کہ انہیں اپنی زندگی کا وظیفہ بنا لیا [illegible] خوش قسمت ہیں اور دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ یہ توفیق [illegible] نام کی برکت سے اور اُن کے ذکر کی برکت سے"

لاہور: ۱۹۷۵ء